BAUL(N) - 201

بی.اے.اُردو

سمسٹر سوم

BACHELOR OF ARTS (URDU)

THIRD SEMESTER

MAJOR CORE

نظم

NAZM

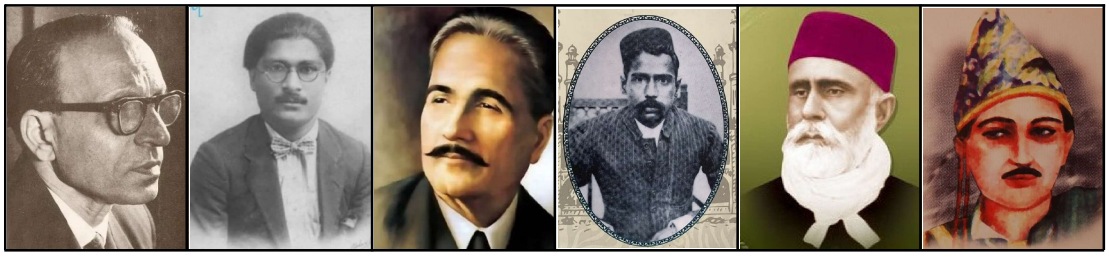

نظیر اکبر آبادی

الطاف حُسین حالی

درگا سہائے سرور

علامہ اقبال

اختر شیرانی

مخدوم محی الدین

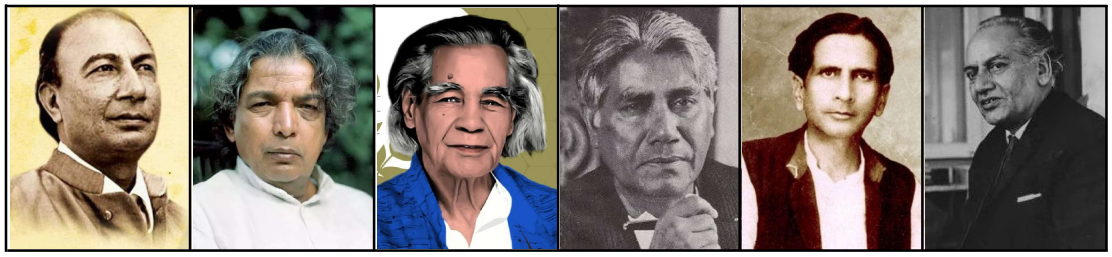

فیض احمد فیض

اسرار الحق مجاز

اختر الایمان

علی سردار جعفری

کیفی اعظمی

ساحر لدھیانوی

اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی (نینی تال)

SCHOOL OF HUMANITIES

UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

HALDWANI (NAINITAL) - 263139

بی.اے.اُردو

BACHELOR OF ARTS (URDU)

سالِ دوم

SECOND YEAR

سمسٹر سوم

THIRD SEMESTER

بی.اے. یو.ایل(این.) - ۲۰۱ - نظم

BAUL(N) - 201, NAZAM

MAJOR CORE

اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی (نینی تال)

SCHOOL OF HUMANITIES

UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

HALDWANI (NAINITAL) - 263139

سرپرستِ اعلیٰ:

پروفیسر او. پی. ایس. نیگی، وائس چانسلر، اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

کمیٹی بورڈ آف اِسٹڈیز:

پروفیسر رینو پرکاش (ڈائریکٹر اسکول آف ہیومنٹیز (SOH) اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی (UOU)، ہلدوانی۔

پروفیسر توقیر احمد خاں، ریٹائرڈ پروفیسر شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی۔

پروفیسر سید محمد ارشد رضوی، گورنمنٹ رضا پی. جی. کالج، رام پور، اُتر پردیش۔

ڈاکٹر شہپر شریف، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

محمد افضل حسین، اسسٹنٹ پروفیسر و کورس کوآرڈِنیٹر شعبۂ اُردو، اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

رجسٹرار:

پروفیسر پی. ڈی. پنت، اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

کورس کوآرڈِنیٹر وایڈیٹر:

محمد افضل حسین (اُستاد بریلوی)، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

C جملہ حقوق بحقِ ناشر محفوظ ہیں

اس کتاب کا کوئی بھی حصّہ کسی بھی شکل میں یونی ورسٹی کی تحریری اجازت کے بغیر شائع نہ کیا جائے۔ یہ کتاب ''اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی'' کے بی.اے. اُردو سالِ دوم، سمسٹر سوم، نظم کے نصاب کا جزو ہے۔ مزید معلومات کے لئے یونی ورسٹی حکام یا صدرِ شعبۂ اردو سے یونی ورسٹی کے حسبِ ذیل پتے پر رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے۔

DEPARTMENT OF URDU

UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

UNIVERSITY ROAD, BEHIND TRANSPORT NAGAR (Teenpani Bypass)

HALDWANI-263139 Phone:05946-261122

پیش لفظ

اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی کا قیام اُتراکھنڈ قانون ساز اسمبلی کے ایک ایکٹ کے تحت ۳۱/اکتوبر ۲۰۰۵ء کو عمل میں آیا جس کا مقصد فاصلاتی نظامِ تعلیم کے ذریعے آبادی کے بڑے حصے کے ایسے اَفراد کی تعلیمی ضرورتوں کی تکمیل ہے جو کسی مصروفیت یا مجبوری کے سبب کالجوں یا یونی وَرسٹیوں تک نہیں پہنچ پاتے ہیں۔ یونی ورسٹی کے تعلیمی پروگرام ''بیچلر آف آرٹ'' کے تحت ''بی.اے. اردو'' کو شامل کیا گیا ہے۔ یہ کتاب بی.اے. اردو سالِ دوم، سمسٹر سوم، نظم کے نصاب کا جزو ہے۔ یہ کتاب ۱۳/اکائیوں پر مشتمل ہے جو الگ الگ موضوعات پر مختلف اسباق کی شکل میں ہیں۔

عزیز طلبا و طالبات!

فاصلاتی نظامِ تعلیم کی کتابوں کو {خودتدریسی مواد{SLM}(Self Learning Material) کہا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو یہ مواد خود ہی پڑھنا ہے۔ روایتی درس گاہوں کے برخلاف اِسے پڑھانے کے لئے آپ کے سامنے استاد موجود نہیں ہوگا۔ اِس صورتِ حال کے تحت اسباق کو اِس طرح تیار کیا گیا ہے کہ آپ کو کلاس میں اپنی اور استاد کی موجودگی کا احساس ہو سکے۔ اِسی لئے ہر اکائی کا آغاز ''اغراض و مقاصد'' سے کیا گیا ہے تا کہ آپ کو اِس بات کا اندازہ ہو سکے کہ اکائی کو پڑھنے کا مقصد کیا ہے؟ اُس کے بعد ''تمہید'' دی گئی ہے جس میں سبق کو مختصر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اکائی کے درمیان ''اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے'' کے تحت کچھ سوالات بھی دِیے گئے ہیں تا کہ آپ نے جو کچھ پڑھا ہے، اُسے کس حد تک ذہن نشین کیا ہے؟ اِس بات کا بھی اندازہ لگایا جا سکے۔ کتاب کے آخر میں اُن سوالات کے جوابات بھی دِیے گئے ہیں لیکن آپ کو چاہیے کہ پہلے خود اُن سوالات کو حل کریں پھر آخر میں دِیے گئے جوابات سے اپنے جوابات ملالیں تا کہ آپ کو اپنی صلاحیت کا اندازہ بھی ہو اور آپ کی ذہنی ورزش بھی ہو جائے۔ امتحان میں آپ سے جس طرح کے سوالات پوچھے جائیں گے اُس کے نمونے بھی دِیے گئے ہیں۔ ساتھ ہی ہر اکائی کے آخر میں مشکل الفاظ کی ''فرہنگ'' اور ''حوالہ جاتی کتب'' کی فہرست بھی دی گئی ہے تا کہ آپ اُن کتابوں کے مطالعے سے اپنی معلومات میں مزید اضافہ کر سکیں۔

ہم آپ کی کامیابی کے لئے دعائیں اور نیک خواہشات پیش کرتے ہیں۔

ایڈیٹر

بی.اے.اُردو

(B.A.URDU)

سالِ دوم

SECOND YEAR

سمسٹرسوم

THIRD SEMESTER

بی.اے. یو.ایل(این.) - ۲۰۱ - نظم

BAUL(N) - 201, NAZAM

اکائی نمبر مضمون	مضمون نگار	
بلاک نمبر 01:		**6**
اِکائی 1 نظم کی تعریف، ابتدا، بنیادی خصوصیات اور مختصر تاریخ	ڈاکٹر کوثر مظہری	7
اِکائی 2 نظیرؔ اکبرآبادی (ہنس نامہ)	ڈاکٹر شریف احمد قریشی	24
اِکائی 3 خواجہ الطاف حُسین حالیؔ (بحیثیت نظم نگار)	ڈاکٹر نکہت جہاں	40
بلاک نمبر 02:		**55**
اِکائی 4 دُرگا سہائے سُرورؔ (عروسِ حُبِّ وطن)	حنا یاسمین	56
اِکائی 5 علاّمہ اقبالؔ (سیّد کی لوحِ تربت)	محترمہ بی. بی. رضا خاتون	72
اِکائی 6 اختر شیرانی ''اودیس سے آنے والے بتا''	ڈاکٹر ثروت خان	86
بلاک نمبر 03:		**97**
اِکائی 7 مخدوم محی الدین، نظم ''چارہ گر''	ڈاکٹر عرشیہ جبیں	98
اِکائی 8 فیض احمد فیضؔ (صُبحِ آزادی)	ڈاکٹر عزیزہ بانو	114
اِکائی 9 اسرارالحق مجازؔ (آوارہ)	ڈاکٹر نکہت جہاں	125

بلاک نمبر 04: **136**

اِکائی10 علی سردار جعفری (ہاتھوں کا ترانہ) پروفیسر علی احمد فاطمی 137

اِکائی11 اختر الایمان (ایک لڑکا) ڈاکٹر محمد آصف مظہری 149

اِکائی12 اطہر حُسین کیفی اعظمی (مکان) پروفیسر علی احمد فاطمی 159

اِکائی13 عبدالحئی ساحر لدھیانوی (خون پھر خون ہے) ڈاکٹر نغمہ پروین 170

بلاک نمبر 01

اکائی 01 نظم کی تعریف، ابتدا، بنیادی خصوصیات اور مختصر تاریخ ڈاکٹر کوثر مظہری

اکائی 02 نظیر اکبرآبادی (ہنس نامہ) ڈاکٹر شریف احمد قریشی

اکائی 03 خواجہ الطاف حُسین حالی (بحیثیت نظم نگار) ڈاکٹر نکہت جہاں

اکائی 01 : نظم کی تعریف، ابتدا، بنیادی خصوصیات اور مختصر تاریخ

ساخت

01.01 : اغراض ومقاصد

01.02 : تمہید

01.03 : نظم کی تعریف اور خصوصیات

01.04 : نظم کی ہیئت وموضوع

01.05 : نظم کا آغاز وارتقا

01.06 : جدید نظم کا آغاز

01.07 : اہم نظم نگار شعرا (۱۹۳۶ء سے پہلے)

01.08 : اہم نظم نگار شعرا (۱۹۳۶ء کے بعد)

01.09 : اردو نظم (۱۹۶۰ء کے بعد)

01.10 : خلاصہ

01.11 : فرہنگ

01.12 : نمونہ امتحانی سوالات

01.13 : حوالہ جاتی کتب

01.14 : اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

01.01 اغراض ومقاصد

آپ ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس کے زُمرے میں مختلف اصناف کا ذِکر آتا ہے۔ مثلاً غزل، رباعی، قطعہ، مرثیہ، مثنوی، قصیدہ وغیرہ۔ نظم بھی اردو ادب کی اہم شاخ ہے، جسے بطور صنف قبول کیا جا چکا ہے۔ جس طرح آپ ناول اور افسانے کا مطالعہ کرتے ہیں اسی طرح نظم کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ انسانی زندگی کے حقائق کو جب فکشن میں پیش کیا جاتا ہے تو اس کے اثرات جس طرح انسانی ذہنوں پر مرتّب ہوتے ہیں اسی طرح شاعری میں بھی ذہنوں پر مرتّب ہوتے ہیں۔ اسی طرح شاعری میں بالخصوص جب آپ نظموں کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ زندگی اور انسانی تہذیب کے کیسے کیسے موضوعات کو نظم کے پیکروں میں پیش کیا جاتا ہے۔ نظم کے مطالعے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ آخر غزل یا دوسری اصنافِ شاعری سے نظم کس طرح اور کن بنیادوں پر مختلف یا ممیّز ہے۔

01.02 تمہید

ہر صنف کے وجود میں آنے کے اسباب ہوتے ہیں۔ جس عہد میں جو صنف معرضِ وجود میں آتی ہے اس پر اس عہد کے تہذیبی تناظر کا خاص اثر ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نظم کے ذیل میں وہ تمام اصناف آتی ہیں جو غزل سے الگ تھیں جیسے قصیدہ، مثنوی، مرثیہ وغیرہ لیکن ہمیشہ کی طرح ایک التباس رہتا ہے کہ اگر ایسا ہے تو پھر قصیدہ مثنوی یا مرثیہ میں کس کی ہیئت قابلِ قبول ہوگی۔ اس سبق میں ان اُمور پر بحث کی جائے گی۔

01.03 نظم کی تعریف اور خصوصیات

نظم کی کوئی مکمّل تعریف اب تک سامنے نہیں آسکی ہے۔ کبھی نثر کی ضد کے طور پر نظم کا استعمال ہوا ہے تو کبھی غزل کے علاوہ دوسری تمام اصناف پر نظم کا اطلاق ہوتا رہا ہے جیسے: قصیدہ، مثنوی، شہر آشوب، مسدّس، مخمّس، مرثیہ وغیرہ لیکن ہم جس صنف ''نظم'' کی بات کر رہے ہیں اس کی اپنی الگ شناخت ہے۔ نظم کی بنیادی خصوصیت ہے اس میں جذبات یا تاثّرات کی تجزیاتی پیش کش۔ یہ انفرادی بھی ہوسکتی ہے اور اجتماعی بھی۔

اس کی تعریف کچھ یوں کی جاسکتی ہے کہ ایک ایسی منظوم تخلیق جس میں ایک مرکزی خیال ہو اور جس میں ارتقائی عمل کارفرما ہو۔ حالاں کہ یہ بحث ہوتی رہی ہے کہ ایک اختتام رکھنے کے باوجود نظم میں ارتقا ضروری نہیں۔ مرکزی خیال کا ہونا نظم کی بنیادی خصوصیت ہے اور ربط و تسلسل بھی، لیکن نئی نظموں میں اس کی نفی بھی ہوتی رہی ہے۔

01.04 نظم کی ہیئت و موضوع

اس نظم میں ہیئت طے نہیں۔ اس کی ہیئتی شکل کچھ بھی ہوسکتی ہے۔ نظم، مثنوی، مخمّس، مربّع، ترجیع بند، ترکیب بند، مستزاد، آزاد، معرّیٰ اور اب نثری ہیئتوں میں کہی جاسکتی ہے۔ ان تمام ہیئتوں میں نظم کے نمونے موجود ہیں۔ آج کل پابند نظمیں کم کہی جارہی ہیں۔ زیادہ تر آزاد اور نثری نظمیں منظرِ عام پر آرہی ہیں لیکن اگر ہم نظم کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو محمد حسین آزاؔد، حالیؔ، شبلیؔ، اقبالؔ، جوشؔ، فیضؔ، سردارؔ جعفری، ساحرؔ لدھیانوی، مختارؔ صدّیقی، ضیاؔ جالندھری، اخترؔ الایمان وغیرہ کے یہاں مثنوی، مسدّس، ترجیع بند، معرّیٰ اور آزاد نظمیں خوب ملتی ہیں۔

جدید نظم نگاروں میں ن.م.راشدؔ، میراجیؔ، احمد ہمیشؔ، محمد علوی، افتخار جالبؔ، زاہدؔ ڈار، باقرؔ مہدی، انیسؔ ناگی وغیرہ نے نظم کی ہیئتوں میں نئے نئے تجربات کیے ہیں۔

نظم لے لئے کسی موضوع کی تخصیص نہیں۔ حُسن و عشق سے لے کر مناظرِ قدرت، سماجی مسائل سے لے کر حالاتِ حاضرہ کے تمام موضوعات کبھی انفرادی تو کبھی اجتماعی احساس بن کر اردو نظم میں آتے رہے ہیں۔ ہندوستانی عناصر جیسے یہاں کے میلے ٹھیلے، تیج، تہوار نظم میں آتے رہے ہیں۔ تحریکِ آزادی اور انقلاب کو بھی نظم نگاروں نے اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا ہے۔ اس کے علاوہ ۱۹۶۰ء کے بعد کی نظموں میں جدید حسّیت نے انفرادی احساس کو تنہائی، خوف، ذہنی انتشار وغیرہ سے ہم آہنگ کیا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۱﴾ نظم کی تعریف کیا ہے؟

﴿۲﴾ نظم کن ہیئتوں میں کہی جاتی ہے؟

﴿۳﴾ نظم کا موضوع کیا ہے؟

01.05 نظم کا آغاز وارتقا

نظم کا آغاز دکنی شاعری سے ہوتا ہے، ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا ہے کہ دکنی دَور میں نظم پہلے وجود میں آئی اور غزل بعد میں۔ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''دکن میں شاعری کو آغاز کار میں مذہبی اور تبلیغی مقاصد لے لئے استعمال کیا گیا جس کے لئے غزل کے بجائے نظم زیادہ کارآمد تھی۔ دوسرے دکن میں بادشاہت کا نظام خاصا توانا تھا اور بادشاہ کی مدح کے لئے قصیدے کا رواج پا جانا ایک بالکل قدرتی بات تھی۔''

(اردو شاعری کا مزاج، ص۔۳۱۳)

قصیدے کا نام سن کر آپ کنفیوژن کا شکار نہ ہو جائیں۔ شروع میں غزل کو چھوڑ کر دوسری تمام منظومات نظم کے زمرے میں آتی تھیں۔ اس کا ذِکر پہلے آ چکا ہے۔ مثنوی، قصیدہ، مرثیہ یہ تینوں اصناف گرچہ ہیئت اور موضوع کے لحاظ سے ایک دوسرے سے الگ ہیں لیکن ان میں جو کہانویت اور واقعیت ہوتی ہے یا پھر جو مرکزی خیال ہوتا ہے، اس کے اعتبار سے بھی یہ اصناف ''نظم'' کو ہی Denote کرتی ہیں۔

دکنی شاعری میں بہمنی دَور چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی کو تسلیم کیا گیا ہے جو دَورِ اوّل بھی ہے۔ اس دَور میں خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، نظامی وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ تصوّف اور مذہب کے مضامین ان کی نظموں میں حاوی ہیں۔ دوسرے دَور کو قطب شاہی اور عادل شاہی دَور کہا جاتا ہے، جو سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی کو محیط ہے۔ اس عہد میں محمد قلی قطب شاہ، ابراہیم عادل شاہ، نصرتی، وجہی، غواصی، شوقی، ابن نشاطی، رستمی، ہاشمی وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

ان شعرا میں بیش تَر نام مثنویوں لے لئے مشہور ہیں۔ کچھ نے طبع زاد مثنویاں لکھیں تو کچھ نے فارسی سے ترجمے کیے۔ اس زمانے میں رزمیہ شاعری بھی ملتی ہے اگر موضوع دیکھیں تو عید، شبِ قدر، ولادت، محرّم، شادی، بیاہ، نَوروز، پرندے، موسم، برسات، بسنت، شاہی محل، عشق ومحبّت اور تصوّف یا مذہبی اُمور جیسے واضح موضوعات ملتے ہیں۔ تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو اٹھارہویں صدی کے شروع میں ہی اُردو ادب دکن سے شمال یعنی دہلی کی طرف آمادۂ سفر ہوتا ہے۔

۱۸۵۷ء سے پہلے تک کا دَور نظم کے مقابلے میں غزل کی ترویج وترقّی کا دَور ہے۔ غزل داخلی کیفیات واحساسات کی پیش کش کا اہم اور اثر انگیز ذریعہ رہی ہے۔ چنانچہ اس زمانے میں نظمیں مختلف ہیئتوں یعنی مثنویوں یا قصیدوں کی شکل میں ضرورت کے تحت لکھی جاتی رہیں لیکن غزل کو عروج حاصل ہوا۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد سیاسی وسماجی، تعلیمی اور اقتصادی ماحول میں بڑی تبدیلی پیدا ہوئی۔ ہندوستانیوں کے ذہن پر اس کے گہرے اثرات مرتّب ہوئے۔ اسی زمانے میں اصلاحی تحریکیں بھی چلتی رہیں۔ بہت سے ہندوستانیوں نے انگریزی تہذیب اور زبان سے دوری اختیار کی تو بہتوں نے انگریزوں کی تہذیبی وتعلیمی سطح تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی۔

پروفیسر احتشام حسین لکھتے ہیں:

''بنے بنائے راستوں پر چلنا ممکن نہ تھا اور نئے راستے اچھی طرح بنے نہ تھے، پرانے خیالات سے چھٹکارا حاصل نہیں ہوا تھا۔ نئے خیالات نے ذہنوں میں جگہ نہیں بنائی تھی۔''

(عکس اور آئینے، ۱۹۶۲ء، ص: ۱۵۵)

اُنیسویں صدی کا یہ دَور کش مکش کا دَور تھا جس کی طرف اُوپر کے اقتباس میں اشارہ ملتا ہے۔ اسی زمانے میں سرسیّد احمد خاں نے ''تہذیب الاخلاق'' میں اپنے موقف کا اظہار کیا کہ ہمیں یوروپین لٹریچر اور سائنس کی تعلیم حاصل کرنا چاہیے اور اگر ممکن ہو تو آکسفورڈ اور کیمبرج جا کر بھی اعلیٰ ڈگریاں حاصل کریں۔ اس ترغیب اور میلان سے ایک طرح کی بیداری پیدا ہوئی اور اس کا اثر ہر میدان میں نظر آنے لگا۔ جب انگریزی شاعری سے ہم آہنگی پیدا ہوئی تو اردو شعرا کو اپنی ابتذال پسندی اور فرسودگی کا احساس ہوا۔

01.06 جدید نظم کا آغاز

جدید نظم کے آغاز کا سہرا محمد حسین آزاؔد اور حالیؔ کے سر جاتا ہے۔ آزاؔد نے ۱۸۶۷ء میں ''انجمن پنجاب'' کے جلسے میں انگریزی شاعری سے استفادے اور اس کی افادیت پر روشنی ڈالی لیکن اس سے پہلے غلام مولیٰ قلقؔ کی پندرہ انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے ''جواہر منظوم'' کے نام سے ۱۸۶۴ء میں شائع ہو چکے تھے۔ اس زمانے میں انگریزی نظموں سے استفادے کی ایک تحریک سی چل پڑی تھی۔ جس کی پوری تفصیل موجود ہے۔ اس حوالے سے آزاؔد، اسماعیؔل میرٹھی، حالیؔ، نظؔم طباطبائی وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ ذرا سا آگے چلیں تو عبدالحلیم شرؔر، ضامنؔ کنتوری، سرورؔ جہان آبادی، نادؔر کاکوروی اور عزیؔز لکھنوی وغیرہ کے نام آتے ہیں۔

بہر حال انگریزی نظموں کے ترجمے سے اردو شاعری کا میلان نظم کی طرف ہوا۔ اسی احساس نے محمد حسین آزاؔد کو بھی ایک باضابطہ تحریک کی طرف مائل کیا اور اُنہوں نے پہلے تو اگست ۱۸۶۷ء میں ایک تقریر کی جس کا عنوان تھا ''نظم اور کلامِ موزوں کے باب میں خیالات'' اس کے بعد ۱۹/اپریل ۱۸۷۴ء میں ایک تقریر کے بعد ''شبِ قدر'' کے عنوان سے ایک نظم مثنوی کے فورم میں سنائی۔ اس جلسے میں کی گئی ان کی تقریر کا یہ اقتباس اہم ہے:

''میں نثر کے میدان میں بھی سوار نہیں، پیادہ ہوں اور نظم میں خاک افتادہ، مگر سادہ لوحی دیکھو کہ ہر میدان میں دَوڑنے کو آمادہ ہوں۔ یہ فقط اس خیال سے ہے کہ میرے وطن لے لئے شاید کوئی کام کی بات نکل آئے۔ میں نے آج کل چند نظمیں مثنوی کے طور پر لکھی ہیں جنہیں نظم کہتے ہوئے شرمندہ ہوتا ہوں اور ایک مثنوی جو رات کی حالت میں لکھی ہے گزارش کرتا ہوں۔''

(مجموعہ نظم آزاؔد)

مشہور محقّق پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی نے نظم ''شبِ قدر'' کو نئی شاعری کی پہلی نظم قرار دیا۔

اس کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

تُو رنگِ حکم ہے جو زمانے پہ پھیرتی گویا کہ مُشک اُڑتی ہے عنبر بکھیرتی
روشن تجھی سے رُوئے زمیں پر چراغ ہیں اور آسماں پہ کھلتے ستاروں کے باغ ہیں
بجلی ہنسی تو اُس کی تجھی سے بہار ہے شبنم سے تیرا فیضِ کرم آشکار ہے
اے رات! سلطنت کا تری دیکھ کر حشم کھاتا فلک ہے، تاروں بھری رات کی قسم
اِس وقت مَیں ہوں غور جو کرتا جہان پر اور ہوں خیال کرتا زمین آسمان پر

اس طرح موضوعاتی نظم نگاری کا سلسلہ چل پڑا۔ واضح رہے کہ انجمن پنجاب کے پہلے مشاعرے کی مجوّزہ تاریخ ۳۰ر مئی ۱۸۷۴ء رکھی گئی اور جس کا موضوع ''برسات'' طے پایا۔ حالؔی نے اس میں ''برکھا رُت'' نظم پیش کی جو جدید نظم کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔ اس میں فطری پن اور ربط و تسلسل قائم ہے۔ یہ بھی مثنوی کی ہیئت ہے۔

چند اشعار دیکھئے۔

گرمی سے تڑپ رہے تھے جان دار اور دھوپ میں تپ رہے تھے کہسار
بھوبل سے سوا تھا ریگِ صحرا اور کھَول رہا تھا آبِ دریا
تھی لوٹ سی پڑ رہی چمن میں اور آگ سی لگ رہی تھی بن میں
تھیں لومڑیاں زباں نکالے اور لُو سے ہرن ہوئے تھے کالے

اس کے بعد برسات کا ماحول تیّار کیا جاتا ہے۔

کل شام تلک تو تھے یہی طَور پر رات سے ہے سماں ہی کچھ اَور
برسات کا بج رہا ہے ڈنکا اک شور ہے آسماں پہ برپا
ہے ابر کی فوج آگے آگے اور پیچھے ہیں دَل کے دَل ہوا کے

حالؔی نے انجمن پنجاب کے دَس مشاعروں میں سے صرف چار میں شرکت کی۔ ان مشاعروں میں اُنہوں نے برکھا رُت، نشاطِ اُمید، حُبِّ وطن اور مناظرۂ رحم و انصاف جیسی خوب صورت نظمیں پیش کیں۔ ان موضوعاتی نظموں کی اہمیت کا اندازہ پروفیسر آل احمد سرورؔ کے اس موقف سے بھی لگایا جا سکتا ہے:

> ''برکھا رُت'' اور ''حُبِّ وطن'' سے اردو شاعری میں ایک نئے راگ کا اضافہ ہوتا ہے۔ یہ راگ بالکل نیا تو نہ تھا۔ کیوں کہ اس سے پہلے نظیرؔ اکبر آبادی بھی اسے الاپ چکے تھے مگر ان کی آواز کسی نے بھی نہ سنی۔ حالؔی نے جب یہ نغمہ چھیڑا تو اس کا اثر ہوا اور ان کی اور آزادؔ کی کوششوں سے مقامی رنگ، منظر نگاری، وطن کی محبت اُردو شاعری میں اپنی بہار دکھانے لگی۔''
>
> (مضمون: ہندوستانی ادب میں حالی کا درجہ، ماخوذ از تنقیدی اشارے، ۱۹۵۵ء، ص: ۸۰)

نظیر اکبرآبادی کی نظموں کی اہمیت سے ہم آپ چشم پوشی نہیں کر سکتے۔ آزاد اور حالی سے پہلے اُنہوں نے موضوعاتی نظمیں کہیں لیکن بغور دیکھا جائے تو یہ سمجھ میں آ سکتا ہے کہ آزاد اور حالی یا اسماعیل میرٹھی یا قلق میرٹھی، یا نظم طباطبائی وغیرہ کے سامنے انگریزی نظموں کے نمونے تھے۔ ساتھ ہی اس زمانے کے شعری مذاق پر ابتذال پسندی حاوی تھی اس لئے ضرورت تھی باضابطہ تحریک کی۔ موضوعاتی نظمیں تو قلی قطب شاہ اور مُلّا وجہی نے بھی کہی تھیں لیکن اس وقت یہ مسئلہ قطعی نہیں تھا۔ اس لئے جدید نظم نگاری کے آغاز وارتقا میں آزاد اور حالی کا اہم رول رہا ہے۔ یہی درست مانا گیا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۴﴾ جدید نظم کے آغاز کا سہرا کس کے سر ہے؟

﴿۵﴾ انجمن پنجاب کے تحت پہلا مشاعرہ کب ہوا تھا؟

﴿۶﴾ اس پہلے مشاعرے کا موضوع کیا تھا؟

01.07 اہم نظم نگار شعرا (۱۹۳۶ء سے پہلے)

اس حصّے میں ترقّی پسند تحریک شروع ہونے سے پہلے جن شعرا نے اردو نظم نگاری کے ارتقا میں اہم کردار نبھایا، ان پر مختصر روشنی ڈالی جائے گی۔ آزاد اور حالی پر چوں کہ گفتگو ہو چکی ہے اس لئے ان کے بعد کے شعرا پر گفتگو ہوگی۔

﴿۱﴾ شبلی نعمانی

شبلی کو ایک اہم سیرت نگار، مقالہ نگار اور علاّمہ کی حیثیت سے تو سبھی جانتے ہیں لیکن ان کے ادبی شعری آثار پر گفتگو کم ہوتی ہے۔ جدید نظم کی تحریک سے وہ بھی متاثّر ہوئے تھے۔ اُنہوں نے انگریزی زبان سے ناواقفیت کے باوجود منظوم ترجمہ ''رزمیہ کابل وقندھار'' پیش کیا تھا لیکن اصل چیز ان کی ایک طویل نظم ''صبحِ اُمید'' ہے، جو ۳۵۳/اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ طویل نظم مثنوی کے فورم میں ہے جیسا کہ اس وقت کا چلن تھا۔ مسلم تہذیب ومعاشرت، نئی تعلیم وترقّی، زمانے کی ستم ظریفی اور قوم کی زبوں حالی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس نظم سے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

سمجھے نہ ذرا کہ وقت کیا ہے؟ کس سمت زمانہ چل رہا ہے؟
پھونکا ہے فلک نے اور اَفسوں اب رنگِ زمانہ ہے دِگرگوں
ناچار ہیں، خستہ حال ہیں ہم عبرت کدۂ زوال ہیں ہم

آخر اُمید کی کرن اُبھرتی ہے:

اسلاف کے وہ اَثر ہیں اب بھی اِس راکھ میں کچھ شرر ہیں اب بھی
گوخوار ہیں، طرز وخُو وہی ہے مُرجھا گئے پھول، بُو وہی ہے

شبلی کی بیش تر نظموں میں وہی عظمتِ رفتہ کی کہانی یا مسلمِ قوم کی زبوں حالی کا ذِکر ملتا ہے۔ ان کے سامنے اصلاحی اور اخلاقی اقدار کی بازیافت اہم تھی۔ ان کی مشہور نظمیں قومی مسدّس، ہجرتِ نبوی ﷺ، مذہب یا سیاست، خلیفہ ابن عبدالعزیز کا انصاف، شہر آشوب اسلام، مساواتِ اسلام وغیرہ ہیں۔

﴿۱﴾ سرور جہان آبادی

دُرگا سہائے سرورؔ جہان آبادی کا نام اردو نظم نگاری میں اہمیت کا حامل ہے۔ اصلاحی اور اخلاقی نظم نگاری سرورؔ جہان آبادی کا خاص میدان ہے۔ اس کے علاوہ تعلیم و تربیت، سیاسی و مذہبی اُمور، قومی و وطنی عناصر کو بھی سرورؔ نے اپنی نظموں میں پیش کیا ہے۔ ہندوستانی سماج میں بیوہ کی زندگی کتنی اجیرن ہوتی ہے اس کی عکّاسی ان کی نظم بیوہ میں ملتی ہے۔

حکم چند نیّر نے لکھا ہے:

''سرورؔ کا اجتماعی شعور اور سماجی احساس بالیدہ تھا۔'' (نوائے سرور۔ص:۲۵)

ان کی مشہور نظم ''سوزِ بیوگی'' سے صرف دو شعر دیکھیں، جن میں بیوہ کی تاریک زندگی پیش کی گئی ہے۔

پسند آئی نہ آرائش تجھے او آسماں میری
اتاریں بدھیاں بے درد! توڑیں چوڑیاں میری
وہ نقشِ نا مرادی ہوں، سراپا درد ہوں، غم ہوں
مرقّع میں جہاں کے، آہ! میں تصویرِ ماتم ہوں

سرورؔ کی ایک اور اہم نظم ''دنیا کی اُجڑی ہوئی محفل'' ہے، جس میں دنیا اور زندگی کی بے ثباتی کا ذِکر ہے۔ ایک حزنیہ لہجہ اس پوری نظم پر حاوی ہے۔، ساتھ ہی اصلاح کا پیغام بھی۔ آخر کا یہ حصّہ ملاحظہ کیجیے:

یہ نتیجہ آہ ہو جس عیش کا پایانِ کار تُف ہے ایسے عشق پر اس سے تو بہتر ہے عذاب
دل لگانے کی جگہ دنیا نہیں ہے، اے سرورؔ ساتھ دیتی ہے کسی کا، آہ! کب خانہ خراب

اس کے علاوہ اُنہوں نے ہندو مذہب سے متعلّق چند اہم نظمیں کہیں۔ جیسے گنگا جمنی، لکشمی جی، پریاگ کا سنگم، گریہ وزاری وغیرہ۔ سرورؔ نے اپنی حُبُّ الوطنی کے موضوع پر بھی اچھّی نظمیں پیش کیں۔ یادِ وطن، عروسِ حبِّ وطن، پھولوں کا کنج، قومی نوحہ، مادرِ ہند وغیرہ۔

﴿۲﴾ علاّمہ اقبال

اقبالؔ کی شاعری کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دَور سفرِ انگلستان سے پہلے یعنی ۱۹۰۵ء تک اور دوسرا دَور وہاں سے واپسی کے بعد سے لے کر اواخر تک۔ اگر چاہیں تو مزید ادوار کی تقسیم ہو سکتی ہے لیکن ایسا ضروری نہیں ہے۔

شروع کی شاعری میں اقبال کے یہاں قومی، وطنی اور مشترکہ تہذیب کے عناصر غالب ملتے ہیں۔ ساتھ ہی مناظرِ قدرت اور نیچرل شاعری کے نقوش پہلے دَور کی شاعری میں خوب ملتے ہیں۔ ایسی نظموں میں کہسار، ہمالہ، ماہِ نو، نیا شوالہ، ترانۂ ہندی، ہندوستانی بچّوں کا قومی گیت وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

خوب صورت منظر کشی کے لئے ''ماہِ نو'' کا صرف ایک بند دیکھئے:

ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقابِ نیل ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے روئے آبِ نیل
طشتِ گردوں میں ٹپکتا ہے شفق کا خونِ ناب نشترِ قدرت نے کیا کھولی ہے فصدِ آفتاب

چرخ نے بالی چرالی ہے عروسِ شام کی
نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیمِ خام کی

اقبال نے دنیا کے تمام مذاہب اور فلسفوں کو کھنگالنے کے بعد اسلام کی روح کو اصل قرار دیا۔ اسلامی افکار اور فلسفوں کو انسانی زندگی کی فلاح و بہبود کے لئے ضروری سمجھا۔ تہذیبی اور اخلاقی تنزّل کے لئے مغربی تہذیب کو موردِ الزام ٹھہرایا۔ ''ضربِ کلیم'' کی ایک چھوٹی سی نظم مغربی تہذیب میں وہ کہتے ہیں

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب — کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید — ضمیرِ پاک و خیالِ بلند و ذوقِ لطیف

مشرقی تہذیب اور خودی کی پاسداری کا پیغام ان کی پوری شاعری کا مرکزی اور حاوی موضوع ہے۔ ان کی دو نظموں سے چند اشعار:

''جاوید کے نام'' ؎

اُٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں — سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر
مِرا طریق امیری نہیں، فقیری ہے — خودی نہ بیچ، غریبی میں نام پیدا کر

''ایک نوجوان کے نام'' ؎

ترے صوفے ہیں افرنگی، ترے قالیں ہیں ایرانی — لہو مجھ کو رُلاتی ہے، جوانوں کی تن آسانی
امارت کیا، شکوہِ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل؟ — نہ زورِ حیدری تجھ میں، نہ استغنائے سلمانی
نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیبِ حاضر کی تجلّی میں — کہ پایا میں نے استغنا میں معراجِ مسلمانی

اقبال کی یہ خوبی ہے کہ وہ مسلم تہذیبی آثار اور عظمتِ رفتہ کو اپنی نظموں میں پیش کرتے ہیں۔ ہر جگہ عشق کا فلسفہ عقل پر حاوی نظر آتا ہے۔ مسجد قرطبہ، ہسپانیہ، اقوامِ مشرق، ذوق و شوق، ساقی نامہ جیسی نظموں میں ان کا فکری میلان واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

مندرجہ ذیل اشعار دیکھتے چلیں ؎

یادِ عہدِ رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے — میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے
عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفےٰ — عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام
بے خطر کُود پڑا آتشِ نمرود میں عشق — عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی
ہسپانیہ تو خونِ مسلماں کا امیں ہے — مانندِ حرم پاک ہے تو میری نظر میں
پوشیدہ تیری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں — خاموش اذانیں ہیں تری بادِ سحر میں

☆

خودی کیا ہے؟ رازِ دَرُونِ حیات — خودی کیا ہے؟ بیداریٔ کائنات
خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے — فلک جس طرح آنکھ کے تِل میں ہے

اردو نظم نگاری کو علاّمہ اقبالؔ نے ایک وسیع تناظر سے آشنا کیا۔ اُنہوں نے آدم کی عظمت اور دینِ محمدی کے مرکزی افکار کو اپنی نظموں میں پیش کر کے اردو شاعری کے مرتبے کو بلند کیا۔ جو نظم آزادؔ اور حالیؔ سے شروع ہوئی تھی اسے اقبالؔ نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

01.08 اہم نظم نگار شعرا (۱۹۳۶ء کے بعد)

۱۹۳۶ء کے آس پاس اردو نظم میں ایک طرح کی تبدیلی پیدا ہوئی۔ شاعروں نے محسوس کیا کہ سماجی سروکار کو اردو شاعری کا حصّہ بنانا ضروری ہے۔ سجّاد ظہیر نے باضابطہ ترقّی پسند تحریک شروع کی جس کی پہلی کل ہند کانفرنس اپریل ۱۹۳۶ء ہوئی۔ ادب کے افادی پہلوؤں کو اہمیت دی گئی۔ بھوک، افلاس، طبقاتی کش مکش اور اجتماعی فکر کو موضوعِ سخن بنایا گیا۔ اسی ترقّی پسند عہد میں اختر الایمان بھی تھے۔ اُنہوں نے ترقّی پسند تحریک کے منشور سے باضابطہ وابستگی نہیں رکھی لیکن اردو نظم نگاری میں اونچا مقام حاصل کیا۔

اسی ترقّی پسند تحریک سے کچھ شعرا اور اُدبا الگ ہو گئے۔ اس جماعت کا نام ''حلقۂ اربابِ ذوق'' رکھا گیا۔ اس کے مشہور شعرا میں ن.م.راشدؔ، میراجی، ضیاء جالندھری، قیوم نظرؔ، یوسف ظفرؔ، مختار صدّیقی وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ حلقۂ اربابِ ذوق کے شعرا میں سے یہاں صرف راشد اور میراجی پر گفتگو ہوگی۔ اختر الایمان کو ترقّی پسند شعرا کے بعد رکھا گیا ہے۔

(۱) فیض احمد فیضؔ

فیضؔ کا پہلا مجموعہ ''نقشِ فریادی'' شائع ہوا، جس میں حُسن و عشق کی دل فریبی، انتظار، محبوب سے قربت کی آرزو، محبوب کے خدو خال، زلف و رُخسار کی باتیں، ہجر و وصال کا اظہار مساوی طور پر نظر آتا ہے۔ مثلاً یہ اشعار دیکھئے ؎

رسیلے ہونٹ، معصومانہ پیشانی، حسیں آنکھیں — کہ میں اک بار پھر رنگینیوں میں غرق ہو جاؤں
مری ہستی کو تیری اک نظر آغوش میں لے لے — ہمیشہ کے لئے اس دام میں محفوظ ہو جاؤں
چشمِ مَے گوں ذرا اِدھر کر دے — دستِ قدرت کو بے اثر کر دے

لیکن ''نقشِ فریادی'' میں صرف یہی رنگ نہیں ملتا بلکہ انسانی درد اور ظلم و جبر کی کہانی بھی نظر آتی ہے، دیکھئے ؎

جا بہ جا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
جسم نکلے ہوئے امراض کے تنّوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے
لوٹ جاتی ہے اُدھر کو بھی نظر کیا کی جے
اب بھی دل کش ہے ترا حسن مگر کیا کی جے
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب! نہ مانگ

فیضؔ کی خوبی یہ ہے کہ اپنی شاعری کو اُنہوں نے نعرے بازی سے بچا کر رکھا۔ان کے یہاں جبر و استبداد کی پیش کش صرف ہندوستانی تناظر میں نہیں بلکہ ایران، بیروت اور فلسطین میں ہو رہے جبر وظلم میں بھی ہوئی ہے۔ پوری انسانی تہذیب کو پُر خلوص جذبے کے ساتھ پیش کیا ہے۔ فلسطینی بچّے کی لوری، کیا کریں، عشق اپنے مجرموں کو پا بجولاں لے چلا، ایرانی طلبا کے نام، رقیب سے، چند روز اور مری جان اور کتّے وغیرہ نظموں میں ان کی ہم دَردی اور جذبۂ خلوص کو تخلیقیت اور فن کاری کے ساتھ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام ترقّی پسند شعرا میں فیضؔ کا وقار اور مقام و معیار سب سے زیادہ مستحکم اور بلند ہے۔

﴿۲﴾ مخدوم محی الدّین

مخدوم کی نظموں میں رومانی عناصر بھی ہیں اور انقلابی اُمور کی کارفرمائی بھی۔انقلاب کے اظہار میں کبھی کبھی ان کے یہاں جذباتیت بھی پائی جاتی ہے۔ سستی نعرے بازی نے کہیں کہیں ان کی شاعری کو نقصان پہنچایا ہے۔ان کے مجموعۂ کلام ''سرخ سویرا'' میں ''باغی''، نظم کے مطالعے سے یہی پتہ چلتا ہے لیکن اُنہوں نے مندر و مسجد، کھیت، موسم، دہقانوں کی تان، کوئل کی کُو کُو، ماضی کے شکستہ نقوش کو بھی اپنی نظموں میں جگہ دی ہے۔ان کی تہذیبی و فکری رویّے ہندوستانی رنگ سے ہم آمیز ہیں۔بیش تر نظمیں دل چسپ اور دل کش ہیں۔ دو نظموں سے یکے بعد دیگر یہ ٹکڑے دیکھئے۔

نظم ''حویلی'': سرخ سویرا:

ایک بوسیدہ حویلی یعنی فرسودہ سماج
لے رہی ہے نزع کے عالم میں مُردوں سے خراج
ہنس رہا ہے زندگی پر اس طرح ماضی کا حال
خندہ زن ہو جس طرح عصمت پہ قحبہ کا جمال

بنگال: سرخ سویرا:

اُمّتِ مرحوم ہو یا ملّتِ زنّار دار
ان کے فاقوں کی نہ گنتی ہے نہ لاشوں کا شمار
مرد و زَن ، شیخ و برہمن سب قطار اندر قطار
آہ! سوکھی چھاتیوں کی چیخ، بچّوں کی پکار

﴿۳﴾ اسرار الحق مجازؔ

مجازؔ کی شہرت بھی فیضؔ سے کم نہیں رہی۔ان کی شاعری میں رومانی اور انقلابی دونوں طرح کے عکس دیکھے جا سکتے ہیں۔ان کا جذبۂ انقلاب بھی کبھی کبھی بے لگام ہو کر سطحی نعرے بازی کے قریب آ جاتا ہے۔ نظم ''انقلاب'' میں خون کا نقشہ جس طرح پیش کیا گیا ہے۔اس سے ان کا گھن گرج والا اُسلوب سامنے آتا ہے۔ترقّی پسند تحریک کے آغاز ۱۹۳۶ء سے تین سال پہلے ۱۹۳۳ء میں یہ نظم کہی گئی تھی۔ مثالاً دو اشعار:

آ رہے ہیں جنگ کے بادل وہ منڈلاتے ہوئے — آگ دامن میں چھپائے، خون برساتے ہوئے
ختم ہو جائے گا یہ سرمایہ داری کا نظام — رنگ لانے کو ہے مزدوروں کا جوشِ انتقام

سرمایہ داری کے عنوان سے بھی ان کی ایک نظم ہے اس میں لہجہ ذرا دھیما ہوا ہے۔اس لئے شاعری اچھّی ہوگئی ہے۔دو شعر دیکھئے ۔

یہ اپنے ہاتھ میں تہذیب کا فانوس لیتی ہے مگر مزدور کے تن سے لہو تک چھین لیتی ہے
یہ غیرت چھین لیتی ہے حمیّت چھین لیتی ہے یہ انسانوں سے انسانوں کی فطرت چھین لیتی ہے

مجاز کی جس نظم کو سب سے زیادہ شہرت ملی وہ ''آوارہ'' ہے، جو پندرہ بند پر مشتمل ہے۔جذبات گرچہ یہاں بھی حاوی ہیں لیکن خلوص اور بے ساختگی نے اس میں روانی اور ہم دَردی کے عناصر بھر دیئے ہیں:

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اس کے دمکتا ہے جو پتّھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں
اے غمِ دل کیا کروں ، اے وحشتِ دل کیا کروں

قصرِ تمدّن اور تصنّع بھرے سماج سے مجاز کو نفرت ہے۔وہ عورت کو بھی انقلاب میں ہاتھ بٹانے کی دعوت دیتے ہیں۔ نظم ''نوجوان خاتون'' سے یہ شعر دیکھئے ۔

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھّا تھا

ان کی مشہور نظموں میں رات اور ریل، نذرِ خالدہ، نورا اور آہنگِ جنوں ہیں۔فیضؔ نے ''آہنگ'' کے دیباچے میں لکھا ہے کہ مجاز انقلاب کا ڈھنڈورچی نہیں انقلاب کا مطرب ہے۔

﴿۴﴾ ساحرؔ لدھیانوی

ساحرؔ نے معاشرے کی کھوکھلی تہذیب اور انسانی کمزوریوں کو نشانہ بنایا ہے۔ان کی فکری لَو تیز ہے لیکن اس سے جو روشنی نکلتی ہے وہ دلوں کو جلاتی نہیں بلکہ سلگنے کی کیفیت سے دوچار کرتی ہے۔ان کی لفظیات فیضؔ سے بہت قریب ہے۔ان کی نظم 'چکلے' ہو یا 'پرچھائیاں'، 'اے شریف انسانو' ہو یا 'شعاعِ فردا'، 'یہ کس کا لہو' ہو یا 'تاج محل'، 'مرے عہد کے حسینو' ہو یا 'آج' ہر جگہ ان کا حُزنیہ لہجہ اور فن کارانہ اظہار واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔کوئی ترقّی پسند جنگ اور خون کو انقلاب کا ذریعہ تصوّر کرتا ہے، کوئی آندھی اور طوفان کو۔لیکن ساحرؔ کی سنیے ۔

جنگ تو خود ہی ایک مسئلہ ہے
جنگ کیا مسئلوں کا حل ہوگی

اندازہ ہوتا ہے کہ کتنا سچّا فن کار ہے۔وہ خود کو دھوکہ دیتا ہے نہ سماج کو جھوٹا سبز باغ دکھاتا ہے۔''چکلے'' کا صرف ایک بند دیکھئے، جس سے اندازہ ہوگا کہ وہ کتنا سخت طنز کرتے ہیں، لیکن کس خوب صورتی سے ۔

یہاں پیر بھی آچکے ہیں جواں بھی تنومند بیٹے بھی ابّا میاں بھی
یہ بیوی بھی ہے اور بہن بھی ہے ماں بھی ثناخوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں

ظ.انصاری نے بہت مناسب تبصرہ کیا ہے کہ:

''ساحرؔ کے یہاں شور پکار نہیں۔احتجاج ہے،شان وشکوہ نہیں،ڈرامائی تناؤ ہے،طمطراق نہیں۔ہر ایک مظہر اور منظر اپنی اذیّت یا مسرّت کا اظہار ہے۔'' (بحوالہ فن اور شخصیت، ساحر نمبر،۱۹۸۴ء،ص:۵۵)

﴿۵﴾ سلام مچھلی شہری

سلامؔ ایک ایسے شاعر ہیں جو ترقّی پسندوں میں گیت لے لئے بھی مشہور ہیں۔کہیں عالمگیر مساوات کا ذِکر ہے تو کہیں پیڑوں کے سائے میں رومان پرور کتھاؤں کا بیان۔گیت سیّد مطلبی نے بھی لکھے ہیں اور سجّاد ظہیر نے بھی۔سلامؔ کے گیتوں میں کوئی توڑے نہ سپنوں کا ہار، کورس، میں باغ کی نازتتلی ہوں اور گیتوں کے ہروا گوندھوں گی وغیرہ اہم ہیں۔

سلامؔ کی نظر معاشرے کی کھوکھلی تہذیب پر بھی ہے۔مزدوروں کی زندگی اور سماجی جبر کو بھی اُنہوں نے نظموں میں جگہ دی ہے۔ساتھ ہی جذبۂ حُبُّ الوطنی کو بھی نظموں میں پیش کیا ہے۔ان کی مشہور نظمیں اس طرح ہیں: خاموش رہو، سڑک بن رہی ہے، محدود سرخیاں، تاج محل، مسافر وغیرہ ہیں۔

﴿۶﴾ سردار جعفری

سردارؔ جعفری کا سیاسی اور سماجی شعور بالیدہ ہے۔عورت کو ترقّی پسندوں نے خاص طور پر موضوع بنایا اور اہم کردار کے طور پر پیش کیا۔ سلمیٰ، عذرا، نورا اور پھر مریم اسی زمانے کے کردار ہیں۔سردارؔ کی مشہور نظم ''نئی دنیا کو سلام'' میں مریم اور جاوید کو کئی جہات سے مستحکم کردار بنا کر پیش کیا گیا ہے۔سیاہی بھی ہے اور رزم بھی، محبّت بھی ہے اور تصادم بھی، برطانوی حکومت کے خلاف احتجاج بھی۔مریم کی زبانی صرف یہ ٹکرا سنیے، جس میں وہ فرنگیوں سے مخاطب ہے:

جب سے تم آئے ہو گھر کی سب برکتیں اُٹھ گئی ہیں
تم نے ہندوستان کے لہکتے ہوئے کھیتوں سے
ان کی زرخیزیاں چھین لی ہیں

سردارؔ کی نظمیں رومانی بھی ہیں اور انقلابی بھی، تہذیبی سروکار سے پُر بھی ہیں اور سیاسی بصیرت سے معمور بھی۔''ایک خواب اور سہی'' کی بیش تر نظمیں رومانی ہیں لیکن ''خون کی لکیر'' میں ایک تبدیلی کا احساس ہوتا ہے۔''رومان سے انقلاب تک'' کا مطالعہ کریں تو کھوکھلی تہذیب سامنے آجاتی ہے۔

میں نے دہلی میں، پنجاب میں اپنے نغموں کی جھولی پسّاری
اور ایک ایک سے امن کی بھیک مانگی
اور اُنہوں نے میری گود میں
چند جھلسے ہوئے ہاتھ

ٹوٹی ہوئی ہڈیاں

خوں میں لتھڑی ہوئی چھاتیاں پھینک دیں

سردارؔ کی مشہور نظم ''جمہور'' بھی ہے، جس میں ہندوستانی سماج اور سیاست کا نقشہ پیش کیا گیا ہے اور جو اقبال کی مشہور نظم ''ساقی نامہ'' کی زمین میں ہے۔

یہ ہندوستاں رشکِ خلدِ بریں اگلتی ہے سونا وطن کی زمیں

کہیں کوئلے اور لوہے کی کان کہیں سرخ پتّھر کی اونچی چٹان

یہ گنگا کا آنچل یہ جمنا کی ریت یہ دھان اور گیہوں کے شاداب کھیت

اخیر میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ سردارؔ جعفری نے خیر و شر کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔ اسے حق و باطل بھی کہہ سکتے ہیں۔ ان کی دوسری مشہور نظمیں جیسے ''اودھ کی خاکِ حسیں، ہاتھوں کا ترانہ، ایشیا جاگ اُٹھا وغیرہ۔

﴿۷﴾ کیفیؔ اعظمی

دوسرے ترقّی پسند شاعروں کی طرح ان کے یہاں بھی محکومیت و مظلومیت اور استحصال موضوعات کے طور پر ہوئے ہیں۔ ظلم عورت پر ہو یا مزدور، کسان پر، کیفی کا دل کانپ اُٹھتا ہے۔ عورت کو یہ بھی سماجی اور سیاسی تحریک میں مردوں کے شانہ بشانہ چلنے کی تلقین کرتے ہیں۔

نظم ''عورت'' کا صرف ایک بند دیکھئے۔

قدر اب تک تری تاریخ نے جانی ہی نہیں تجھ میں شعلے بھی ہیں، بس اشک فشانی ہی نہیں

تو حقیقت بھی ہے، دل چسپ کہانی ہی نہیں تیری ہستی بھی ہے اک چیز، جوانی ہی نہیں

اپنی تاریخ کا عنوان بدلنا ہے تجھے

اُٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

''بیوہ جو مطعونِ خلائق رہتی ہے اس پر ایک نظم ''بیوہ کی خودکشی'' ہے، جس میں درد و کرب ہے۔ کیفی کی ایک نظم ''لال جھنڈا'' ہے، جس میں ان کی کمیونزم سے خاص وابستگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ بیش تر نظموں کی لَے بہت تیز بلکہ کرخت ہے۔ 'فتح برلن' یا 'یلغار' یا پھر 'نئی جنّت' کا مطالعہ کریں تو یہی اندازہ ہوگا۔ ان کی جو اچھّی اور مشہور نظمیں ہیں ان کے نام یوں ہیں: دائرہ، زندگی، آوارہ سجدے، عورت، مکان وغیرہ۔

﴿۸﴾ اخترؔ الایمان

اخترؔ الایمان کی نظمیں کسی بھی تحریک سے وابستہ نہیں ہیں۔ البتّہ ان کے یہاں ایک ایسا احساس ملتا ہے جو ماضی، حال، مستقبل تینوں زمانوں کو محیط ہے لیکن ماضی ان کی شاعری کا ایک اٹوٹ حصّہ ہے، جو اپنی شکل بدل بدل کر آتا رہتا ہے۔ ان کی نظم ''ایک لڑکا'' پڑھیں یا ''بازآمد'' یا پھر ''پرانی فصیل'' یا اسی طرح ''بنتِ لمحات'' یا ''عہدِ وفا'' ہر جگہ وہی ماضی یا ماضی کی یادیں کسی نہ کسی روپ میں نظر آتی ہیں۔ لمحہ گریزاں ہے جو حاوی رہتا ہے ان کے حافظے میں جیسے ماضی نے بسیرا کر لیا ہو۔ ''بنتِ لمحات'' اور ''پرانی فصیل'' سے یہ ٹکڑے دیکھئے۔

یہ ہندوستاں رشکِ خلدِ بریں اُگلتی ہے سونا وطن کی زمیں
حیات نام ہے یادوں کا تلخ اور شیریں بھلا کسی نے کبھی رنگ و بو کو پکڑا ہے

☆

مری تنہائیاں مانوس ہیں تاریک راتوں سے مرے رخنوں میں ہے اُلجھا ہوا اوقات کا دامن
مرے سائے میں حال و ماضی رُک کر سانس لیتے ہیں زمانہ جب گزرتا ہے بدل لیتا ہے پیراہن

ان کی پوری شاعری کے مطالعے کے بعد یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ان کی شاعری کا مرکزی تصوّر ماضی اور اس کی یادیں ہیں۔

﴿۹﴾ن.م.راشد

مجموعۂ کلام ''ماورا'' ۳۱ برس کی عمر میں منظرِ عام پر آیا۔اس مجموعے کی مشہور نظم بقول کرشن چندر ''دریچے کے قریب'' ہے۔ان کی نظموں میں اساطیری اور دیومالائی کردار اور نقوش ملتے ہیں۔ وہ انسانی دکھ دَرد میں بھی شریک ہوتے ہیں۔جس کی مثال میں ''انسان''، ''لاّ = انسان'' دیکھی جاسکتی ہے۔اسی طرح ''زندگی ایک پیرزن'' کے مطالعے سے بھی ان کے اندر ایک طرح کے کرب کا احساس ہوتا ہے۔

نظم ''انسان'' کا یہ ٹکڑا دیکھئے ؎

الٰہی تیری دنیا جس میں ہم انسان رہتے ہیں غریبوں، جاہلوں، مُردوں کی بیماروں کی دنیا ہے
یہ دنیا بے کسوں کی اور لاچاروں کی دنیا ہے ہم اپنی بے بسی پر رات دن حیران رہتے ہیں!

اس کے علاوہ ان کی نظموں میں صحرائی اور عجمی تہذیب کے نقوش بھی ملتے ہیں۔''نئی آگ''، ''دل مرے صحرا نورود پیر دل''، ''حَسَن کوزہ گر'' وغیرہ نظمیں ایسی ہی مثالیں پیش کرتی ہیں۔ان کی نظموں میں سماجی بدحالی، تہذیبی اقدار کا نوحہ اور جدید اذہان کی ٹوٹ پھوٹ کا عکس بھی ملتا ہے۔ان کے اسلوب شاعری میں ایک طنطنہ و بے باکی اور نشاطِ کرب کا رنگ جھلکتا ہے۔اردو نظم کو اُنہوں نے ایک زندہ اور توانا اسلوب عطا کیا ہے۔

﴿۱۰﴾میراجی

میراجی کی شاعری سے زیادہ ان کی شخصیت پُراسرار اور پُرکشش رہی ہے۔ان کی فکری جہات میں ہندوستانی تہذیب کے کئی دھارے شامل تھے۔بدھ مت، وشنومت اور پھر ایشائی رنگ۔ان کی نظموں میں پرانی دیومالائی تصویریں ملتی ہیں۔چوں کہ مذہبِ اسلام میں تجسیمی احساسات کی گنجائش نہیں اس لئے اُنہوں نے ایک ایسے تصوّر کو اپنایا جہاں ہر طرح کی آزادی تھی۔ان کا تصوّر ہے کہ روحانی حظ لے لئے جسمانی وسائل ضروری ہیں۔اسی لئے ان کے یہاں تمام فکری دھارے محبوب یا عورت کے خارجی جسم یا لباس تک محدود ہیں۔عکس کی حرکت، نامحرم، ترغیب، دُور کرو پیراہن کے بندھن، جیسی نظمیں پڑھ کر اس کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ میراجی جنسی فعل اور اس کے متعلّقات کو ہمیشہ قدرت کی بڑی نعمت سمجھتے ہیں۔سماجی بندھنوں کے وہ مخالف تھے۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے ان کی نظموں کو ''دھرتی پوجا'' کی مثال کہا ہے۔

نظم ''ترغیب'' سے یہ ٹکڑے:

رسیلے جرائم کی خوشبو
مرے ذہن میں آ رہی ہے
نگاہوں میں ہے میری نشے کی اُلجھن
کہ چھایا ہے ترغیب کا پیرہن آج ہر اک حسیں پر
رسیلے جرائم کی خوشبو مجھے آج للچا رہی ہے
قوانین اخلاق کے سارے بندھن شکستہ نظر آ رہے ہیں
حسین اور ممنوع جھُرمٹ مرے دل کو پھُسلا رہے ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۷﴾ ''نئی دنیا کو سلام'' کس کی مشہور نظم ہے؟

﴿۸﴾ فیضؔ کے پہلے مجموعے کا نام کیا ہے؟

﴿۹﴾ ابرِ کہسار، ماہ نو اور مسجد قرطبہ کس کی نظمیں ہیں؟

01.09 اردو نظم (۱۹۶۰ء کے بعد)

۱۹۵۵ء کے بعد اردو نظم نگاری میں ایک طرح کی تبدیلی پیدا ہوئی جس میں کلاسیکی یا روایتی ادا یا ترقّی پسند تحریک کا موضوعاتی اصرار نہیں ملتا۔ یہ جدیدیت کا دَور ہے۔ بندھا ٹکا نظریہ یا اجتماعی تحریک یا طے شدہ اُسلوب اس نئی نظم کی شناخت نہیں۔ اس نے نئے طرزِ ادا اور گدازانہ طور پر نئی ہیئتوں کو جنم دیا۔ ترقّی پسند تحریک کا سارا زور سماجی سروکار اور اجتماعی فکر پر تھا۔ حلقۂ اربابِ ذوق نے ہیئت اور اُسلوب کی پابندی پر زور دیا۔

۱۹۶۰ء کے بعد نظموں میں رنگا رنگی اور تہ داری ملتی ہے۔ پابند، معرّیٰ یا آزاد ہیئتوں کی قید یہاں نہیں رہ گئی۔ اس نئی نظم میں فن کاروں کو پوری آزادی ملی ہے اور ہر لحاظ سے اردو نظم کو فروغ حاصل ہوا ہے۔ نئے طرزِ احساس اور نئی حسّیت نے نئی فضا بندی کی ہے۔ چند اہم نظم نگار شاعروں کے نام اس طرح ہیں: منیب الرّحمٰن، بلراج کومل، مغنّی تبسّم، شفیق فاطمی شعریٰ، عمیق حنفی، فہمیدہ ریاض، شہاب جعفری، زبیر رضوی، محمّد علوی، شہریار، کمار پاشی، احمد ہمیش، ندا فاضلی، کشور ناہید، مظہر امام وغیرہ۔

اس جدید نظم کے بارے میں مشہور ادیب و ناقد شمس الرّحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

''داخلی اور معنوی حیثیت سے میں اس شاعری کو ''جدید'' سمجھتا ہوں جو ہمارے دَور کے احساسِ جرم، خوف، تنہائی، کیفیتِ انتشار اور اس ذہنی بے چینی کا کسی نہ کسی نہج سے اظہار کرتی ہو۔''

(لفظ و معنی: فاروقی، ۱۹۶۸ء، ص:۱۲۶)

01.10 خلاصہ

اس سبق میں نظم کی تعریف اور اس کی چند خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی۔ اب تک آپ کو نظم کی پہچان ہو چکی ہوگی۔ نظم میں ہیئت کے تجربے اور اس میں برتے جانے والے موضوعات پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔ جدید نظم کے آغاز یعنی ''انجمن پنجاب'' کے تحت محمد حسین آزاد نے جو تحریک شروع کی تھی اس پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی۔ دراصل یہی آغاز ہے جس سے آئندہ چل کر اردو نظم کو نئی آب و تاب نصیب ہو سکی۔

ترقّی پسند تحریک نے اردو نظم کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا۔ اس سبق میں کوشش کی گئی ہے کہ ہر دَور کے اہم نظم نگار شاعروں پر اختصار کے ساتھ ہی سہی، کچھ نہ کچھ روشنی ضرور ڈالی جائے۔ بہت سے شعرا رہ گئے ہیں کیوں کہ طوالت کی یہاں گنجائش نہیں تھی۔ اسی طرح ۱۹۶۰ء کے بعد کی نظموں نے جس تبدیلی کا احساس دلایا وہ بھی توجّہ طلب ہے۔ آپ کو صرف اس عہد کی حسّیت اور چند شاعروں کے نام سے واقف کرا دیا گیا ہے تا کہ آپ اُنہیں اپنے مطالعے کی بنیاد بنا سکیں۔

01.11 فرہنگ

ارتقائی عمل	: آگے کی طرف بڑھنے کا عمل	عفیف	: پاک
پیادہ	: پیدل	مرکزی خیال	: اصل موضوع
تناظر	: پس منظر	ممیّز	: امتیاز والا، اونچے مقام والا
سفال	: مٹّی	منشور	: بکھرا ہوا، کسی جماعت کا Manifesto

01.12 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درجِ ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : نظم کی تعریف کیجیے؟

سوال نمبر۲ : وزیر آغا نے میراجی کی نظموں کو کس نام سے یاد کیا ہے؟

سوال نمبر۳ : علاّمہ اقبال کی نظم نگاری کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : نظم کے آغاز پر ایک مضمون لکھئے۔

سوال نمبر۲ : جدید نظم کے آغاز و ارتقا پر روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر۳ : ۱۹۳۶ء کے بعد کی نظمیہ شاعری پر اظہارِ خیال کیجیے۔

01.13 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اردو شاعری کا فنّی ارتقا از ڈاکٹر فرمان فتح پوری

۲۔ اردو میں ترقّی پسند ادبی تحریک از خلیل الرّحمٰن اعظمی

۳۔ پانچ جدید شاعر از حمید نسیم

۴۔ جدید نظم: حالی سے میراجی تک	از	کوثر مظہری
۵۔ حلقۂ ارباب ذوق	از	یونس جاوید
۶۔ نظم جدید کی کروٹیں	از	وزیر آغا

01.14 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ نظم کی کوئی ایسی باضابطہ تعریف نہیں کی جاسکتی، جس پر سب متفق ہوں پھر بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ:
ایک ایسا منظوم فن پارہ جس میں ایک مرکزی خیال ہو، تسلسل ہو، ربط ہو، ارتقا اور اختتام ہو، نظم ہے۔

﴿۲﴾ شروع میں نظم مسدّس، مثنوی، مخمّس، ترجیع بند، ترکیب بند، مستزاد وغیرہ ہیئتوں میں کہی جاتی رہی۔
بعد میں پابند ہیئتوں سے آگے بڑھ کر معرّیٰ، آزاد اور اب نثری ہیئتوں میں نظمیں کہی جارہی ہیں۔

﴿۳﴾ نظم کے موضوع کی کوئی تخصیص نہیں ہوتی۔ سماجی مسائل سے لے کر حالاتِ حاضرہ،
تحریکِ آزادی سے لے کر عشق و محبت اور جدید حسّیت جیسے موضوعات ہوسکتے ہیں۔

﴿۴﴾ جدید نظم کے آغاز کا سہرہ محمّد حسین آزاد کے سر ہے۔

﴿۵﴾ ''انجمن پنجاب'' کے تحت پہلا مشاعرہ ۳۰ مئی ۱۸۷۴ء کو ہوا۔

﴿۶﴾ اس پہلے مشاعرے کا موضوع ''برسات'' تھا۔

﴿۷﴾ ''نئی دنیا کو سلام'' سردار جعفری کی نظم ہے۔

﴿۸﴾ فیضؔ کے پہلے مجموعہ کلام کا نام ''نقش فریادی'' ہے۔

﴿۹﴾ ابرِ کہسار، ماہِ نو، اور مسجدِ قرطبہ علاّمہ اقبال کی نظمیں ہیں۔

اکائی 02 : نظیرؔ اکبرآبادی (ہنس نامہ)

ساخت

02.01 : اغراض ومقاصد

02.02 : تمہید

02.03 : نظیرؔ اکبرآبادی کے حالاتِ زندگی

02.04 : نظیرؔ اکبرآبادی کی ادبی خدمات

02.05 : نظیرؔ اکبرآبادی کی نظم نگاری

02.06 : نظم ''ہنس نامہ'' کا متن

02.07 : نظم ''ہنس نامہ'' کا تجزیہ

02.08 : خلاصہ

02.09 : فرہنگ

02.10 : نمونہ امتحانی سوالات

02.11 : حوالہ جاتی کتب

02.12 : اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

02.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی کا مقصد نظیرؔ اکبرآبادی کی حیات اوران کی نظم گوئی کی اہم خصوصیات سے روشناس کرانا ہے۔اس سلسلے میں ان کی زندگی کے اہم گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔تاکہ آپ ان کی شخصیت اورادبی خدمات سے متعارف ہوسکیں۔اس اکائی میں نظیرؔ اکبرآبادی کی شہرۂ آفاق نظم ''ہنس نامہ'' کے اصل متن کو شامل کیا گیا ہے۔نظم کی اہم خصوصیات سے بحث کی گئی ہے اور تجزیہ بھی پیش کیا گیا ہے۔تجزیہ اور خصوصیات کی روشنی میں اس نظم کے اندازِ بیان سے بھی واقفیت ہوگی اوران کی اس نظم کی تفہیم کے علاوہ دیگر نظموں کو سمجھنے میں بھی آسانی ہوگی۔

02.02 تمہید

اردو کے شعری ونثری سرمائے نے بول چال کی زبان میں ترقّی کی۔جب رفتہ رفتہ اردو ادب کو ایک مقام حاصل ہوگیا تو اس کے تجزیہ اور ناپ تول کے پیمانے بدل گئے اور کچھ مخصوص ادبی مراکز میں محدود کردیئے جانے کے سبب اس کا رشتہ عوام سے منقطع ہوگیا۔ادب میں سادگی اورعوامی زبان کے بجائے عربی اور فارسی زبان کے الفاظ کی کثرت نظر آنے لگی۔ان خیالات کو موضوعِ سخن بنایا جانے لگا جن کا تعلّق براہِ راست ہندوستانی عوام کی زندگی سے نہ تھا۔شعرائے کرام نظم کی بجائے زیادہ تر قصیدہ اورغزل کی اصناف میں اپنے فن کے جوہر

دکھانے کو کمال سمجھنے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ نظم کا انمول ذخیرہ ایک مدّت تک علماے ادب کی اس توجہ سے محروم رہا جس کا وہ مستحق تھا۔ دراصل ان کو نظم کے روشن امکانات کا نہ تو اندازہ تھا اور نہ ہی وہ اس کی افادیت و اہمیت سے واقف تھے۔ اگر چہ کئی شعرا کی مثنویات کے کچھ حصّے نظم کی شکل اختیار کر گئے تھے، اس کے علاوہ دکن میں محمّد قلی قطب شاہ اور دہلی میں فائزؔ اور حاتمؔ نے بھی ابتدائی دور میں متعدّد نظمیں لکھی ہیں مگر نظم جدید کا بانی نظیرؔ اکبر آبادی کو ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔

پہلی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد کرنل ہالرائیڈ کی سرپرستی میں مولانا محمّد حسین آزادؔ اور خواجہ الطاف حسین حالیؔ نے جدید نظم کی بنیاد رکھی۔ اُنہوں نے شعر میں سادگی، صفائی، برجستگی، حقیقت بیانی اور مناظرِ قدرت کی تصویر کشی پر زیادہ زور دیا۔ جس کے سبب شعرائے اردو نیچرل شاعری کی طرف متوجّہ ہوئے۔ اگر چہ شمالی ہند میں نظیرؔ اکبر آبادی نے بہت پہلے اس قسم کی نظموں کی شروعات کر کے شاعری کو عام آدمی سے قریب کر دیا تھا۔

02.03 نظیرؔ اکبر آبادی کے حالاتِ زندگی

نظیرؔ اکبر آبادی کا نام شیخ ولی محمّد اور ان کے والد کا نام شیخ محمّد فاروق ہے ان کی تاریخ پیدائش کا اب تک صحیح تعیّن نہیں ہو سکا ہے۔ اب تک کی تحقیقات کی روشنی میں ان کی ولادت ۱۷۳۵ء یا ۱۷۴۰ء کے درمیان تسلیم کی جا سکتی ہے۔ فالج کے شدید حملے سبب ان کی وفات ۱۸۳۰ء میں ہوئی۔

جب احمد شاہ ابدالی نے دہلی پر حملہ کیا تو وہ اپنے خاندان کے ساتھ اکبر آباد یعنی آگرہ میں آ کر محلّہ تاج گنج میں مقیم ہو گئے۔ آگرہ ہی کو اپنا وطن سمجھ کر اپنے تخلّص کے ساتھ اکبر آبادی یعنی نظیرؔ اکبر آبادی لکھنے لگے اور اسی قلمی نام سے دنیائے ادب میں مشہور ہوئے۔

نظیرؔ اکبر آبادی کا تعلّق خاندانِ قریش سے تھا۔ وہ اپنے والدین کی تیرہویں اولاد تھے ان کے بارہ بھائی بہن ان سے پہلے ہی فوت ہو چکے تھے۔ تیرہویں اور آخری اولاد ہونے کے سبب ان کی پرورش نہایت ناز و نعم میں ہوئی۔ نظرِ بد سے بچانے کے لئے ان کے کان میں دُر والی بالیاں اور ناک میں بُلاق پہنا کر ان کی وضع لڑکیوں کی سی بنا دی گئی تھی۔

اپنے عہد کے رواج کے مطابق نظیرؔ نے اردو کے ساتھ فارسی اور عربی کی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ اُنہیں پہلوانی اور فنِ سپہ گری میں بھی کمال حاصل تھا۔ وہ اکھاڑوں کے پہلوانوں سے کُشتیاں بھی لڑا کرتے تھے۔ اُنہیں بچپن ہی سے ورزش کا شوق تھا جسے اُنہوں نے آخری وقت تک ترک نہیں کیا۔ دیوان نظیرؔ اکبر آبادی کے مقدمے میں فرحت اللہ بیگ نے نظیرؔ اکبر آبادی کا حلیہ حسبِ ذیل تحریر کیا ہے:

> ''رنگ گندم گوں، میانہ قد، پیشانی اونچی اور چوڑی، آنکھیں چمک دار اور بینی بلند تھی۔ داڑھی خشخاشی اور مونچھیں بڑی رکھتے تھے..... لباس وہی تھا جو محمد شاہ کے زمانہ دہلی میں رائج تھا، یعنی کھڑکی دار پگڑی، گاڑھے کا انگرکھا، سیدھا پردہ، نیچی چولی، اس کے نیچے کرتا، ایک بَر کا پاجامہ۔ گھتیلی جوتی، ہاتھ میں شام دار چھڑی، اُنگلیوں میں فیروزے اور عقیق کی انگوٹھیاں۔''

نظیرؔ اکبر آبادی کی شادی دہلی کے محمد رحمٰن خاں کی دختر تہورالنّساء کے ساتھ ہوئی تھی۔ جن کے بطن سے دو اولادیں، گلزار علی اور امامی بیگم پیدا ہوئیں۔ نظیرؔ مشرباً شیعہ تھے۔ بڑے عقیدت اور احترام سے تعزیہ داری بھی کرتے تھے۔۔ پچاس روز تک مسلسل مجلسِ عزاء کا اہتمام

کرتے ،مگران کے کلام میں کہیں تعصّب اور تنگ نظری کی جھلک بھی نظر نہیں آتی۔ وہ تمام مذہب کے بزرگوں کا احترام کرتے تھے اوران سے عقیدت بھی رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مذہب کا ماننے والا ان کی قدر کرتا تھا۔ ان کی وفات پر شیعہ اور سنّی دونوں فرقوں کے لوگوں نے اپنے اپنے طریقے پر نمازِ جنازہ ادا کی، جنازے کی چادران کے ہندو شاگرد نے بطورِ تبرک لے لی۔ مسلمانوں نے ان کے سوئم کے روز قرآن خوانی کرائی تو ہندوؤں نے ان کی قبر پر شان دار میلے کا اہتمام کیا۔

نظیرؔ اکبرآبادی ایک صوفی منش شاعر تھے۔ ان کی طبیعت میں بلا کا فقر اور استغناء تھا۔ اُنہوں نے کسی راجہ یا نواب کے دربار سے وابستہ ہونے کی بجائے معلّمی کی تنخواہ پر ہی گزر بسر کرنے کو بہتر سمجھا۔ ان کی شاعری سے متاثّر ہوکر اودھ کے نواب اور بھرت پور کے راجا نے اُنہیں اپنے یہاں مدعو کیا۔ مگر اُنہوں نے وہاں جانے سے انکار کر دیا اور تمام عمر آگرہ ہی میں رہے۔ وہ کچھ دنوں تک متھرا میں قلعہ دار اور مرہٹہ ''بھاؤ'' کے معلّم رہے۔ اس کے بعد نواب محمّد علی خاں کے بچّوں کو پڑھاتے رہے۔ آخر میں سات روپئے ماہ واری کی اجرت پر راجا بلاس رائے کھتری کے بچّوں کو تعلیم دینے لگے اور ایک وقت کا کھانا بھی انھیں کے یہاں کھانے لگے۔

نظیرؔ اکبرآبادی کے شاگردوں میں میر قطب الدّین باطنؔ، (مولّف تذکرۂ گلستانِ بے خزاں المعروف بہ نغمۂ عندلیب) گلزار علی اسیرؔ (پسر نظیرؔ اکبرآبادی)، مہاراجہ بلونت سنگھ راجاؔ، شیخ حسین بخش بخشیؔ، راجہ لالہ بدھ سین صافیؔ، شیخ مداری ضمیرؔ، حکیم میر محمّدی ظاہرؔ، نبی بخش عاشقؔ، بیدار بخش لہرؔ، منشی حسین علی خاں لہجہؔ کے نام نہایت اہم ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱﴾ نظیرؔ اکبرآبادی کی پیدائش کس شہر میں ہوئی تھی؟

﴿۲﴾ نظیرؔ اکبرآبادی کا پورا نام کیا تھا؟

﴿۳﴾ نظیرؔ اکبرآبادی کس پیشے سے وابستہ تھے؟

﴿۴﴾ نظیرؔ اکبرآبادی کی وفات کس سن میں ہوئی؟

02.04 نظیرؔ اکبرآبادی کی ادبی خدمات

نظیرؔ اکبرآبادی اردو کے پہلے ایسے شاعر ہیں جن کی شاعری صحیح معنوں میں زندگی اور اس کے مسائل کی ترجمان ہے۔ ان کی تمام عمر زندگی کے مشاہدوں اور تجربوں میں گزری۔ ان کی نگاہوں نے جو دیکھا اور ان کے دل و ذہن نے جو محسوس کیا اُنہوں نے بے ساختگی، بے تکلّفی اور انتہائی فطری انداز میں اشعار کے پیکر میں ڈھال دیا۔ ان کی شاعری میں برج بھومی کی سوندھی مٹّی کی سوندھی بو اور عوام کے دل کی دھڑکنوں کو صاف طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ وہ ایک زود گو شاعر تھے۔ وارفتہ مزاجی کے سبب ان کے کلام کا ایک بڑا حصّہ ضائع ہو گیا یا دوسروں کی ملکیت بن گیا۔ اُنہوں نے کبھی اپنے کلام کو محفوظ یا مرتّب کرنے کی طرف توجّہ نہ کی۔ ان سے جو شخص فرمائش کرتا اس کی منشاء کے مطابق اسے نظم لکھ کر عنایت کر دیتے اور پھر اس کلام سے بے نیاز ہو جاتے۔ فرمائش پر کلام لکھوانے والوں میں گداگر بھی ہوتے اور قلندر بھی، پھیری کرنے والے بھی ہوتے اور خوانچے والے بھی، چنا جور گرم والے بھی ہوتے اور حلوائی بھی ہوتے، کنجڑے بھی ہوتے اور دیگر پیشہ وران بھی۔

راجہ بلاس رائے کے بیٹوں (ہر بخش رائے، گُر بخش رائے، مؤل چند رائے، نین سکھ رائے، بنسی دھر اور شنکر داس) کی کوششوں سے ان کے کلام کا پہلا کلّیات شائع ہوا تھا۔ جس میں تقریباً سات ہزار اشعار تھے۔ اس کلّیات کے علاوہ ان کے دو اوین انجمن ترقی اردو نے ۱۹۴۲ء میں شائع کیے۔ جن کی ترتیب و تصحیح مرزا فرحت اللہ بیگ نے کی تھی۔ ان کے ایک فارسی دیوان کا بھی پتہ چلتا ہے۔ جس کے نمونے پروفیسر عبدالغفور شہباز کے مرتّب کردہ کلّیات نظیر میں پائے جاتے ہیں مگر اب تک اس دیوان کا سراغ نہیں مل سکا۔

نثر میں بھی نظیر اکبر آبادی نے کئی کتابیں تحریر کی ہیں۔ جن میں سے نو کتابیں فارسی زبان مین ہیں اور ایک کتاب اردو زبان میں ہے جس کا نام ''فہم ترین'' ہے۔ اس کتاب میں آسان اور عام فہم زبان مبتدی طلبا لے لئے رُقعات تحریر کیے ہیں۔ تا کہ وہ خط و کتابت کے اصول سے آگاہ ہوسکیں۔ اُنہوں نے خالقِ باری کی طرز پر ایک منظوم کتابِ لغت بھی لکھی۔

نظیر اکبر آبادی سے قبل اردو کے بیش تر شعرا عام موضوعات پر لکھنے اور عوامی مسائل کی ترجمانی اور تصویر کشی سے گریز کرتے تھے۔ نظیر اُردو کے پہلے ایسے شاعر ہیں جنہوں نے اپنی شاعری کا تانا بانا خالص ہندوستانی عناصر اور عوامی زندگی کے مسائل سے تیّار کیا ہے۔ زندگی کا کوئی ایسا رنگ، روپ اور گوشہ نہیں، جس پر ان کی نظر نہ پڑی ہو، نظیر نے نظم، غزل، مثنوی، قصیدہ، مسدّس، مخمّس، ترجیع بند، مستزاد، رباعی، غرض مختلف اصناف سخن میں بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن ان کا اصل کارنامہ ان کی نظمیں ہی ہیں۔ جن کی بنیاد پر اُنہیں عوامی شاعر اور ان کی شاعری کو عوامیت و جمہوریت کا ترجمان کہا جاتا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۵﴾ نظیر اکبر آبادی کے کلام کا پہلا کلّیات کس کی کوششوں سے شائع ہوا؟

﴿۶﴾ نظیر اکبر آبادی نے منظوم کتابِ لغت کس کی طرز پر لکھی؟

﴿۷﴾ نظیر اکبر آبادی کو کس صنفِ سخن کی بنیاد پر عوامی شاعر کہا جاتا ہے؟

02.05 نظیر اکبر آبادی کی نظم نگاری

نظیر اکبر آبادی سے قبل اور ان کے بعد بھی اردو کے بیش تر شعرا غزل تک ہی محدود تھے۔ البتّہ کچھ شعرا کبھی کبھی مثنویاں بھی کہہ لیتے تھے۔ شاہی درباروں سے وابستہ شعرا شاہوں، نوابوں اور امراء کی شان اور مدح میں قصائد کہہ کر اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔ ادب کا تعلّق عوام سے برائے نام تھا۔ ادب کو دبستانوں تک محدود کر دیا گیا تھا۔ بے لطف مضامین اور فرسودہ خیالات کی نہ صرف بھرمار تھی بلکہ اُنہیں بار بار دُہرایا جانے لگا تھا۔ نظیر اکبر آبادی نے دہلی اور لکھنؤ کے ادبی مراکز سے دور رہ کر وہاں کے شعرا کے رنگِ سخن سے بے نیاز ہو کر اپنی شاعری کی راہ الگ ہموار کی۔ ان کی منفرد طبیعت اور آزاد منشی نے اُنہیں کسی دبستان یا نظریے کا پابند نہ ہونے دیا۔ اُنہوں نے غزل سے زیادہ نظم کی طرف توجہ دی۔ ان کی نظموں میں جو حقیقت اور صداقت، انسان دوستی، وطن پرستی، وسعتِ قلب و ہم آہنگی پائی جاتی ہے، وہ ان سے پہلے کسی شاعر کے یہاں نظر نہیں آتی۔ ان کی شاعری میں ارضیت اور انسان دوستی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ دراصل وہ اردو کے پہلے ایسے شاعر ہیں جنہوں نے عوام کے خیالات و جذبات کی عکّاسی اور نیچرل شاعری کی بنیاد رکھی۔ نظیر نے اپنے گرد و پیش کے ماحول و معاشرت اور حالات و واقعات کو بہت قریب سے دیکھا، برتا اور بھوگا۔ ان کے دل پر جو بیتی اور اُنہوں نے جو محسوس کیا اسے سچّائی، ایمانداری اور سادگی کے

ساتھ نظموں کے پیکر میں ڈھال دیا۔ اُنہوں نے بندھے ٹکے استعاروں اور کنایوں کو ترک کر کے صاف گوئی سے کام لیا۔ اگر چہ نظیر کے یہاں کوئی عمیق فلسفہ یا فن کی گہرائی نہیں مگر ان کی نظموں کے موضوعات متنوع ہیں۔ کلامِ نظیر کے تنوع سے متعلق نیاز فتح پوری رقمطراز ہیں:

''نظیر کا کلّیات ایک ایسا نایاب ذخیرہ ہے کہ زندگی کا کوئی پہلو، معیشت و معاشرت کا کوئی انداز اور احساسات و تاثّرات کا کوئی منظر ایسا نہیں جو اس میں موجود نہ ہو۔ امیر و غریب، شاہ و گدا، زاہد و رند، ہندو، مسلمان، گبر و ترسا.....علاحدہ علاحدہ سب کی دل چسپی کا سامان اس میں موجود ہے۔ اور عالم محسوسات کی شاید ہی کوئی چیز ایسی ہو جس کا ذِکر کسی نہ کسی نہج سے نظیر نے نہ کیا ہو۔ مشاغلِ زندگی، ضروریاتِ انسانی، مظاہرِ تمدّن میں مقطّع اور ہنسوڑ قسم کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جسے نظیر نے چھوڑ دیا۔ اور جس پر پورے اہتمامِ شاعرانہ کے ساتھ قلم نہ اٹھایا ہو۔''

نظیر اپنی نظموں میں حقائق کا ذکر اس انداز سے کرتے ہیں کہ اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ اُنہوں نے اپنی نظموں میں میلوں ٹھیلوں، تماشوں، عرسوں، تیوہاروں وغیرہ کی ایسی عکّاسی کی ہے کہ اس عہد کی معاشرت اور سماجی حالات کا اندازہ بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے۔ آدمی نامہ، فنا نامہ، کلجگ، روٹی نامہ، گوڑی نامہ، اور مفلسی کا شمار ان کی بہترین نظموں میں کیا جاتا ہے۔ بنجارہ نامہ، خواب کا طلسم اور ہنس نامہ علامتی نظمیں ہیں۔ بنجارہ نامہ جس قدر ظاہری اعتبار سے دل چسپ ہے اس سے کہیں زیادہ معنوی اعتبار سے بھی بلند پایہ ہے۔ اُنہوں نے بنجارہ نامہ میں انسان کو بنجارہ اور اس کے سفرِ حیات یعنی زندگی کو بنجارے کی زندگی سے تعبیر کیا ہے۔ ان کی دوسری نظموں کی طرح اس نظم میں بھی زندگی کی ناپائیداری اور دنیا کی بے ثباتی کا ذکر تفصیل سے ہے۔ مگر اندازِ بیان اس قدر دل چسپ اور پُر لطف ہے کہ قاری یا سامع کے ذہن میں فنا کا دل دوز تصوّر بھی نہیں آتا۔ وہ تلخ حقائق کے باوجود یاسیات کا شکار نہیں ہوتا، بلکہ صالح عمل کی طرف متوجّہ ہو جاتا ہے۔ بنجارے کی خانہ بدوشی اور زندگی کی ناپائیداری کی مرقّع کشی کے لئے نظیر نے جن موزوں اور مناسب الفاظ کا استعمال کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ اس نظم کے مصرع ''سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ'' نے ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر لی۔ اس مصرع کے علاوہ نظیر کی دوسری نظموں کے متعدّد مصرعے اور اشعار آج تک ضرب المثل کے طور پر استعمال کیے جا رہے ہیں۔ مثلاً

- ☆ کل جگ نہیں، کر جگ ہے یہ، یاں دن کو دے اور رات لے
- ☆ کیا خوب سودا نقد ہے، اس ہاتھ لے اس ہات دے
- ☆ گوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
- ☆ گوڑی نہیں تو گوڑی کے پھر تین تین ہیں
- ☆ دنیا میں پادشاہ ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
- ☆ پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں
- ☆ اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست
- ☆ عاشق ہے تو دل بر کو ہر اک رنگ میں پہچان
- ☆ آخر کے تئیں ہنس اکیلا ہی سدھارا

نظیر اکبرآبادی کے نزدیک دنیا دارالمکافات ہے جہاں نیکی کا بدلا نیک اور بدی کا بد ہے، نظم ''فقیروں کی صدا'' اور ''کلجگ'' میں بھی ''بنجارہ نامہ'' جیسی کیفیت پائی جاتی ہے اس قسم کی نظموں میں خواہ فقیروں کی صدائیں ہوں یا صوفی سنتوں کے ارشادات یا سبق آموز نصائح سب سے یہی درس ملتا ہے کہ انسان کو مایوس یا ناامید ہونے کی بجائے جینے کے سلیقے کے ساتھ سفرِ آخرت کی تیّاری میں لگ جانا چاہیے۔ نظم ''کلجگ'' کا اندازِ بیان واعظانہ اور ناصحانہ ہے۔ ''فقیروں کی صدا'' کے مخصوص آہنگ میں قلندرانہ لہجے اور الفاظ کے انتخاب و ترتیب نے مضمون کی اثر آفرینی کو دوبالا کر دیا ہے۔ اس نظم کے پہلے بند میں وہ کہتے ہیں: ؎

بَٹ مارا اجل کا آپہونچا، ٹُک اس کو دیکھ ڈرو بابا اب اشک بہاؤ آنکھوں سے اور آہیں سرد بھرو بابا
دل ہاتھ اٹھا اس جینے سے، لے بس من مار مرو بابا جب باپ کی خاطر روتے تھے اب اپنی خاطر رو بابا
تن سوکھا کُبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا، چلنے کی فکر کرو بابا

نظیر اکبرآبادی نے آج سے پہلے اُن موضوعات پر کثیر تعداد میں نظمیں کہی ہیں جن موضوعات کی طرف عہدِ حاضر کے شعرا بھی پوری طرح متوجّہ نہیں ہو سکے۔ روپیہ، پیسہ، کوڑی، تِل کے لڈّو، آندھی، تربوز، آگرے کی ککڑی،، کورا برتن، اندھیری رات، اومس، بڑھاپے کی تعلّیاں، آٹے دال کا بھوؤ، چپاتی وغیرہ ان کی ایسی نظمیں ہیں جن کا تعلّق براہِ راست عوام اور عوامی مسائل سے ہے۔ اگر نظیر اکبرآبادی عام انسانوں کے درمیان نہ رہتے تھے۔ ان کے دکھ درد میں شریک نہ ہوتے، ان کے جذبات و احساسات کو محسوس نہ کرتے تو وہ عوام کے شاعر بھی نہ ہوتے۔ اُنہیں ان کی ایسی نظموں ہی کی وجہ سے عوامی شاعر کہا جاتا ہے۔ نظیر کی بیش تر نظمیں صبر و قناعت کا درس دیتی ہیں، مگر وہ زندگی کی بنیادی ضرورت کو خالص مادی نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے۔ خالی پیٹ، زندگی کے بوجھ کو بہت دنوں تک نہیں اٹھایا جا سکتا۔ شاہ ہوں یا گدا، صوفی ہوں یا مرتاض سب کی بنیادی ضرورت روٹی ہے۔ پیٹ میں روٹیاں نہ ہوں تو معرفتِ نفس اور معرفتِ حق کی طرف بھی طبیعت کا رجوع ہونا محال ہوتا ہے۔

پوچھا کسی نے یہ کسی کامل فقیر سے یہ مہر و ماہ حق نے بنائے ہیں کاہے کے
وہ سن کے بولا بابا، خدا تجھ کو خیر دے ہم تو نہ چاند سمجھیں، نہ سورج ہیں جانتے
بابا ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

میتھیو آرنلڈ نے شاعری کو تنقیدِ حیات کہا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے نظیر اکبرآبادی کی شاعری زندگی اور اس کے نشیب و فراز سے پوری طرح ہم آہنگ نظر آتی ہے۔ اُنہوں نے عوامی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا نہایت باریک بینی سے مطالعہ اور مشاہدہ کیا ہے۔ وہ جس چیز کا ذِکر کرتے ہیں اس سے متعلّق تمام جزئیات کا بیان اس طرح کرتے چلے جاتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سارے مناظر اور ساری اشیاء وہی ہیں جن سے ہم بخوبی واقف ہیں اور آئے دن ان سے دوچار بھی ہوتے رہتے ہیں، مگر ہم ان سب کی طرف کوئی خاص توجّہ نہیں دیتے۔

خواب کا طلسم، چاندنی، دید بازی، اشتیاقِ دید، بہا، طلسم وصال، شبِ عیش، جیسی نظموں کا رنگ عاشقانہ ہے۔ اگر ان کی اس قسم کی نظموں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اُنہوں نے لطافت و رنگینی کے پیرائے میں دنیا کی بے ثباتی کو مصورانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ نظم ''خواب کا طلسم'' میں عیش و عشرت کے مزے لوٹنے کے بعد وہ کہتے ہیں:

ایدھر تو جوشِ عشق، اُدھر حسن اور جنوں ناز وادا کی آ کے لگی ہونے ڈھپ ڈھپوں
ان عشرتوں میں آہ نصیبوں کو کیا کہوں چاہا میں اس پَری سے جو کچھ اور کچھ کہوں
اتنے میں ہائے یار مری آنکھ کھل پڑی

نظیر اکبرآبادی نے ظرافت اور مزاح کے پیرائے میں بھی زندگی کی حقیقتوں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ان کی کئی نظمیں ظرافت ومزاح کا بہترین نمونہ ہیں۔ان کے یہاں اگرچہ فن کی گہرائی اور گیرائی نہیں پھر بھی وہ معاشرتی حالات وواقعات اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔وہ کبھی کبھی واقعیت پسندی کی رو میں متانت وسنجیدہ ظرافت کی حد سے باہر نکل جاتے ہیں، مگر ان کا مقصد پھکّڑ پن نہیں۔ان کی اس قسم کی نظموں میں چوہوں کا اچار، حسنِ طلب، طفلی، لطفِ شباب وغیرہ قابلِ ذِکر ہیں نظم ''طفلی'' کے ایک بند میں وہ کہتے ہیں۔

دل میں کسی کے ہرگز نے شرم، نے حیا ہے آگا بھی کھل رہا ہے، پیچھا بھی کھل رہا ہے
پہنے پھرے تو کیا ہے، ننگے پھرے تو کیا ہے یاں یوں بھی واہ واہے اور ووں بھی واہ واہے
کچھ کھالے اس طرح سے، کچھ اُس طرح سے کھالے
کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے

نظیر اکبرآبادی کو زبان وبیان پر قدرت حاصل ہے۔اُنہوں نے اپنے خیالات اور نظموں کے موضوعات کے مطابق زبان اور لہجہ کو اپنایا ہے۔چون کہ ان کی شاعری کا بیش تر حصّہ عوامی زندگی، عوامی مسائل، مقامی تیج تیوہاروں اور تقریبات سے متعلّق ہے اس لئے اُنہوں نے اسی زبان کو اپنی نظموں میں استعمال کیا جو عوام میں رائج تھی۔ان کے یہاں موضوع کے اعتبار سے مقامی بولیوں کے الفاظ کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں۔نظیر نے شعوری طور پر عربی، فارسی اور سنسکرت کے دقیق اور مشکل الفاظ سے گریز کیا ہے۔چون کہ ان کا تعلّق سماج کے ہر طبقے سے تھا اور اُنہوں نے ہر طبقے کے لئے شاعری کی ہے۔جس میں اعلیٰ طبقے کے افراد بھی ہیں اور ادنیٰ بھی۔شرفاء بھی ہیں اور اوباش بھی خاندانی بھی ہیں اور بازاری بھی، یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں کہیں کہیں ابتذال اور سوقیانہ پن بھی پایا جاتا ہے۔نظیر کو مروّجہ زبان، روز مرّہ، محاوروں اور ضرب الامثال کے استعمال پر قدرت حاصل ہے۔ان کی کوئی نظم ایسی نہیں ہے جس میں محاوروں کا استعمال نہ ہوا ہو۔نظیر کے فن اور زبان وبیان کی سب سے پہلے تعریف کرنے والا ایک غیر ملکی محقّق فیلن ہے جس نے اپنی ہندوستانی انگریزی ڈکشنری کے دیباچے میں تحریر کیا ہے:

> ''صرف یہی ایک شاعر (نظیر اکبرآبادی) ہے جس کی شاعری اہلِ فرنگ کے نصاب کے مطابق سچّی شاعری ہے مگر ہندوستان کی لفظ پرستی اس کو سرے سے شاعری ہی تسلیم نہیں کرتی۔صرف نظیر ہی ایسا شاعر ہے جس کے اشعار نے عام لوگوں کے دل میں راہ کی۔اس کے اشعار ہر سڑک اور ہر گلی میں پڑھے اور گائے جاتے ہیں۔خصوصاً اس کے شہر آگرے میں۔اس کی نظمیں آپ اس کی سوانح عمری ہیں، کیوں کہ قالبِ نظم میں یہ شخص اپنی تمام ذاتی خصوصیتوں کے ساتھ جیتا، جاگتا نظر آتا ہے.....اس کی طبیعت کی رنگارنگی اس کے

تخیّل کی قوّت علاوہ بریں اس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ اس نے ایک ہی چیز کی مختلف نظموں میں مختلف پہلوؤں سے مختلف تصویریں دکھائی ہیں۔ اُس کا دیوان خاصا تصویروں کا دیوان ہے۔ جس میں ہندوستان کے رہنے والوں کے کھیل تماشے، عیش، تفریح، رنج وغم، دل و دماغ، سب کی بولتی چالتی تصویریں نظر آ سکتی ہیں۔''

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۸﴾ نظیر اکبر آبادی سے قبل اردو کے بیش تر شعرا کن اصناف تک محدود تھے؟

﴿۹﴾ نظیر اکبر آبادی کو کس صنف کی بدولت شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی؟

﴿۱۰﴾ نظیر اکبر آبادی کی شاعری میں کس موضوع کو مرکزیت حاصل ہے؟

﴿۱۱﴾ نظیر اکبر آبادی کی پانچ نظموں کے نام لکھیے!

02.06 نظم ''ہنس نامہ'' کا متن

دنیا کی جو اُلفت کا ہوا مجھ کو سہارا اور اُس نے خوشی کو مِری خاطر میں اُتارا
دیکھی جو یہ غفلت تو مِرا دِل یہ پکارا آیا تھا کسی شہر سے اک ہنس بچارا
اک پیڑ پہ جنگل کے ہوا اُس کا گزارا

☆

چنڈول، اگن، ابلقے، جھپّان، بنے ڈھیّر مینا و بئے، کِلکِلے، بگلے، بھی سمنبر
طوطے بھی کئی طور کے ٹوئیاں کوئی لہبر رہتے تھے بہت جانور اس پیڑ کے اُوپر
اُس نے بھی کسی شاخ پہ گھر اپنا سنوارا

☆

بلبل نے کیا اس کی محبّت میں خوش آہنگ اور کوکلے کویل نے بھی اُلفت کو لیا سنگ
کھنجن میں کُلنگوں میں بھی چاہت کی مچی جنگ دیکھا جو طیوروں نے اُسے حُسن میں خوش رنگ
وہ ہنس لگا سب کی نگاہوں میں پیارا

☆

سیمرغ بھی سَو دِل سے ہوئے ملنے کے شائق گڈھ پنکھ بھی پنکھوں کے ہوئے جھلنے کے لائق
سارَس بھی حواصل بھی ہوئے اُس کے موافق بازو لگڑ و جُرّہ و شاہیں ہوئے عاشق
شِکروں نے بھی شکّر سے کیا اس کا مدارا

☆

کچھ سبزک و بڑ نکّے و کچھ مٹّن و بزّے پنڈخی سے لگا ٹوٹر و قمری و ہریوے
غوغائی ، بگیری و لٹورے و پیپہے کچھ لال چڑے، پودنے، پدّے ہی نہ غش تھے
پدڑی بھی سمجھتی تھی اُسے آنکھ کا تارا

☆

چاہت کے گرفتار بٹیریں ، لوے ، تیتر کبکوں کے تدروں کے بھی چاہت میں بندھے پر
ہُد ہُد بھی ہوئے ہَٹ کے بڈھیّا ادھر اُدھر زاغ و زغن و طوطی و طاؤس ، کبوتر
سب کرنے لگے اس کی محبّت کا اشارا

☆

شکل اُس کی وہیں جی میں کھبی شام چڑے کے دی چاہ جتا پھر اسے جھانپو نے بھی جھپ سے
ہَریل بھی ہوئے اس کے بڑے چاہنے والے جتنے غرض اس پیڑ پہ رہتے تھے پرندے
اُس ہنس پر ان سب نے دل و جان کو وارا

☆

خواہش یہ ہوئی سب کی کہ ہر دَم اُسے دیکھیں اور اُس کی محبّت سے ذرا منھ کو نہ پھیریں
دن رات اُسے خوش رکھیں ،نت سکھ اسے دیویں صحبت جو ہوئی ہنس کی ان جانوروں میں
یک چند رہا خوب محبت کا گزارا

☆

سب ہوکے خوش اس کی مئے الفت لگے پینے اور پیت سے ہر ایک نے واں بھر لیے سینے
ہر آن جتانے لگے چاہت کے قرینے اس ہنس کو جب ہوگئے دو چار مہینے
اک روز وہ یاروں کی طرف دیکھ پکارا

☆

یاں لطف و کرم تم نے کیے ہم پہ ہیں جو جو تم سب کی یہ خوبی کہاں ہم سے بیاں ہو
تقصیر کوئی ہم سے ہوئی ہو وے تو بخشو لو یارو ! اب ہم جاویں گے کل اپنے وطن کو
اب تم کو مبارک رہے یہ پیڑ تمہارا

☆

اب تک تو بہت ہم رہے فرصت سے ہم آغوش اب یادِ وطن دل کی ہمارے ہوئی ہمدوش
جب حرف جدائی کا پرندوں نے کیا گوش اس بات کے سنتے ہی جو، ہر اِک کے اُڑے ہوش
سب بولے یہ فرقت تو نہیں ہم کو گوارا

☆

بِن دیکھے تمہارے ہمیں کب چین پڑیں گے اک آن نہ دیکھیں گے تو دل غم سے بھریں گے
گر تم نے یہ ٹھیرائی تو کیا سکھ سے رہیں گے ہم جتنے ہیں سب ساتھ تمہارے ہی چلیں گے
یہ درد تو اب ہم سے نہ جاوے گا سہارا

☆

پھر ہنس نے یہ بات کہی ان سے کئی بار کچھ بس نہیں اب چلنے کی ساعت سے ہیں ناچار
آنکھیں ہوئیں اشکوں سے پرندوں کے گہر بار اس میں جو شب کوچ کی ہوئی صبح نمودار
پر اپنا ہوا پر وہیں اس ہنس نے مارا

☆

وہ ہنس جب اس پیڑ سے واں کو چلا ناگاہ منھ پھر کے ایدھر سے وطن کی جو ہیں لی راہ
دیکھا جو اُسے جاتے ہوئے واں سے تو کر آہ سب ساتھ چلے اس کے وہ ہمراز ہَوا خواہ
ہرایک نے اُڑنے لے لئے پنکھ پسارا

☆

اور ہنس کی اُن سب کو رفاقت ہوئی غالب جب واں سے چلا وہ تو ہوئی بے بسی غالب
کُلفت تھی جوفرقت کی وہ سب پر ہوئی غالب دو کوس اُڑے تھے جو ہوئی ماندگی غالب
پھر پر میں کسی کے نہ رہا قوت یارا

☆

پَر ان کے ہوئے تر جو ہیں، دُوری کی پڑی اُوس روئے کہ رفاقت کی کریں کیوں کہ قدم بوس
تھک تھک کے لگے گرنے تو کرنے لگے افسوس کوئی تین ، کوئی چار ، کوئی پانچ اڑا کوس
کوئی آٹھ ، کوئی نو ، کوئی دَس کوس میں ہارا

☆

کچھ بن نہ سکے ان سے رفیقی کہ جو واں کار اور اتنے اُڑے ساتھ کہ کچھ ہووے نہ اظہار
جب دیکھی وہ مشکل تو پھر آخر کہ تئیں ہار کوئی یاں رہا ، کوئی واں رہا ، کوئی ہو گیا ناچار
کوئی اور اڑا آگے جو تھا سب میں کَرارا

☆

تھی اس کی محبت میں جو ہر ایک نے پی مَے سمجھے تھے بہت دل میں وہ الفت کو بڑی شے
جب ہو گئے بے بس تو پھر آخر یہ ہوئی رے چیلیں رہیں، کوّے گرے اور باز بھی تھک کے
اس پہلی ہی منزل میں کیا سب نے کنارا

☆

دنیا کی جو الفت ہے تو اُس کی ہے یہ کچھ راہ جب شکل یہ ہووے تو بھلا کیوں کہ ہو نِر باہ
ناچاری ہو جس جا میں تو واں کیجیے کیا چاہ سب رہ گئے جو ساتھ کے ساتھی تھے نظیرؔ آہ
آخر کے تئیں ہنس اکیلا ہی سدھارا

02.07 نظم ''ہنس نامہ'' کا تجزیہ

''ہنس نامہ'' نظیرؔ اکبرآبادی کی ایک مشہور علامتی نظم ہے۔ جسے ہم حکیمانہ یا ایلیگری بھی کہہ سکتے ہیں۔اس نظم میں اُنہوں نے حکایتی اور مصوّرانہ انداز میں انسان کی عارضی زندگی اور کارخانۂ قدرت کے رواں دواں رہنے کا ذِکر کیا ہے۔ہنس کی حکایت بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ ایک ہنس کسی شہر سے اڑتا ہوا آیا اور اس نے جنگل کے ایک درخت کی شاخ پر اپنا گھر بنالیا اس درخت کی شاخوں ہر پہلے ہی مختلف قسم کے بہت سے پرندے رہتے تھے۔جن میں سے کچھ کے نام، پنڈول، مینا، بیا، بگلا، طوطا، ٹوئیاں، بلبل، کھنجن، گڑ پنکھ، شکرا، باز، شاہین، قمری، پیپہا، پودنا، پڑری، بٹیر، ہُد ہُد، طاؤس، کبوتر، زاغ، زغن، شام چڑی ہیں، اس درخت پر رہنے والے کچھ پرندے اسے دیکھتے ہی اس سے پیار کرنے لگے۔کچھ چند روز میں اس ہنس سے گھل مل گئے۔رفتہ رفتہ ہنس ان سب سے اور وہ سب ہنس کی انسیت ومحبّت میں گرفتار ہوگئے، گہرے مراسم اور تعلّقات کے سبب اب وہ یہ تصوّر بھی نہیں کر سکتے تھے کہ اُنہیں ایک روز ہنس کی مفارقت بھی برداشت کرنا پڑے گی۔ مگر قانونِ قدرت سے کسی کو نجات حاصل نہیں۔کچھ عرصے تک سب کے دن ہنسی خوشی سے گزرتے رہے اور پھر وہ دن بھی آ گیا۔جب اس درخت کو خیر باد کہہ کر ہنس کو اپنے وطن جانے کے لئے مجبور ہونا پڑا۔ پہلے تو پرندوں کو یہ یقین ہی نہیں ہوا کہ ہنس ان سے جدا ہو رہا ہے۔لیکن جب اُنہیں یقین ہو گیا کہ ہنس کی مفارقت کے بغیر کوئی چارہ نہیں تو ان میں سے ہر ایک پرندہ اس کے ساتھ چلنے لے لئے تیّار ہو گیا۔اپنی اپنی بساط، طاقت، ہمّت، اور حوصلہ کے مطابق سب اس کے ساتھ اڑ چلے۔کچھ تو تھوڑی دوٗر ہی اڑ کر تھک گئے اور اُنہوں نے اپنے پَر سمیٹ لیے، کچھ طیور جو بہت طاقتور تھے یا جنہیں ہنس سے بہت زیادہ الفت ومحبّت تھی، اُنہوں نے کافی دور تک اس کا ساتھ دینے کی کوشش کی۔دورانِ سفر ایک مقام ایسا بھی آیا جہاں وہ بھی حالات سے مجبور ہو گئے۔بلا آخر ہنس تنہا رہ گیا۔اور وہ اپنے وطن کو اکیلا ہی سدھارا۔

نظیرؔ نے اپنی اس نظم کے ذریعے انسانی زندگی کی بے ثباتی اور دنیا کے لگاؤ کو ایک حکیمانہ انداز میں پیش کیا ہے۔انسان اس دنیا میں تنہا اور خالی ہاتھ آتا ہے اور ایک دن تنہا خالی ہاتھ واپس بھی جاتا ہے۔صرف اس کے نیک و بد اعمال ہی اس کے ساتھ رہ جاتے ہیں۔اس کا حسنِ سلوک اور اس کی یادیں باقی رہ جاتی ہیں۔جب وہ دنیا میں آتا ہے تو اس کے متعلّقین خوشیاں مناتے ہیں، اس کی چاہت کا اظہار کرتے ہیں اور بعض اس کے لئے اپنی جان بھی نثار کرنے کے لئے تیّار رہتے ہیں۔مختلف لوگوں سے تعلّقات بھی مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔اس کے

عزیز و اقارب، یار دوست اور دوسرے متعلّقین اپنے اپنے طور پر اس سے اظہارِ محبّت کرتے ہیں لیکن جب وہ اس دارِ فانی سے رخصت ہوتا ہے تو اس کے تمام ہم دَرد، رفیق اور ساتھی ایک ایک کر کے چھوٹ جاتے ہیں۔ وہ تمام کوششوں کے باوجود نہ اسے روک سکتے ہیں اور نہ ہی اس کا ساتھ دے سکتے ہیں۔

اس نظم میں نظیؔر نے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ انسان کو دنیا داری اور عارضی چیزوں میں اس قدر مبتلا نہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنی حقیقت اور حیثیت ہی بھول جائے۔ اسے چاہیے کہ زندگی کو حسنِ سلوک اور سلیقہ سے گزارنے اور آخرت کے لئے نیک وصالح اعمال کا توشہ بھی جمع کرتا رہے۔ اس نظم میں نظیؔر اکبرآبادی نے ایک ساتھ اتنے پرندوں کو اکٹھا کر دیا ہے کہ اس کی مثال اردو میں تو کیا دوسری زبان کی شاعری میں بھی ملنا محال ہے۔

نظیؔر کی اس نظم میں پیڑ دنیا کی اور پرندے انسانوں کی علامت ہیں۔ مختلف قسم یا بھانت بھانت کے طیور مختلف مزاج، ہیئت، طبائع، خیالات اور مختلف قسم کے انسانوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ انسانوں کی طرح ہر طائر کی اہلیت وحیثیت ایک دوسرے سے جداگانہ ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے تمام عزیز و اقارب، رشتہ داروں اور ہم دَردوں کی حیثیت ایک دوسرے سے جداگانہ ہوتی ہے۔ وہ کسی سے اپنی اوقات، بساط اور تعلّقات کے اعتبار سے انسیت ومحبت کرتے ہیں۔ تمثیل کے پیرائے میں نظیؔر نے ہر پرندے کی حیثیت کے مطابق ہنس سے وابستگی کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً بلبل جس کی آواز شیریں ہوتی ہے وہ خوش الحانی سے ہنس کی تعریف کرتا ہے۔ کھنجن اور کلنگ جیسے پرندے چنگ بجا کر اس کا استقبال کرتے ہیں۔ اور اس کا دل بہلاتے ہیں۔ سیمرغ جیسا پُر احتشام اور عالی حوصلہ طائر ہنس سے ملاقات کرنے کا خواہاں ہے۔ جس سے ہنس کی عظمت اور شان کا پتہ چلتا ہے۔ گڑ پنکھ چوں کہ قوی جسم کا مالک ہوتے ہوئے بھی ادنیٰ قسم کا پرند ہے۔ اس لئے وہ پنکھا جھل کر ہی ہنس کی خدمت کرنے کو سعادت سمجھتا ہے۔ غرض کہ ہر طائر اپنی حیثیت کے مطابق اس ہنس کی خدمت کرتا ہے اور اس سے اپنی محبّت کا ظہار کرتا ہے۔ نظم کے دسویں بند سے درخت کی فضا میں مایوسیت چھانے لگتی ہے۔ صبح صحیح سلامت، شامِ غم میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ہنس کی مفارقت سے ہر پرندے کے ذہن ودل پر رقّت ویاس طاری ہے۔ سب مجبوری و بے بسی کے عالم میں سوچنے لگتے ہیں۔ کہ ''موت سے کس کو رستگاری ہے۔ آج وہ کل ہماری باری ہے۔'' مختصر یہ کہ وہی پُر حسرت سماں اور وہی رقّت آمیز کیفیت ہر طائر کی ہے جو کسی قریبی شخص کی وفات کے وقت اس کے اعزّ واقارب کی ہوتی ہے۔

اظہار محبت کے لئے شِکرے کی مناسبت سے شکّر، جھانپو کی مناسبت سے جھپ، ہَریل کی مناسبت سے ہَری اور گڑھ پنکھ کی مناسبت سے پنکھ کا استعمال نظیؔر کے زبان داں ہونے کا ثبوت ہے۔ نظیؔر کی دوسری نظموں کی طرح اس نظم میں بھی اُنہوں نے موقع اور محل کی مناسبت سے محاوروں کا استعمال کیا ہے۔ مثلاً خاطر میں اتارنا، آنکھ کا تارا، غش ہونا، پر بندھنا، جی کھونا، منھ کو پھیرنا، ہوش اڑنا، چین پڑنا، پَر مارنا، راہ لینا، اوس پڑنا، کنارہ کرنا وغیرہ۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱۲﴾ نظم ''ہنس نامہ'' میں پیڑ اور جانور یعنی طیور کس کی علامت ہیں؟

﴿۱۳﴾ ''ہنس نامہ'' میں استعمال کیے گئے پانچ پرندوں کے نام لکھئے۔

02.08 خلاصہ

نظیرؔ اکبرآبادی کا نام شیخ ولی محمّد اور تخلّص نظیرؔ تھا۔ان کی تاریخ پیدائش کا اب تک صحیح تعیّن نہیں ہوسکا ہے۔قیاس کیا جاتا ہے کہ ان کی ولادت ۱۷۳۵ء اور ۱۷۴۰ء کے درمیان دہلی میں اور وفات ۱۸۳۰ء میں آگرہ میں ہوئی۔اُنہیں شاعری کے علاوہ پہلوانی اور سپہ گری کا بھی شوق تھا۔قیاس کیا جاتا ہے کہ ان کا بہت سا کلام ضائع ہوگیا۔وارفتہ مزاجی کے سبب اُنہوں نے کبھی اپنے کلام کو جمع کرنے کی طرف توجّہ نہ دی۔وہ لوگوں کی فرمائش پر کلام لکھتے تھے اور اُنہیں سپرد کرنے کے بعد اپنے کلام سے بے نیاز ہوجاتے تھے۔ان کا پہلا کلّیات راجا بلاس رائے کے لڑکوں کی کوشش سے منظرِ عام پر آیا۔اس کے بعد مرزا فرحت اللہ بیگ نے ان کے دو دیوان مرتّب کیے۔نظیرؔ زندگی بھر معلّمی کے پیشے سے وابستہ رہے۔ان کی شاعری سے متاثّر ہوکر اودھ کے نواب اور بھرت پور کے راجا نے اُنہیں اپنے درباروں میں مدعو کیا لیکن اُنہوں نے آگرہ کو چھوڑنا کوارہ نہ کیا اور زندگی بھر آگرہ ہی میں رہے۔آزاد منشی اور طبیعت کی انفرادیت نے اُنہیں شاعری کے کسی دبستان کا پابند نہ ہونے دیا۔ اُنہوں نے اس دور کے شعرا کے رنگِ سخن سے بے نیاز ہوکر اپنی شاعری کی الگ راہ نکالی اور غزلوں سے زیادہ نظم کی طرف توجّہ دی ان کی شاعری زندگی اور اس کے نشیب وفراز سے پوری طرح ہم آہنگ نظر آتی ہے۔ان کے یہاں ارضیت اور انسان دوستی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے ان کی نظمیں حقیقت وصداقت اور وسعتِ قلب وہم آہنگی کی ترجمان ہیں۔اُنہوں نے اپنے گردوپیش کے واقعات اور ماحول کو نہایت سچّائی اور سادگی کے ساتھ اشعار کے پیکر میں ڈھال دیا ہے۔نظیرؔ مذہباً اور مشرباً شیعہ تھے مگر ان کے کلام میں کہیں تعصّب یا تنگ نظری نظر نہیں پائی جاتی۔ان کی نظمیں زندگی کے ہر روپ اور ہر رنگ کی ترجمان ہیں۔اُنہوں نے اخلاقی اور سماجی موضوعات پر متعدّد نظمیں لکھی ہیں۔ ہندوں اور مسلمانوں کے تیوہاروں کی عکاسی بھی کی ہے۔اور مختلف مذاہب کے بزرگوں کی دل کھول کر مدح بھی کی ہے۔نظیرؔ کو خیالات و موضوعات کے مطابق زبان پر قدرت حاصل ہے۔اُنہوں نے اپنی شاعری کے لئے اسی زبان کو اپنایا ہے جو اس وقت عوام میں رائج تھی۔

02.09 فرہنگ

آنکھ کا تارا : بہت پیارا، نہایت عزیز

اَبَلقا : ایک خوش آواز پرندہ، جس کا قد مینا کے برابر ہوتا ہے

اوس پڑ جانا : خوش نہ رہنا، کام بگڑ جانا، خلل پڑنا

بخشو : معاف کرو، درگزر کرو

بُزّہ : ایک قسم کی چڑیا، جسے برجھا بھی کہتے ہیں

بڑنگا : ایک قسم کا پرندہ، جس کی ناک بڑی ہوتی ہے

بگیری : گوریّا سے مشابہ ایک قسم کی خاکی رنگ کی چڑیا، جو تالابوں کے آس پاس رہتی ہے

بے بس ہونا : مجبور ہونا، ناچار ہونا، عاجز ہونا

طیور : طَیر کی جمع، پرندے

غَش : مبہوت، فِدا

غوغائی : ایک قسم کا پرند جسے دومنی بھی کہتے ہیں، یہ پرند پپیہا نامی پرندے سے مشابہ ہوتا ہے

قمری : فاختہ کی قسم کا ایک پرند، جس کا رنگ سفید ہوتا ہے اور گردن میں طوق دار دھاری ہوتی ہے

کچھ بن نہ سکنا : کوئی تدبیر کارگر نہ ہونا، مجبور ہونا

کرارا : طاقتور، زوردار

کُلفت : رنج، غم

کِلکِلا : ایک قسم کی چڑیا جو اکثر مچھلی کھاتی ہے

پِدّا : ایک قسم کی چھوٹی چڑیا جسے پھُدک بھی کہتے ہیں

پِدڑی : ایک قسم کی چڑیا جو بیانا می چڑیا سے چھوٹی اور کئی رنگوں کی ہوتی ہے

پِسارا : پھیلایا، کھولا

پنڈخی : کبوتر کی قسم کا ایک پرندہ، جو سرخی مائل، بھورے رنگ کا ہوتا ہے

پودنا : ایک پرند کا نام، اس کا رنگ بھورا ہوتا ہے لیکن موسم کے مطابق رنگ بدلتا رہتا ہے

پیت : محبّت، چاہت

تقصیر : خطا، قصور

ٹوٹرؤ : ایک قسم کا پرند جو فاختہ سے چھوٹا ہوتا ہے۔ چھوٹی پنڈخی

جُرّہ : ایک شکاری پرندہ کا نام، جس کا رنگ مٹ میلا ہوتا ہے اور یہ اڑتی ہوئی چڑیوں کو جھپٹ کر پکڑ لیتا ہے

جھانپو : ایک قسم کا پرندہ، جسے مولا بھی کہتے ہیں۔ یہ پرندہ کئی رنگ اور مختلف قسم کا ہوتا ہے

جھپ سے : فوراً، بلاتوقّف

چاہ : محبّت، انسیت، الفت

چَنڈول : ایک قسم کی خاکی رنگ کی چڑیا، اس کی آواز سُریلی ہوتی ہے

چَنگ : ایک قسم کا باجا، جو ستار سے مشابہ ہوتا ہے

حواصل : ایک قسم کا سفید آبی پرندہ، جس کا پوٹا بڑا اور آگے کی طرف لٹکا ہوا ہوتا ہے

کوس : فاصلہ کی ایک حدِ معیّنہ کا نام

کوکلا : فاختہ کی قسم کا ایک پرند، جس کی گردن میں طوق کی سی دھاریاں ہوتی ہیں۔

کھُبی : پسند آئی

کھنجن : ایک قسم کا پرند، جس کی چونچ لال اور دُم ہلکی کالی بھائیں لیے ہوئے سفید ہوتی ہے۔

گِرڈھ پنکھ : ایک قسم کا پرند، جس کے بال لمبے ہوتے ہیں

گوش کرنا : سننا، سماعت کرنا

لٹُورا : ایک قسم کا تقریباً دس اِنچ لمبا پرند، جس کی گردن اور منھ کالا، ڈینے نیلے اور دُم کالی ہوتی ہے

لگّڑ : ایک قسم کا بڑا باز، جو عموماً چھوٹے پرندوں کا شکار کرتا ہے

لَوا : تیتر کی قسم کا ایک پرند جو تیتر سے بہت چھوٹا ہوتا ہے

لَہبَر : ایک قسم کا لمبا طوطا، جس کی گردن بھی لمبی ہوتی ہے

مُدارا : خاطر، تواضع

منھ پھیرنا : شریکِ حال نہ رہنا، ساتھ چھوڑنا، بے مروّتی کرنا

ناچاری : عاجزی، بے چارگی، بے بسی

نَت : ہمیشہ، دائم

نِباہ : نباہ، گزارہ

ہارا : تھک گیا، کمزور ہوگیا، عاجز ہوگیا

شاداں رکھنا : خوش رکھنا

راہ لینا : رخصت ہونا، روانہ ہونا

رَے : حالت، کیفیت

سَبزَک : ایک قسم کا پرند جس کا کنٹھ اور ڈینے نیلے ہوتے ہیں، اس لئے اسے نیل کنٹھ بھی کہتے ہیں

سِدھارا : رخصت ہوا، روانہ ہوا

سَمَنبَر : سفید، اجلا

سَو دل سے : نہایت خوشی سے، نہایت شوق سے

سِیمُرغ : ایک قسم کا پرند، جسے عُنقا بھی کہتے ہیں

شام چڑی : ایک قسم کا پرند جسے شیاما بھی کہتے ہیں، اس کا رنگ کالا اور پیر پیلے ہوتے ہیں

ہُدہُد : ایک پرند کا نام، جسے کَٹھ پھوڑا اور مرغِ سلیماں بھی کہتے ہیں۔ اس کے سر پر تاج نُما چوٹی ہوتی ہے۔

ہَری : بہبودی، بھلائی

ہَریَل : کبوتر کی قسم کا ایک پرند جو کبوتر سے چھوٹا ہوتا ہے۔ اس کا رنگ سرخ یا ہلکا کالا ہوتا ہے۔

ہَریوہ : سبز رنگ کی ایک چڑیا، جسے ہَری بلبل بھی کہتے ہیں، اس کی چونچ کالی، پیر زرد اور لمبائی تقریباً پندرہ انگُشت ہوتی ہے۔

ہم آغوش رہنا : باہم ملنا، گلے لگنا، بغل گیر ہونا، صحبت میں رہنا

یارا : طاقت، توانائی

02.10 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درجِ ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : نظیر اکبرآبادی کی مختصر سوانح لکھئے

سوال نمبر۲ : نظیر اکبرآبادی کی ادبی خدمات پر ایک نوٹ تحریر کیجیے۔

سوال نمبر۳ : نظیر اکبرآبادی کی شاعری کے بارے میں اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : نظم ''ہنس نامہ'' کی خصوصیات تحریر کیجیے۔

سوال نمبر۲ : نظیر اکبرآبادی کی نظم نگاری پر ایک تفصیلی مضمون قلم بند کیجیے

سوال نمبر۳ : نظیر اکبرآبادی کی عوامی شاعری پر ایک مضمون قلم بند کیجیے۔

02.11 حوالہ جاتی کتب

۱۔ روحِ نظیر از سیّد محمود رِضوی مخمور اکبرآبادی

۲۔ زندگانیِ بے نظیر از سیّد محمد عبدالغفور شہباز

۳۔ فرہنگِ نظیر از ڈاکٹر شریف احمد قریشی

۴۔ نظیر نامہ از شمس الحق عثمانی

02.12 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ نظیرؔ اکبر آبادی کی پیدائش دہلی میں ہوئی تھی۔

﴿۲﴾ نظیرؔ اکبر آبادی کا پورا نام شیخ وَلی محمّد تھا۔

﴿۳﴾ نظیرؔ اکبر آبادی معلّمی کے پیشے سے وابستہ تھے۔

﴿۴﴾ نظیرؔ اکبر آبادی کی وفات ۱۸۳۰ء میں ہوئی۔

﴿۵﴾ نظیرؔ اکبر آبادی کے کلام کا پہلا کلّیات راجا بلاس رائے کے لڑکوں کی کوششوں سے شایع ہوا۔

﴿۶﴾ نظیرؔ اکبر آبادی نے منظوم کتابِ لغت ''خالقِ باری'' کی طرز پر لکھی۔

﴿۷﴾ نظیرؔ اکبر آبادی کو نظم کی بنیاد پر عوامی شاعر کہا جاتا ہے۔

﴿۸﴾ نظیرؔ اکبر آبادی سے قبل اردو کے بیش تر شعرا اصنافِ غزل، قصیدہ اور رباعی تک محدود تھے۔

﴿۹﴾ نظیرؔ اکبر آبادی کو صنفِ نظم کی بدولت شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔

﴿۱۰﴾ نظیرؔ اکبر آبادی کی شاعری میں ارضیت اور انسان دوستی کو مرکزیت حاصل ہے۔

﴿۱۱﴾ کلجگ، آدمی نامہ، مُفلسی، بنجارہ نامہ، ہنس نامہ

﴿۱۲﴾ نظم ''ہنس نامہ'' میں ''پیڑ، دنیا اور جانور یعنی طیور، انسانوں کی علامت ہیں۔

﴿۱۳﴾ طوطا، بُلبُل، فاختہ، قمری، سیمُرغ

اکائی 03 : خواجہ الطاف حُسین حالؔی (بحیثیت نظم نگار)

ساخت

03.01 : اغراض ومقاصد

03.02 : تمہید

03.03 : خواجہ الطاف حُسین حالؔی کے حالاتِ زندگی

03.04 : خواجہ الطاف حُسین حالؔی کی تصانیف

03.05 : خواجہ الطاف حُسین حالؔی کی نظم نگاری

03.06 : خلاصہ

03.07 : فرہنگ

03.08 : نمونہ امتحانی سوالات

03.09 : حوالہ جاتی کتب

03.10 : اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

03.01 اغراض ومقاصد

انسان ماضی کے حالات و واقعات سے بہت کچھ سیکھتا ہے اور اسے اپنی زندگی میں داخل کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح اردو ادب میں ایسے واقعات وحالات کی منظر کشی ملتی ہے۔ جس سے انسان بہت کچھ سیکھتا ہے۔ ادب زندگی کے مقصد اور زندگی کے جہات پیش کرتا ہے۔ جس میں مختلف عوامل اور عناصر زندگانی پوشیدہ ہوتے ہیں۔ ہم مختلف اُدَبا وشعرا کی شخصیت کا جائزہ لیتے ہیں۔ ان کی خدمات وتخلیقات کا مطالعہ کرتے ہیں اور ان کی خوبیوں کو اخذ کرتے ہیں اور اپنی زندگی کا حصّہ بناتے ہیں۔ اُنہیں اردو شعرا کی صف میں خواجہ الطاف حسین حالؔی کا شمار ہوتا ہے۔ جنہوں نے اردو ادب میں ایک خاص جہت اور الگ شناخت قائم کی ہے۔ اردو ادب میں تنقید نگاری کی باضابطہ بنیاد گزاری اُنہیں کی سعیِ پیہم کا نتیجہ ہے۔ آپ اس اکائی میں حالؔی کی زندگی اور ان کی نثر ونظم سے متعلّق پڑھیں گے۔ ہمیں امّید ہے کہ آپ اس اکائی کے مطالعے کے بعد اردو ادب میں حالؔی کی خدمات کے بارے میں بخوبی معلومات حاصل کرسکیں گے۔

03.02 تمہید

الطاف حسین حالؔی اردو ادب کے ایک اہم ستون ہیں۔ اُنہوں نے اپنی تمام تر زندگی اردو شعر وادب کی خدمت لے لئے وقف کردی تھی۔ وہ ایک بہترین نثر نگار، منفرد لب ولہجہ کے شاعر، اردو کے پہلے نقّاد اور سوانح نگار تھے۔ اردو نظم نگاری کو فروغ دینے میں حالؔی کو امتیازی مقام حاصل ہے۔ حالؔی نے مثنوی، مرثیہ اور غزل میں طبع آزمائی کی لیکن اردو میں جدید نظم گوئی کا آغاز حالؔی کی شاعری سے ہوتا ہے۔ اس اکائی میں حالؔی کے سوانحی حالات، نثر نگاری، غزل گوئی، اور نظم نگاری کے بارے میں معلومات فراہم کریں گے۔

03.03 خواجہ الطاف حُسین حالؔی کے حالاتِ زندگی

سلطان غیاث الدّین بلبن کے زمانے میں ملک ہرات سے ایک عالم خواجہ ملک علی ہندوستان آئے۔ بادشاہ خود ذی علم اور عالموں کا قدر دان تھا۔ اس نے خواجہ ملک علی کے علم و فضل سے متاثّر ہو کر اُنہیں پانی پت میں جاگیر عطا کی۔ یہاں اُنہوں نے مستقل سکونت اختیار کر لی ان کی پندرہویں نسل میں خواجہ ایزد بخش نام کے ایک بزرگ گزرے ہیں۔ اُنہیں ۱۸۳۷ء مطابق ۱۲۵۳ھ میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ جس کا نام خواجہ الطاف حسین رکھا گیا۔ اسی الطاف حسین نے حالؔی (تخلّص) سے سارے ہندوستان میں شہرت پائی۔

حالؔی کی تعلیم پانچ سال کی عمر سے شروع ہوئی اُنہوں نے عربی، فارسی اور مذہبی کتابیں پڑھیں اس وقت کے دستور کے مطابق اُنہوں نے قرآن حفظ کیا۔ حالؔی ابھی نو سال کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ بڑے بھائی خواجہ امداد حسین نے ان کی پرورش کی۔ مالی حالات نے خواجہ الطاف حسین حالؔی کو باقاعدہ اسکول کی تعلیم سے محروم رکھا۔ مگر وہ تحصیلِ علم لے لئے کوشاں رہے۔ ان کی شادی ان کی ماموں زاد بہن اسلام النّساء سے ہوئی۔ اس کے باوجود علم حاصل کرنے کی جستجو اور بڑھ گئی۔ دہلی جا کر علم حاصل کرنے کا بڑا شوق تھا ایک دن چپکے سے رات کے وقت گھر سے نکلے اور دہلی کی طرف چل پڑے۔ پانی پت سے دہلی (۵۵ میل) کا فاصلہ اُنہوں نے پیدل ہی طے کیا۔ ۱۸۵۴ء میں دہلی پہنچے تو اتنے بڑے شہر میں کسی سے جان پہچان نہ تھی اور نہ ہی ان کے پاس پیسہ تھا۔ یہاں آ کر اُنہیں پتہ چلا کہ جامع مسجد کے قریب ''حسین بخش مدرسہ'' ہے جہاں غریب لڑکوں کو مفت تعلیم دی جاتی ہے۔ حالؔی اس مدرسہ میں شریک ہو گئے اور مولوی نوازش علی سے پڑھنا شروع کر دیا یہیں مسجد کے فرش پر سو رہتے، جو ملتا وہ کھا لیتے۔ حالؔی نے نوازش علی کے علاوہ مولوی فیض حسن، مولوی امیر احمد اور مولوی سیّد نذیر حسین سے بھی علم حاصل کیا۔

دہلی میں اس وقت بڑے شاعر، ادیب اور عالم موجود تھے۔ مشاعرے بھی ہوا کرتے تھے۔ حالؔی مشاعروں میں جانے لگے اور خود اُنہیں بھی شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا۔ دہلی میں حالؔی کی ملاقات کئی بڑے شاعروں سے ہوئی، ان میں مرزا غالبؔ بھی تھے۔ جن کا بڑا شہرہ تھا۔ حالؔی کو غالبؔ کا کلام بہت پسند آیا اور ان کے دل پر غالبؔ کی شخصیت کا بڑا گہرا اثر ہوا۔ جو زندگی بھر رہا۔ دہلی کے قیام کے زمانے میں حالؔی نے ''خستہ'' تخلّص اختیار کیا لیکن غالبؔ کے کہنے پر اپنا تخلّص بدل کر حالؔی کر دیا۔ اسی نام سے وہ دنیا میں مشہور ہوئے۔ اسی زمانے میں حالؔی نے غالبؔ کو اپنی کچھ غزلیں دکھائیں، غالبؔ بہت کم کسی کو شعر کہنے کا مشورہ دیتے تھے۔ مگر حالؔی کی غزلیں اُنہیں پسند آئیں اور اُنہوں نے کہا:

''میں کسی کو فکرِ شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا مگر تمہاری نسبت میرا خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر ظلم کرو گے۔''

غالبؔ نے سترہ اٹھارہ سال کے لڑکے میں چھپے ہوئے جوہر کو پہچان لیا تھا۔ اس سے حالؔی کی اہمیت بہت بڑھ گئی اور وہ دل لگا کر شعر کہنے لگے۔ ساتھ ساتھ عربی، فارسی اور دوسرے علوم سے بھی سیراب ہوتے رہے۔ ۱۸۵۵ء میں وہ اپنے گھر والوں کے اصرار پر دہلی چھوڑ کر پھر واپس پانی پت آ گئے۔ مگر یہاں بھی لکھنے پڑھنے کا شغل جاری رکھا۔ ۱۸۵۶ء میں حالؔی خاندان کا بوجھ بٹانے شہر حصار میں ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں معمولی سی تنخواہ پر ملازم ہو گئے۔ ۱۸۵۷ء میں غدر ہوا، لاکھوں مارے گئے ہزاروں بے گھر ہو گئے۔ حصار میں بھی گڑبڑ مچی، جس کی وجہ سے حالؔی پھر دہلی آئے۔ غدر نے دہلی کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ پھر بھی علم و ادب کا کچھ چرچا باقی تھا۔ حالؔی یہاں آئے تو پھر شعر و ادب کی محفلوں میں شرکت کرنے لگے۔

یہاں غالبؔ سے تو ان کی ملاقات تھی۔نواب مصطفیٰ خان شیفتہؔ سے بھی ملے جو جہاں گیرآباد کے رئیس تھے۔نواب مصطفیٰ خان صاحب ذوق شاعر بھی تھے۔ وہ حالیؔ کی شخصیت اور علم وادب سے بڑے متاثّر ہوئے اور اُنہیں اپنے لڑکے کا اتالیق مقرّر کر دیا۔اُنہیں اپنے ساتھ جہاں گیرآباد لے گئے۔حالیؔ اور شیفتہؔ اکثر دہلی آتے جاتے رہتے تھے اور غالبؔ سے ملتے رہتے تھے۔شیفتہؔ کو بھی غالبؔ سے بڑی محبّت اور عقیدت تھی۔ غالبؔ سے حالیؔ کی محبّت بڑھتی گئی۔۱۸۶۹ء میں حالیؔ نے غالبؔ کی سوانح بھی لکھی۔۱۸۶۹ء میں مصطفیٰ خان شیفتہؔ کا بھی انتقال ہوگیا۔شیفتہؔ کی وفات کے بعد حالیؔ فکرِ معاش میں مبتلا ہوگئے۔

اس زمانے میں حالیؔ کے علم وفضل اور شاعری کی شہرت سارے ملک میں پھیل رہی تھی۔لوگ ان کی قدر کرنے لگے تھے۔پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو نے اپنے یہاں ان کو ملازمت کی پیشکش کی اور حالیؔ دہلی سے لاہور چلے گئے۔ یہاں ان کے ذمّہ یہ کام تھا کہ جو کتابیں اس بک ڈپو میں انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہوتی تھیں ان کی نظرثانی کریں۔اور ان کی زبان درست کریں۔یہ کام حالیؔ نے بڑی محنت سے انجام دیا۔ یہاں انگریزی ادب،شاعری اور تنقید کے بہت سے ترجمے اُنہوں نے پڑھے۔جس کی وجہ سے ان کی زندگی میں ایک انقلاب آیا۔اب تک حالیؔ روایتی شاعری کرتے تھے،اگرچہ ان کے دل میں لگن تھی کہ وہ شاعری سے کوئی ایسا کام لیں جو ملک وقوم لے لئے فائدہ مند ہو۔محمّد حسین آزادؔ بھی حالیؔ کے ساتھ پنجاب بک ڈپو میں ملازم تھے۔ان کی بھی کوشش تھی کہ شاعری کا رنگ بدل دیں۔اُنہوں نے لاہور میں نئے طرز کے مشاعرے شروع کیے،جس میں غزل کی بجائے موضوعاتی نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔حالیؔ کو یہ جدّت پسند آئی ان ہی مشاعروں لے لئے اُنہوں نے برکھا رُت،نشاطِ امید،مناظرہ رحم وانصاف اور حبِّ وطن،نظمیں لکھیں۔یہ ساری نظمیں بہت پسند کی گئیں کچھ عرصے بعد یہ مشاعرے بند ہوگئے مگر حالیؔ کو نئے انداز کی شاعری کی جو لگن لگ چکی تھی،وہ برقرار رہی۔اُنہوں نے کئی اور نظمیں لکھیں جن میں مناجاتِ بیوہ (۱۸۸۴ء) اور مثنوی چپ کی داد(۱۹۰۵ء) بہت مشہور ہوئیں۔

اس عرصہ میں ہر جگہ ان کی شاعری کا چرچا ہونے لگا۔لاہور میں حالیؔ کی صحت گرنے لگی۔چار سال لاہور میں قیام کے بعد وہ پھر دہلی اور اینگلو عربیک اسکول میں عربی کے استاد مقرّر رہوئے۔دہلی میں ان کی ملاقات سرسیّد سے ہوئی۔پہلی ہی بار ان سے بہت متاثّر ہوئے ان کے خلوص اور کام کی اہمیت کو سمجھ گئے اور دل وجان سے ان کے ساتھی بن گئے۔سرسیّد نے حالیؔ سے خواہش کی کہ ترقّی یافتہ ملکوں میں شاعری سے بڑے بڑے کام لیے جاتے ہیں۔آپ بھی اپنی شاعری سے قوم کو جگانے اور اُنہیں سدھارنے کا کام لیجیے۔سرسیّد نے جو کہا تھا،حالیؔ نے ''مسدّس حالی'' کے دیباچے میں اسے یوں لکھا ہے:

> ''قوم کے ایک سچّے خیرخواہ (سرسیّد) نے غیرت دلائی کہ حیوانِ ناطق ہونے کا دعویٰ کرنا اور خدا کی دی ہوئی زبان سے کچھ کام نہ لینا بڑے شرم کی بات ہے۔۔عزیز ذلیل ہوگئے،شریف خاک میں مل گئے،علم کا خاتمہ ہوگیا۔دین کا صرف نام باقی رہ گیا۔افلاس کی گھر گھر پکار ہے۔ایسے میں جس سے جو کچھ بن آئے سو بہتر ہے۔نظم جو بالطبع مرغوب ہے اور خاص کر عرب کا ترکہ اور مسلمانوں کا ورثہ ہے،قوم کو بیدار کرنے لے لئے کسی نے نہیں لکھی۔''

سرسیّد کی باتوں کا حالؔی پر بہت اثر ہوا۔ اور اسی کا نتیجہ ''مسدّس حالی'' ہے۔ جو ''مسدّس مدوجزر اسلام'' کے نام سے ۱۸۷۹ء میں شائع ہوئی۔ اس مسدّس نے مسلمانوں کو غیرت دلائی اور خوابِ غفلت سے بیدار کر کے نئی تعلیم اور نئی زندگی کی طرف متوجّہ کیا۔

مسدّس حالؔی جب پہلی بار شائع ہوئی تو ایک ہلچل سی مچ گئی۔ لوگ پڑھتے اور روتے تھے۔ لوگوں نے مسدّس کی تعریف کی مگر سب سے زیادہ قدر سرسیّد نے کی۔ اُنہوں نے حالؔی کو لکھا:

''اگر خدا مجھ سے پوچھے گا کہ تو کیا لایا تو میں کہوں گا حالؔی سے مسدس لکھوالایا اور کچھ نہیں۔''

سرسیّد کو فخر تھا کہ حالؔی نے ان کی خواہش پر ایک بے مثال نظم لکھی اگرچہ اس کی مخالفت بھی ہوئی۔ مگر یہ مخالفتیں زیادہ دن نہ چل سکیں رام بابو سکسینہ نے ''تاریخِ ادب اردو'' میں مسدّس کی بڑی تعریف کی اور لکھا ہے:

''وہ ایک ایسی کتاب ہے کہ جو پیمبروں اور اوتاروں پر نازل ہوتی ہے اور ایسا تارا ہے جو شاعری کے آسمان پر چمکا اور ہندوستان میں اس کی وجہ سے قومی اور وطنی نظموں کا لکھنا شروع ہوا۔''

''مسدّس حالی'' شاہ کار نظم ہے جس نے اردو شاعری کے دھارے کو موڑ دیا۔ اب تک اس کے سیکڑوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اور بہت سی ہندوستانی اور کئی غیر ملکی زبانوں میں اس کے ترجمے ہو چکے ہیں۔

حالؔی نے بارہ برس اینگلو عربک اسکول میں ملازمت کی جب ۱۸۷۸ء میں سرسیّد کی سفارش پر حکومتِ حیدرآباد کے وزیرِ اعظم سر آسمان جاہ نے اپنے حکومت کی جانب سے حالؔی کو پچھتّر روپیہ ماہانہ وظیفہ جاری کر دیا تو حالی نے اینگلو عربک اسکول کی ملازمت چھوڑ دی اور پانی پت جا کر علمی اور ادبی کاموں میں مشغول ہو گئے۔ ۱۸۹۱ء یہ وظیفہ سو روپیہ ماہانہ کر دیا گیا۔

پانی پت منتقل ہونے کے بعد حالؔی نے علی گڑھ کالج کی امداد کے سلسلے میں طویل سفر کیے۔ ۱۸۹۱ء میں وہ سرسیّد کے ساتھ حیدرآباد بھی آئے تھے۔ یہاں بہت عزّت اور احترام سے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ان کے اعزاز میں بڑے بڑے جلسے بھی ہوئے۔ علی گڑھ کالج کے علمی و ادبی جلسوں میں حالؔی بھی شریک ہوتے تھے۔ ان سب مصروفیتوں کے باوجود اپنے کاموں لے لئے حالؔی وقت نکال لیتے تھے۔ یہیں پانی پت میں اُنہوں نے ۱۸۸۶ء میں فارسی کے مشہور شاعر سعدؔی شیرازی کی سوانح حیات ''شیخ سعدی'' ۱۸۹۷ء میں اور اردو و فارسی کے مشہور شاعر مرزا اسداللہ خان غالبؔ کی سوانح ''یادگارِ غالب'' اور ۱۹۰۱ء میں سرسیّد احمد خان کی ضخیم سوانح ''حیات جاوید'' لکھی۔ اس طرح حالؔی نے اُردو میں تین اعلیٰ پائے کی سوانح عمریاں لکھ کر اردو زبان میں سوانح نگاری کی بنیاد ڈالی۔ یہیں پانی پت میں حالؔی نے اردو تنقید کی پہلی بنیادی کتاب ''مقدمہ شعر و شاعری'' ۱۸۹۳ء میں لکھی۔ جو اردو تنقید میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہیں حالؔی نے بہت سے مضامین لکھے جو ''مقالات حالی'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ ''مکتوباتِ حالی'' اور ''مکاتیب حالی'' بھی منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ ۱۸۹۰ء میں ''مجموعہ نظم حالؔی'' اور ۱۸۹۳ء میں ''دیوانِ حالی'' شائع ہوئے۔

حالؔی بڑی خوبیوں والے انسان تھے۔ وہ بڑے عالم، بڑے ادیب اور شاعر تھے۔ اُنہوں نے اردو نظم و نثر کو ایک نئی زندگی اور نیا روپ دیا۔ سرسیّد کے ساتھ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم پھیلانے میں بڑا حصّہ لیا۔ ساتھ ہی عورتوں کی تعلیم کو رواج دینے میں پہل کی۔ سماج کی اصلاح لے لئے بہت سے کام کیے۔ وہ سادگی اور شرافت کا مجسّمہ تھے۔ سادگی ان کے شعر اور ادب کی بھی جان ہے اور ان کی شخصیت کا جوہر بھی ہے۔

۱۹۰۴ء میں حالؔی کو ان کی علمی و ادبی خدمات کے صلہ میں حکومتِ ہند کی جانب سے شمس العلما کا خطاب ملا۔ اور دس سال بعد ۳۱ر دسمبر ۱۹۱۴ء کو اُنھوں نے اپنی جان، جانِ آفریں کے سپرد کر دی اور پانی پت میں مشہور صوفی درویش حضرت بوعلی شاہ قلندر کی درگاہ کے احاطہ میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱﴾ حالؔی کے والد کے انتقال کے وقت حالی کی عمر کیا تھی؟

﴿۲﴾ حالؔی دہلی کے کس مدرسے میں شریک ہوئے؟

﴿۳﴾ حالؔی کی ''مسدّس مدو جزر اسلام'' کب منظرِ عام پر آئی؟

03.04 خواجہ الطاف حُسین حالؔی کی تصانیف

حالؔی بیک وقت اعلیٰ درجے کے شاعر، بہترین اِنشا پرداز، غیر معمولی نقّاد اور بے مثال سوانح نگار تھے۔ حالؔی کی سب سے پہلے نثری تصنیف جو اردو میں ملتی ہے وہ ''مجالس النساء'' ہے۔ یہ ۱۸۷۴ء میں لکھی گئی۔ یہ تصنیف دو حصّوں میں لکھی گئی ہے۔ اور اردو ناول کی ابتدائی شکل ہے۔ اس کا اُسلوب آسان اور عام فہم ہے۔ عرصہ تک پنجاب اور یوپی کے نصاب میں شامل رہی۔ اس تصنیف پر حالؔی کو حکومت کی طرف سے چار سو روپیہ کا انعام بھی ملا تھا۔

حالؔی کی دوسری اہم تصنیف ''مقدمہ شعر و شاعری'' ہے۔ یہ مقدمہ دیوانِ حالؔی کے ساتھ ۱۸۹۳ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ تصنیف دو حصّوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصّے میں شعر کی تعریف اور اس کی خصوصیات بیان کیے گئے ہیں۔ اور دوسرے حصّے میں اردو کی روایتی شاعری غزل، قصیدہ اور مثنوی کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ یعنی مقدمہ شعر و شاعری کا پہلا حصّہ نظری اور دوسرا حصّہ عملی مباحث پر مشتمل ہے۔

حالؔی اوّلین مصنّفین میں سے ہیں جنھوں نے اردو نثر میں سوانح نگاری کو مقبولیت عطا کی۔ حیاتِ سعدی، یادگارِ غالب، اور 'حیاتِ جاوید' اردو نثر میں سوانح نگاری کے عمدہ نمونے ہیں۔ حالؔی کی سب سے پہلی سوانح ''حیات سعدی'' ۱۸۸۶ء اور دوسری ''یادگارِ غالبؔ'' ۱۸۹۷ء اور تیسری ''حیات جاوید'' ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئیں۔ حیاتِ سعدی نہ صرف حالؔی کی پہلی اردو سوانح ہے بلکہ اردو ادب میں لکھی گئی پہلی سوانح نگاری کی کتاب ہے اور اس اعتبار سے حالؔی اردو سوانح نگاری کے موجد ہیں۔ گو 'حیاتِ سعدی مختصر لیکن جامع ہے۔ کافی تحقیق و کدوکاوش کے بعد جتنا مواد بھی اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ یہ اردو زبان و ادب کی پہلی کتاب ہے جس میں شیخ سعدی کے مفصّل حالات ملتے ہیں۔ ''یادگارِ غالبؔ'' حالؔی کی دوسری سوانح نگاری ہے۔ حالؔی کو غالبؔ سے دلی عقیدت اور محبّت تھی۔ ان کی سیرت و شخصیت اور کلام کی خوبی اور عظمت کے دل سے قائل تھے۔ شاگرد ہونے کے ناطے محترم جانتے تھے۔ اور پھر دونوں میں مشفقانہ اور مخلصانہ تعلّقات بھی تھے۔ اس طرح غالبؔ مربّی، دوست اور ہم عصر تھے۔ چنانچہ اُنھیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے اپنی سوانح نگاری کے لئے غالبؔ جیسا با کمال شاعر اور بلند پایہ شخصیت کے مالک کا انتخاب کیا۔ ''یادگارِ غالبؔ'' دو حصّوں پر مشتمل ہے۔ حصّہ اوّل حیاتِ غالب، اور حصّہ دوم کلام سے متعلّق ہے۔

''حیاتِ جاوید''، ضخیم تر سوانح نگاری ہے۔ جس میں سرسیّد خاں کے حالاتِ زندگی ان کی سیرت و شخصیت اور کارناموں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

''حیاتِ جاوید'' دو حصّوں پر مشتمل ہے، پہلے حصّے میں تاریخی ترتیب کے لحاظ سے زندگی کے حالات اور کارناموں کا بیان اور دوسرے میں کارناموں پر تبصرہ اور اس کی قدر و قیمت کا تعیّن کیا گیا ہے۔ سرسیّد کے خاندانی حالات سے لے کر ان کی رحلت تک کے واقعات ترتیب سے بیان کیے گئے ہیں۔ ''حیاتِ جاوید'' پر اکثر یہ اعتراضات کیے جاتے ہیں کہ حالؔی نے دعویٰ کیا تھا کہ ''حیاتِ جاوید'' کی بنیاد نکتہ چینی پر رکھی جائے گی مگر اس سلسلے میں حالؔی ناکام رہے اور اُنہوں نے صرف ہم دَردی سے کام لیا ہے۔ اسی لئے ان کی اس سوانح نگاری کو ''مدلل مداحی'' کہا جاتا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۴﴾ مجالس النساء کب لکھی گئی؟

﴿۵﴾ حالؔی کی تخلیق کردہ سرسیّد کی سوانح کا کیا نام ہے؟

﴿۶﴾ حالؔی نے فارسی کے کس شاعر کی سوانح لکھی؟

﴿۷﴾ مقدّمہ شعر و شاعری کس طرح کی تخلیق ہے؟

03.05 خواجہ الطاف حُسین حالؔی کی نظم نگاری

حالؔی غزل گو شاعر تھے۔ ان کی غزل نے جن اثرات کے تحت نشو نما پائی اس کی نشان دہی خود اُنہوں نے اپنے ایک شعر میں اس طرح کر دی ہے۔

حالؔی سخن میں شیفتؔہ سے مستفید ہے
غالبؔ کا معتقد ہے، مقلّد ہے میرؔ کا

حالؔی ۱۸۵۴ء میں پہلی بار دہلی آئے، اس وقت وہ سترہ سال کے تھے۔ اس زمانے میں دہلی میں ذوقؔ، غالبؔ، مومنؔ زندہ تھے۔ بہادر شاہ ظفر کی شاعری کا بھی شہرہ تھا۔ دہلی میں شعر و ادب کی محفلیں زندہ تھیں۔ لال قلعہ میں بھی مشاعرے ہوتے تھے۔ ان ہی مشاعروں میں حالؔی نے غالبؔ کو سنا تھا۔ اُنہیں غالبؔ کا کلام بہت پسند آیا۔ غالبؔ کا کلام حالؔی لے لئے ملاقات کا ذریعہ بنا۔ حالؔی اردو، فارسی شعروں کا مطلب سمجھنے کے لئے غالبؔ کے پاس جانے لگے، اس طرح اُنہوں نے اردو شعر گوئی کی اِبتدا کی۔ خستہؔ تخلّص اختیار کیا اور غالبؔ سے اصلاح لینے لگے۔ غالبؔ نے حالؔی میں پوشیدہ جوہر کو پہچان لیا اور ان کی بڑی ہمت افزائی کی۔ جس سے حالؔی کی ہمت بڑھ گئی۔ اور وہ فکرِ شعر کرتے رہے۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکا۔ کیوں کہ ۱۸۵۵ء سے ۱۸۶۲ء تک حالؔی دہلی سے دوٗر پانی پت اور حصار میں رہے۔ ۱۸۶۲ء میں وہ دوبارہ پانی پت چھوڑ کر دہلی آئے۔ ۱۸۶۳ء میں ان کی ملاقات جہانگیر آباد کے عالم و فاضل رئیس نواب مصطفیٰ خان شیفتؔہ سے ہوئی جو ایک بلند پایہ شاعر اور مومنؔ کے شاگرد تھے۔ اُنہوں نے اپنے لڑکے محمّد اسحاق خان کی اتالیقی لے لئے حالؔی کو مقرّر کیا۔ حالؔی سات سال تک جہانگیر آباد میں مقیم رہے۔ اس طرح حالؔی اور شیفتؔہ کا ساتھ رہنا بڑا مفید ثابت ہوا۔ ان کے میل جول سے حالؔی کے شعر و سخن کو جلا ملی۔ حالؔی نے شیفتؔہ کو اپنا استاد بنا لیا۔ اس طرح حالؔی کی ادبی تربیت غالبؔ اور شیفتہ کی صحبتوں سے ہوئی۔

۱۸۶۹ء میں غالبؔ اور شیفتہؔ کی وفات کے بعد ملازمت کے سلسلے میں حالیؔ لاہور آئے۔ اور پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو لاہور میں مترجّم کی حیثیت سے مامور ہوئے۔ ان کے ذمّہ یہ کام تھا کہ انگریزی سے ترجمی کی ہوئی اردو کتابوں پر نظر ثانی کریں اور ان کی زبان و بیان کی غلطیوں کو درست کریں۔ اس طرح اس ملازمت کی وجہ سے حالیؔ کو مغربی ادب کی بہت سی کتابوں اور ان کے مطالب سے واقفیت ہوئی۔ بہت سے ایسے خیالات جو ان کے دل میں موجود تھے، ان کے مطالعے سے اُن کو جلا ملی۔ انگریزی ادب کے مطالعے سے ان میں تنقیدی شعور پیدا ہوا۔ اُنہیں معلوم ہوا کہ فارسی ادب کے ذریعے اردو کی خدمت نہیں ہوسکتی۔ اس لئے مغربی ادب کی طرف ان کا رجحان بڑھتا گیا۔ حالیؔ قدیم اُردو شاعری سے مطمئن نہیں تھے۔ اس لئے وہ قدیم اردو شاعری میں تبدیلی چاہتے تھے۔ چنانچہ ۱۸۷۴ء میں کرنل ہالرائیڈ ناظمِ تعلیمات نے محمّد حسین آزادؔ کے تعاون سے لاہور میں نئے مشاعرے کی بنیاد ڈالی۔ جس میں غزلوں کے بجائے نظمیں پڑھی جانے لگیں۔ حالیؔ نے ان مشاعروں میں سرگرم حصّہ لیا۔ اور اُنہیں کامیاب بنایا۔ ۱۸۷۵ء کے شروع میں حالیؔ دہلی واپس آ گئے، یہیں سرسیّد سے ان کی ملاقات ہوئی۔ سرسیّد کی شخصیت اور ان کی بے لوث خدمت سے حالیؔ بڑے متاثر ہوئے اور وہ ان کے مشن کا ایک جز بن گئے۔ سرسیّد کے دل میں قوم کا درد تھا، وہ مسلمانوں کی ڈوبتی کشتی کو پار لگانا چاہتے تھے۔ حالیؔ بھی بہت دردمند دل ساتھ لے کر آئے تھے۔ مسدّس حالیؔ، مقدمہ شعر و شاعری اور جدید غزلوں کے اصل محرّک سرسیّد ہی تھے۔ جن کی صحبت اور نظریات نے حالیؔ کے ذہن کے تمام دریچے کھول دیئے۔ اور ان کی فکر کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔

۱۸۹۳ء میں ''مقدمہ شعر و شاری'' طبع ہوا۔ اس میں حالیؔ نے شاعری کی ماہیت اور اس کے عیوب و نقائص پر مفصّل بحث کی۔ وہ اُردو شاعری اور خصوصاً اردو غزل کی اصلاح چاہتے تھے۔ اُنہوں نے اردو غزل گوئی کو ہی نہیں اردو شاعری کی عام روش پر اعتراض کیا۔ وہ اردو شاعری میں انقلاب لانا چاہتے تھے اور غزل کو صحیح معنوں میں جدید بنانا چاہتے تھے۔ حالیؔ اردو غزل کی فرسودگی اور تقلیدی انداز سے نالاں تھے۔ حالیؔ نے یہ بات بڑی شدّت سے محسوس کی تھی کہ اگر غزل کو زندہ رکھنا ہے تو اس کو بدلنا اور جدید بنانا ہوگا۔ چنانچہ اُنہوں نے اصلاح کی تجویز پیش کیں۔ حالیؔ نے ''مقدمہ شعر و شاعری'' میں جدید غزل کے جو اصول پیش کیے ہیں اُنہیں عملی طور پر برت کر دکھایا۔ ۱۸۵۷ء تحریکِ آزادی کے بعد تہذیبی قدریں ٹوٹتی اور بکھرتی جا رہی تھیں۔ نئے تصوّرات پر پرانے افکار و خیالات کے تار و پود بکھیر دیے تھے۔ حالیؔ کو اس کا احساس ہو چکا تھا کہ اپنے شعری وجود کو برقرار رکھنے کے لئے نئے حالات سے مطابقت اور ہم آہنگی پیدا کرنی ضروری ہے۔ قدیم تصورات سے دوری اور جدید خیالات سے قرب ضروری تھا اس لئے حالیؔ نے یہی رویہ اختیار کیا۔ حالیؔ کو اس کا احساس تھا کہ قدیم رنگِ شاعری ترک کرنے کے بعد اُنہوں نے جو نیا آہنگ اور نیا اسلوب اختیار کیا ہے اور جن موضوعات پر وہ زور دے رہے ہیں وہ وقت کا تقاضہ ہیں۔ خواہ اُنہیں دل و دماغ، معاشرہ اور سماج قبول کرے یا نہیں۔

اب سنو حالیؔ کے نوحے عمر بھر
ہو چکا ہنگامۂ مدح و غزل
ہو چکے حالیؔ غزل خوانی کے دن
راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا

جدید غزلوں میں حالؔی نے نئے خیالات، عصری رجحانات، زندگی اور زمانے کے مسائل کو بیان کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا کچھ کرلو نوجوانو اٹھتی جوانیاں ہیں
بڑھاؤ نہ آپس میں ملت زیادہ مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ
فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا مگر اس مین پڑتی ہے محنت زیادہ
علم کیا ، اخلاق کیا ، ہتھیار کیا سب بشر کے مار رکھنے کے ہیں ڈھنگ
قوم کو حالؔی نہیں راس اتّفاق پھوٹ ہی کا بس کھلے گا ہم پہ رنگ

حالؔی کے کلام میں متانت، اور سنجیدگی ہے۔ وہ غزل میں سادگی کے قائل تھے۔ سادگی اور سلاست کے باوجود حالی کی زبان اونچے طبقے کی مستند زبان ہے۔ اُنہوں نے طریقِ اظہار کے انوکھے تجربے نہیں کیے۔ وہ خود رقم طراز ہیں کہ:

''نئے خیالات کی بھی شاعر کو سخت ضرورت ہے کہ طرزِ بیان میں قدما کے طرزِ بیان سے بہت دور نہ جا پڑے اور جہاں تک ممکن ہو اپنے خیالات کو اُنہیں پیرایوں میں ادا کرے جن سے لوگوں کے کان مانوس ہوں۔''

حالؔی جدید شاعری کے بانی ہیں۔ اُنہوں نے واقعیت اور حقیقت نگاری کو اہمیت دی۔ اُنہوں نے غزل کو اس قابل بنا دیا کہ وہ ہر قسم کے احساسات اور جذبات ادا کر سکے۔ اُنہوں نے اس کو وسعت، رفعت اور جامعیت عطا کی۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۸﴾ حالؔی سخن میں شیفتہؔ سے مستفید ہے ☆ غالبؔ کا معتقد ہے، مقلّد ہے میرؔ کا..... یہ شعر کس کا ہے؟

﴿۹﴾ مصرعۂ اولیٰ لکھئے! مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

حالؔی کی نظم نگاری ان کے طرزِ فکر کی ترجمان اور اردو شاعری کے سرمائے میں گرانقدر اضافہ ہے۔ یوں تو حالؔی کی نظم نگاری کی ابتدا ۱۸۷۴ء میں لاہور میں ہو چکی تھی۔ جب حالؔی ملازمت کے سلسلے میں لاہور میں مقیم تھے، اس وقت مولانا محمّد حسین آزادؔ نے کرنل ہالرائیڈ کی ایماء پر شاعری کو با مقصد اور افادی بنانے کے لئے مغرب کے زیرِ اثر جدید شاعری کی تحریک شروع کی اور انجمن پنجاب کی بنیاد ڈالی۔ انجمن پنجاب کے مشاعروں کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں مصرعۂ طرح کی بجائے نظموں کے عنوانات دیئے جاتے تھے۔ اس وقت کے مشہور شاعران مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ اس انجمن کے مشاعروں لے لئے حالؔی نے چار نظمیں، برکھا رُت، نشاطِ امید، حبِّ وطن، اور مناظرہ رحم و انصاف لکھیں۔

''برکھا رُت'' میں برسات کی مختلف کیفیات کا ذکر کیا گیا ہے ''نشاطِ امید'' کا موضوع بھی عام ہے۔ اس میں حالؔی نے امید کی ولوہ خیزی اور دلنوازی پر روشنی ڈالی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد مسلمان اپنے حال اور مستقبل دونوں سے ناامید ہو چکے تھے اور ماضی کی یادوں کو سینے سے لگائے زندگی گزار دینا چاہتے تھے۔ حالؔی نے اپنی نظم ''نشاطِ امید'' میں اسی خیال کا اظہار کیا ہے۔ کہ امید انسان کو غم کے اندھیرے سے باہر نکالتی ہے اور اسے قوّتِ عمل عطا کرتی ہے۔

حالؔی حبِّ وطن کے جذبے سے سرشار تھے۔اور وہ وطن کی محبّت کو جزوِایمان تصوّر کرتے تھے۔قومی جذبے سے بھرپوران کی یادگار نظم ''حبِّ وطن'' ہے۔اس نظم کی ابتدا حالؔی نے اس نفسیاتی نکتہ سے کی ہے کہ مناظرِ فطرت اگر چہ بہت دل کش وحسین ہوتے ہیں لیکن اس غریب الوطن لے لئے ان میں وہ دل کشی نہیں رہتی جو وطن میں محسوس ہوتی ہے۔وطن سے دوری کی کیفیت کو اُنہوں نے بہت تفصیل سے بیان کیا ہے اوراس کے ساتھ بعض تاریخی واقعات کو بیان کرتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ تاریخ کی انقلابی تبدیلیاں بھی اس جذبے کو لوگوں کے دلوں سے نکال نہ سکیں۔آریہ جب ہندوستان میں آئے تو یہاں کے رہنے والوں نے اپنے آپ کو شُدر اور راکشش کہلانا گوارا کیا لیکن وطن کو نہیں چھوڑا۔رام چندر جی جب بن باس گئے تو ایک لمحہ لے لئے اجودھیا کی یاد ان کے دل سے نہیں گئی۔حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جب بطحا سے یثرب کی طرف چلے گئے تو وہاں کی یاد ان کو برابر آتی رہی۔اسی طرح حالؔی نے حضرت یوسف کا قصّہ بیان کیا ہے اوران مختلف مثالوں سے وطن کی محبّت کی اہمیت بتائی۔یہاں تک پہنچنے کے بعد حالؔی نے اس جذبے کو قومی زاویۂ نظر سے دیکھا ہے اور نفرت وعداوت، جو وطن میں موجود ہے اس کو ختم کر کے محبّت کا پیغام دیا ہے۔وہ قوم کے افراد کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو! اٹھو، اہلِ وطن کے دوست بنو
مرد ہو تو کسی کے کام آؤ ورنہ کھاؤ ، پیو ، چلے جاؤ
جب کوئی زندگی کا لطف اٹھاؤ دل کو دکھ بھائیوں کے یاد دلاؤ
ہو مسلمان اس میں یا ہندو بودھ مذہب ہو یا کہ ہو برہمو
جعفری ہووے یا کہ ہو حنفی جین مت ہووے یاہو بیشنوی
سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو
ملک ہیں اتّفاق سے آزاد شہر ہیں اتّفاق سے آباد
قوم پر کرتے ہو اگر احساں تو دکھاؤ کچھ اپنا جوش نہاں
کچھ دنوں عیش میں خلل ڈالو پیٹ میں جو ہے سب اُگل ڈالو
علم کو کردو کوٗ بہ کوٗ ارزاں ہند کو کر دکھاؤ انگلستاں

اس نظم میں حالؔی قوم کو عمل کے لئے اکساتے ہیں اور تعمیری کاموں کی طرف راغب کرتے ہیں تا کہ وطن میں خوشحالی آ سکے۔

قوم کی عزّت اب ہنر سے ہے علم سے یا کہ سیم و زر سے ہے
کوئی دن میں وہ دَور آئے گا بے ہنر بھیک تک نہ پائے گا
نہ رہیں گے سدا یہی دن رات یاد رکھنا ہماری آج کی بات
گر نہیں سنتے قول حالؔی کا پھر نہ کہنا کہ کوئی کہتا تھا

اس طرح حالؔی کا حبِّ وطن کا تصوّر اجتماعی اور قومی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ان نظموں کے علاوہ حالؔی نے ''مناظرۂ رحم وانصاف''، ''مناظرۂ تعصّب وانصاف'' (۱۸۸۲ء)، ''مناظرۂ واعظ وشاعر'' (۱۸۸۲ء)، ''پھوٹ اور ایکے کا مناظرہ'' ۱۸۸۷ء)، اور ''دولت اور وقت کا

مناظرہ‘‘ (۱۸۸۷ء)، جیسی نظمیں بھی لکھیں۔ جن کا مقصد اخلاقی اور تہذیبی پہلوؤں کو اجاگر کرنا تھا۔ وہ اخلاقی اقدار کی اہمیت تسلیم کروانا چاہتے تھے۔ اور سماج کی برائیوں کی اصلاح ان کا مطمحِ نظر تھا۔ ’’شکوۂ ہند‘‘ میں حالؔی نے اپنی قوم کے حال کا اس کے ماضی سے موازنہ کر کے موجودہ بدحالی، انتشار اور تنزّل کی طرف اشارے کیے ہیں۔ یہ اصلاحی نظمیں تہذیبی اور تاریخی اہمیت کی حامل ہیں۔

’’مناجاتِ بیوہ‘‘ میں حالؔی نے ایک بڑے اور اہم مسئلے کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ یہ مسئلہ بیوہ کا مسئلہ ہے ہندوستان اور خاص کر مسلمانوں کی زندگی میں یہ مسئلہ بہت اہم ہے کیوں کہ یہاں عورت کی زندگی اس کے شوہر سے عبارت ہوتی ہے اور اگر اس کا شوہر مر جائے تو اس کو منحوس سمجھا جاتا ہے۔ اس سے اچھّا برتاؤ نہیں کیا جاتا۔ اس کی تمام خوشیاں اس سے چھین لی جاتی ہیں۔ حالؔی نے ہندوستانی سماج کے اس مسئلے کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے انتہائی سوز و گداز میں ڈوبی یہ نظم لکھی۔ اس نظم میں بیوہ خدا سے فریاد کرتی ہے اور اپنی ذہنی کیفیت اپنی الجھنیں اور پریشانیاں اور اپنی بے بسی کو بیان کرتے ہوئے خدا سے مدد چاہتی ہے کہ اس میں زندگی گزارنے کی ہمّت پیدا ہو۔

بے کس کا غم خوار ہے تو ہی بری بنی کا یار ہے تو ہی
دکھیا ، دکھی یتیم اور بیوہ تیرے ہی ہاتھ ان سب کا ہے کھیوا
تو مرض دے تو ہی دوا دے تو ہی دوا ، دارو میں شفا ہے
تو ہی پلائے زہر کے پیالے تو ہی امرت زہر میں ڈالے
تو ہی دلوں میں آگ لگائے تو ہی دلوں کی آگ بجھائے
چمکارے چمکار کے مارے مارے مار کے پھر چمکارے
پیار کا تیرے پوچھنا کیا ہے مار میں بھی اک تیری مزا ہے

بیوہ اپنے متعلّق جو بھی کہتی ہے وہ خدا سے کہتی ہے۔ کیوں کہ اس کا عقیدہ ہے کہ وہی سب کچھ کرنے والا ہے۔ وہ اس مخاطبت میں اپنی زندگی کے سارے مدوجزر کو پیش کر دیتی ہے۔ حالؔی نے جن خیالات پر ’’مناجاتِ بیوہ‘‘ کی بنیاد رکھی وہ گہرے سماجی شعور کا نتیجہ ہیں۔ حالؔی کو ہندوستانی سماج کی پیچیدگیوں کا پوری طرح اندازہ تھا۔ وہ ان میں اصلاحی تبدیلیاں لانا چاہتے تھے۔

’’چپ کی داد‘‘ میں حالؔی نے عورت کو ماں، بہن اور بیٹی کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ اُنہوں نے عورت کو قوم کی عزّت قرار دیا ہے۔ اس حقیقت کی طرف توجّہ دلائی ہے کہ عورت ماں بہن اور بیٹی ہوتی ہے۔ زندگی اس کے بغیر نامکمّل ہے۔

اے ماؤ! بہنو! بیٹیو! دنیا کی زینت تم سے ہے
ملکوں کی بستی ہو تمہیں قوموں کی عزّت تم سے ہے
تم گھر کی ہو شہزادیاں شہروں کی ہو آبادیاں
غمگیں دلوں کی شادیاں، دکھ سکھ میں راحت تم سے ہے
نیکی کی تم تصویر ہو عِفّت کی تم تدبیر ہو
ہو دین کی تم پاسباں ، ایماں سلامت تم سے ہے

فطرت تمہاری ہے حیا ، طینت میں ہے مہر و وفا
گھٹی میں ہے صبرو رضا،انساں عبارت تم سے ہے

ہندوستانی عورت کا وجود خدمت سے عبارت ہے۔وہ بچپن میں ماں، باپ اور بہن، بھائیوں کی خدمت کرتی ہے، جوانی میں شوہر اور سسرال والوں کی عزّت کرتی ہے۔شادی کے بعد بچّوں کی پرورش اس کا سب سے بڑا فرض ہے۔

میکے میں سارے گھر کی تھیں گو مالک و مختار تم
پر سارے کنبے کی رہیں بچپن سے خدمت گار تم
ماں باپ کے حکموں پہ پتلی کی طرح پھرتی رہیں
غم خوار باپوں کی رہیں ، ماؤں کی تابع دار تم
سسرال میں پہنچیں تو واں اک دوسرا دیکھا جہاں
جا اُتریں گویا دیس سے پردیس میں اک بار تم
وہاں فکر تھی ہر دم یہی ناخوش نہ ہو تم سے کوئی
اپنے سے رنجش کے کبھی پاؤ نہ وہاں آثار تم

انسانی زندگی کے بعض شعبے ایسے ہیں جن کی تکمیل صرف عورت ہی کر سکتی ہے مثلاً بچّوں کی پرورش وتربیت کرنا، یہ صرف عورت کا ہی حق ہے اور قدرت نے اس کو اسی کام لے لئے بنایا ہے۔ بڑے بڑے بادشاہ، مصلح، واعظ، فلسفی، شاعر، ادیب سب کے سب ماں کی آغوش میں پرورش پاتے ہیں۔

پیدا اگر ہوتیں نہ تم ، بیڑا نہ ہوتا پار یہ
چیخ اُٹھتے دو دن میں ، اگر مردوں پہ پڑتا بار یہ
سرکار سے مالک کی جتنے پاک بندے ہیں بڑھے
وہ ماؤں کی گودوں کے زینے سے ہیں سب اوپر چڑھے

عورت کی سب سے بڑی حق تلفی علم کی دولت سے محروم رکھنا ہے۔

جب تک جیو تم علم و دانش سے رہو محروم یہاں
آئی ہو جیسی بے خبر ویسی ہی جاؤ بے خبر
جو علم مردوں لے لئے سمجھا گیا آبِ حیات
ٹھہرا تمہارے حق میں وہ زہرِ ہلا ہل سر بسر

لیکن حالؔی کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ اب یہ صورتِ حال زیادہ عرصہ باقی رہنے والی نہیں ہے کیوں کہ حالات بدل رہے ہیں اور بدلتے ہوئے حالات میں یہ آواز صاف سنائی دیتی ہے۔

آتا ہے وقت انصاف کا، نزدیک ہے یوم الحساب
دنیا کو دینا ہوگا ان حق تلفیوں کا وہاں جواب

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ سرسیّد کی ایماء پر حالؔی نے ''مسدّس حالی'' کے نام سے ایک طویل نظم لکھی تھی اس مسدّس نے اردو شاعری میں ایک انقلاب برپا کر دیا اس کا مقصد سوئی ہوئی قوم کو بیدار کرنا وران کی قوّتِ عمل کو مہمیز کرنا تھا۔ مسدّس کے دیباچے میں حالؔی نے اس موضوع کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اس مسدّس کے آغاز میں پانچ سات بند تمہید کے لکھ کر اوّل عرب کی اس ابتر حالت کا خاکہ کھینچا ہے جو ظہورِ اسلام سے پہلے تھی اور جس کا نام اسلام کی زبان میں جاہلیت رکھا گیا۔ پھر کوکب اسلام کا طلوع ہوا اور نبی امّی کی تعلیم سے اس ریگستان کا سرسبز و شاداب ہو جانا اور اس ابرِ رحمت کا امّت کی کھیتی کو رحلت کے وقت ہرا بھرا چھوڑ جانا اور مسلمانوں کا دینی و دنیوی ترقّیات میں تمام عالم پر سبقت لے جانا بیان کیا ہے۔ اس کے بعد اس کے تنزل کا حال لکھا ہے اور قوم لے لئے اپنے بے ہنر ہاتھوں سے ایک آئینہ خانہ بنایا ہے۔ جس میں آ کر وہ اپنے خدوخال دیکھ کر سکتے ہیں کہ ہم کون تھے اور کیا ہو گئے۔''

حالؔی نے مسدّس کو بقراط کے اس قول سے شروع کیا ہے کہ زندگی میں مرض کو مرض اور بیماری کو بیماری سمجھنا ہی سب سے مہلک مرض اور سب سے بڑی بیماری ہے۔ اس نظریہ کا اطلاق مسلمانوں پر کیا ہے جس میں اپنی ذلّت کا احساس بھی باقی نہیں رہا۔ وہ تمام باتیں اس قوم میں موجود تھیں جو زوال آمادہ قوم میں ہوتی ہیں۔ اس قوم نے اپنے اعمال سے اس قوم کو بدنام کیا۔ وہ دین جس نے اُنہیں آدابِ انسانیت اور تمدن سکھایا، محبّت کا سبق پڑھایا، تعصّب سے ڈرایا، زندگی کے زرّیں اصولوں سے آگاہ کیا۔ مسلمانوں نے ہی اسلامی اصولوں کو خیرباد کہہ دیا۔ جس کی وجہ سے نہ دولت باقی رہی نہ عزّت۔ علم وفن بھی رخصت ہو گئے۔ شرافت کا خاتمہ ہو گیا۔ محنت ومشقّت کی عادت ختم ہو گئی۔ حالؔی نے اس صورتِ حال پر افسوس کا اظہار کیا ہے اور مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔

ادا کر چکی جب حق اپنا حکومت — رہی اب نہ اسلام کی اس کو حاجت
مگر حیف اے فخر آدم کی امّت — ہوئی آدمیت بھی ساتھ اس کے رخصت
حکومت تھی گویا اک جھول تم پر — کہ اُڑتے ہی اس کے نکل آئے جوہر
زمانے میں ہیں ایسی قومیں بہت سی — نہیں جن میں تخصیص فرما دہی کی
پر آفت کہیں ایسی آئی نہ ہوگی — کہ گھر گھر پہ یاں چھا گئی آ کے پستی
چکور اور شہباز سب اَوج پر ہیں — مگر ایک ہم ہیں کہ بے بال و پر ہیں
وہ ملّت کے گردوں پر اس کا قدم تھا — ہر اک کھونٹ میں جس کے برپا علم تھا
وہ فرقہ جو آفاق میں محترم تھا — وہ امّت لقب جس کا خیرالامم تھا
نشاں اس کا باقی ہے صرف اس قدر یاں — کہ گنتے ہیں اپنے کو ہم بھی مسلماں

وگر نہ ہماری رگوں میں لہو میں ہمارے ارادوں میں اور جستجو میں
دلوں میں زبانوں میں اور گفتگو میں طبیعت میں فطرت میں عادت میں خو میں
نہیں کوئی ذرّہ نجابت کا باقی اگر ہو کسی میں تو ہے اتّفاقی

حالؔی نے قوم کو قعرِ مذلت سے باہر نکلنے کا احساس دلایا ہے اور ایک نئی دنیا کی تصویر کھینچی ہے۔ جس میں شان دار مستقبل ان کا راستہ دیکھ رہا ہے۔

مجھے ڈر ہے اے میرے ہم قوم یارو! مبادا کہ وہ ننگ عالم تمہیں ہو
گر اسلام کی کچھ حمیت ہے تم کو تو جلدی سے اُٹھو اور اپنی خبر لو
وگر نہ یہ قول آئے گا راست تم پر کہ ہونے سے ان کا نہ ہونا ہے بہتر
حکومت نے آزادیاں تم کو دی ہیں ترقّی کی راہیں سراسر کھلی ہیں
صدائیں یہ ہر سمت سے آ رہی ہیں کہ راجا سے پرجا تلک سب سکھی ہیں
تسلّط ہے ملکوں میں امن و اماں کا نہیں بند رستہ کسی کارواں کا

حالؔی کی عظمت ان کی غزلیات کے علاوہ ان کے مسدّس کی وجہ سے ہے۔ اس سے ان کے فطری جوہر کا اظہار ہوتا ہے۔ اظہار کی سادگی اور توازن الفاظ کی سلاست، روحانی جذبات کی گرمی اور خلوص مسدّس میں بے ساختگی سے جمع ہو گئے ہیں۔

غرض کہ حالؔی نے نہ صرف نیچرل شاعری کی بنیاد رکھی بلکہ قومی، معاشرتی، سماجی ناانصافی، عورت کے حقوق کی پامالی، اور قوم کی تعلیمی پسماندگی کے موضوعات پر بھی نظمیں لکھیں۔ وہ اپنے وقت کے بہت بڑے بیّاض تھے۔ ان کے شعور میں بیداری تھی۔ وہ حالات کو دیکھ کے ماحول کے تقاضوں کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کے پاس زندگی کا بہت واضح نقطۂ نظر تھا۔ اس لئے ان کے پاس زندگی کو بنانے، حالات کو سدھارنے اور ماحول کو نکھارنے کی ایک خواہش تھی۔ وہ اپنے دور کی صحیح نمائندگی کرتے تھے۔ ان کی یہ نظمیں جدید شاعری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱۰﴾ حالی نے نظم نگاری کی ابتدا کب اور کہاں کی؟

﴿۱۱﴾ وطن کی محبت کے موضوع پر حالی کی کون سی نظم ہے؟

﴿۱۲﴾ مناجات بیوہ میں حالی نے کس موضوع کو بیان کیا ہے؟

03.06 خلاصہ

خواجہ الطاف حسین حالؔی ایک ادیب، نقّاد، سوانح نگار، اور نظم نگار ہیں۔ نیچرل شاعری کے بانیوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ وہ سرسیّد کے رُفقا میں شامل تھے۔ محمد حسین آزادؔ کے ساتھ موضوعاتی مشاعروں کی بنیاد ڈالی اور ان مشاعروں لے لئے برکھارت، نشاطِ امید، مناظرۂ رحم وانصاف اور حبِّ وطن جیسی نظمیں لکھیں۔ سرسیّد کی ایماء پر ''مسدّس حالؔی'' لکھ کر قوم کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا۔ حیاتِ سعدی، یادگارِ غالب

اور حیاتِ جاوید جیسی یادگار سوانح عمریاں لکھ کر اردو زبان میں سوانح نگاری کی بنیاد ڈالی۔ تنقید پر ان کی کتاب ''مقدّمۂ شعروشاعری'' سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ حالؔی نے شاعری کی تقریباً تمام اصناف، غزل، مسدّس، ترکیب بند، ترجیع بند، مثنوی، مرثیہ اور نظم میں طبع آزمائی کی۔ حالؔی جدید شاعری کے بانی ہیں۔ اُنہوں نے واقعیت اور حقیقت نگاری کو اہمیت دی۔ ان کی نظمیں ان کے طرزِ فکر کی ترجمان اور اردو شاعری کے سرمائے میں گراں قدر اضافہ ہیں۔

۱۹۰۴ء میں حالؔی کو علمی و ادبی خدمات کے سلسلہ میں شمس العلما کا خطاب ملا، ۱۹۱۴ء میں وفات ہوئی۔ پانی پت میں مشہور صوفی، درویش حضرت بوعلی شاہ قلندر کی درگاہ کے احاطے میں سپردِ خاک ہوئے۔

03.07 فرہنگ

اتالیق	: استاد، تربیت دینے والا	شہرہ	: دنیا بھر میں مشہور
اِنشاپرداز	: ادیب، مضمون نگار	طینت	: طبیعت، عادت
تحصیل	: علم حاصل کرنا	عفّت	: عصمت، پارسائی
خستہ	: مفلس، بدحال، زخمی، مرمرہ	گردوں	: آسمان

03.08 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درجِ ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : خواجہ الطاف حسین حالؔی کی نظم نگاری پر تبصرہ کیجیے۔

سوال نمبر۲ : خواجہ الطاف حسین حالؔی کے حالاتِ زندگی بیان کیجیے۔

سوال نمبر۳ : خواجہ الطاف حسین حالؔی کی تحریر کردہ سوانح عمریوں پر ایک نوٹ لکھیئے۔

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : ''مناجاتِ بیوہ'' اور ''چپ کی داد'' پر ایک نوٹ لکھیے۔

سوال نمبر۲ : خواجہ الطاف حسین حالؔی کی شاعرانہ خصوصیات رقم کیجیے۔

سوال نمبر۳ : خواجہ الطاف حسین حالؔی کی نظم نگاری کی خصوصیات کیا ہیں؟

03.09 حوالہ جاتی کتب

۱۔ تحقیق مطالعہ حالؔی	از	ظہیر احمد صدّیقی
۲۔ حالؔی بحیثیت شاعر	از	شجاعت علی سندیلوؔی
۳۔ سرسیّد اور ان کے نام وَر رُفقا	از	سیّد عبداللہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ
۴۔ مقدمہ شعروشاعری	از	مرتّبہ وحید قریشی

03.10 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ حالؔی کے والد کے انتقال کے وقت حالی کی عمر نو سال تھی۔

﴿۲﴾ حالؔی دہلی کے مدرسہ حسین بخش میں شریک ہوئے۔

﴿۳﴾ حالؔی کی نظم مسدّس مدوجزر اسلام ۱۸۷۹ء میں منظرِ عام پر آئی۔

﴿۴﴾ مجالس النّساء ۱۸۷۴ء میں لکھی گئی۔

﴿۵﴾ سرسیّد کی سوانح کا نام حیات جاوید ہے۔

﴿۶﴾ حالؔی نے فارسی شاعر شیخ سعدی شیرازی کی سوانح حیات ''حیاتِ سعدی'' کے نام سے لکھی۔

﴿۷﴾ مقدمۂ شعروشاعری اردو تنقید کی اوّلین کتاب ہے۔

﴿۸﴾ یہ شعر حالؔی کا ہے۔

﴿۹﴾ فرشتہ سے بہتر ہے انسان بننا

﴿۱۰﴾ حالؔی نے نظم نگاری کی ابتدا لاہور سے کی۔

﴿۱۱﴾ حبِّ وطن

﴿۱۲﴾ مناجاتِ بیوہ میں حالی نے عورتوں کے مسائل کو موضوع بنایا ہے۔

بلاک نمبر 02

اکائی 04	دُرگا سہائے سُرورؔ (عروسِ حُبّ ِوطن)	حنا یاسمین
اکائی 05	علّامہ اقبالؔ (سیّد کی لوحِ تربت)	محترمہ بی. بی. رضا خاتون
اکائی 06	اختر شیرانی ''او دیس سے آنے والے بتا''	ڈاکٹر ثروت خان

اکائی 04 : دُرگا سہائے سُرورؔ (عروسِ حُبِّ وطن)

ساخت

04.01 : اغراض ومقاصد

04.02 : تمہید

04.03 : دُرگا سہائے سُرورؔ کے حالاتِ زندگی

04.04 : دُرگا سہائے سُرورؔ کی نظم نگاری

04.05 : دُرگا سہائے سُرورؔ کی نظم ''عروسِ حُبِّ وطن'' متن

04.06 : دُرگا سہائے سُرورؔ کی نظم ''عروسِ حُبِّ وطن'' کی تشریح

04.07 : دُرگا سہائے سُرورؔ کی نظم ''عروسِ حُبِّ وطن'' کا تجزیہ

04.08 : خلاصہ

04.09 : فرہنگ

04.10 : نمونہ امتحانی سوالات

04.11 : حوالہ جاتی کتب

04.12 : اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

04.01 اغراض ومقاصد

اُردو زبان کے اہم نظم گو شعرا کی صف میں ایک اہم نام دُرگا سہائے سرورؔ جہان آبادی کا بھی ہے۔ آپ اس اکائی کے مطالعہ سے دُرگا سہائے سرورؔ جہان آبادی کی حیات وشخصیت کے اہم گوشوں سے بھی واقف ہوں گے اور اُن کی نظم گوئی کی انفرادی خصوصیات سے بھی روشناش ہوں گے۔ اسی اِکائی میں اُن کی مشہور نظم ''عروسِ حبِ وطن'' کے اصل متن کو بھی بطور اِقتباس شامل کیا گیا ہے۔ نظم کی اہم خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے اُس کا تجزیہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ تجزیے اور خصوصیات کی روشنی میں اس نظم کے اندازِ بیان سے بھی واقفیت کرائی جائے گی ساتھ ہی یہ بھی کوشش کی جائے گی کہ آپ کو اُن کی اس نظم کی تفہیم کے علاوہ اُن کی دیگر نظموں کے مفاہیم بھی سمجھ میں آسکیں گے۔ آپ کے علم میں اضافہ کی غرض سے سرورؔ کی تصانیف پر بھی روشنی ڈالی جائے گی۔ اسی اکائی میں سرورؔ کی نظموں کے موضوعات، اُسلوب، اندازِ بیان اور لب و لہجے سے بھی واقفیت کرائی جائے گی۔

04.02 تمہید

مولانا محمد حسین آزاؔد اور الطاف حُسین حالؔی نے شاعری میں جس مقصدیت کو فرغ دینے کی تحریک چلائی اس میں دیگر شعرا کی شمولیت میں سرور جہاں آبادی کا نام پیش پیش ہے۔ قدرت نے ان کو صنف نظم میں اعلیٰ تخلیقی صلاحیتیں عطا کی تھیں جس کی وجہ سے وہ اپنے عہد کی ایک منفرد آواز بن گئے۔ اُنہوں نے مختلف موضوعات پر نظمیں کہی ہیں۔ اپنی شاعری کے لئے اُنہوں نے روایتی انداز سے ہٹ کر موضوع کا انتخاب کیا۔ اُنہوں نے تاریخی شخصیات پر نظمیں لکھیں معاصر شخصیات کے مرثیے لکھے۔ فطرت کی تصویر کشی کی، فطرتِ انسان اور جذبات و احساسات کو گویائی عطا کی۔ سرورؔ کو مادرِ وطن ہندوستان سے والہانہ عشق تھا۔ اس لئے اُنہوں نے وطن کی عظمت کے گن گائے۔ اُن کے کلام کا ایک بڑا حصّہ اس مُلک کی آزادی اور خوش حالی کے ارمانوں کا آئینہ دار ہے۔ سرورؔ کے کلام میں ایک ایسا دھڑکتا ہوا دل ہے جس میں مادرِ ہند کی محبت وعظمت رچی بسی ہوئی ہے۔ انہوں نے عقیدت ومحبت سے سرشار ہو کر مادرِ وطن کی عظمت کے گیت گائے ہیں۔ اُن کی نظمیں ہندوستانی تہذیب وتمدّن، عقائد وروایات اور حُبّ الوطنی کے جذبہ سے عبارت ہیں۔ اس اکائی کا بنیادی مقصد سرورؔ کی حیات، شخصیت، ان کی شاعری کے مختلف پہلوؤں اور ان کی تصانیف سے واقف کرانا ہے۔ اس اکائی کے بغور مطالعے سے آپ اردو ادب کے اس اہم نظم نگار کے بارے میں اچھی واقفیت حاصل کرسکیں گے۔

04.03 دُرگا سہائے سُرورؔ کے حالاتِ زندگی

اصل نام درگا سہائے، شعروشاعری سے دل چسپی کی وجہ سے پہلے ''وحشتؔ'' تخلص اختیار کیا اور پھر بعد میں ''سرورؔ'' ہو گئے اور اسی تخلص سے مشہور بھی ہوئے۔ سرورؔ کی ولادت ضلع بلیا بھیت میں کیلاش ندی کے کنارے واقع قصبہ جہان آباد میں دسمبر ۱۸۷۳ء میں ایک معزّز سکسینہ کایستھ خاندان میں ہوئی تھی۔ ان کا خاندان اصلاً دہلی کا تھا۔ مغلیہ عہدِ حکومت میں شاہجہاں نے ان کے بزرگوں کو جہان آباد میں جاگیر عطا کی تھی اُن کے والد کا نام پیارے لال تھا جو پیشے کے اعتبار سے وَید تھے اور جن کا شمار شہر کے معزز رؤسا میں ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کو شعروشاعری کا بھی شوق تھا۔ کئی زبانیں جانتے تھے۔ کبھی کبھی اپنے گھر میں بھی شعری نشست منعقد کرلیا کرتے تھے۔ اس طرح سرورؔ کو ادبی ماحول اپنے ہی گھر میں ابتدائی دَور سے ملتا رہا۔

سرورؔ نے اردو، فارسی کی ابتدائی تعلیم اپنے گھر میں اپنے والد سے حاصل کی تھی۔ اس کے بعد اُنہیں قصبہ کے اُردو مڈل اسکول میں داخل کرادیا گیا۔ وہ نہایت ذہین اور بیدار مغز طالب علم تھے۔ اس لئے ہر سال اپنی جماعت میں اوّل آتے تھے۔ اُنہوں نے اسی اسکول سے اُردو مڈل کا امتحان ۱۸۹۰ء میں امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس کرلیا۔ مزید تعلیم کے لئے وہ جہان آباد سے باہر نہیں گئے بلکہ انگریزی کی تعلیم بھی اُنہوں نے جہان آباد سے ہی حاصل کی۔ سرورؔ کو شعروادب سے فطری لگاؤ تھا اور کتب بینی اُن کا شوق تھا۔ اُن کے نصاب میں ادب کے علاوہ تاریخ، ریاضی، طب، فلسفہ، منطق وغیرہ مضامین بھی پڑھائے جاتے تھے جنہیں وہ دل لگا کر پڑھتے تھے۔ اُنہیں فلسفہ، تصوّف اور قدیم وجدید تاریخ سے بھی دل چسپی تھی۔ اسی لئے اُن کے کلام میں تصوّف، فلسفہ اور تاریخی واقعات کا ذکر بھی پایا جاتا ہے۔

اُردو مڈل کا امتحان پاس کرتے ہی ۱۷ سال کی عمر میں سرورؔ کی شادی جہان آباد کے ایک معزز کایستھ خاندان میں کردی گئی۔ اُن کی بیوی کا نام شنکر دیوی تھا۔ شنکر دیوی حُسن صورت اور حُسن سیرت کے ساتھ نہایت مہذّب، سلیقہ شعار، سعادت منداور شوہر پرست خاتون

تھیں۔سرورؔ بھی اپنی اہلیہ کے اس قدر والہ وشیدا تھے کہ عشق کی حد تک اُنہیں چاہتے تھے اور بڑے پیار سے دیوی کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔یہی فریفتگی اُن کی اعلیٰ تعلیم کی راہ میں حائل ہوگئی کیوں کہ وہ جہان آباد کو چھوڑ کر باہر جانا نہیں چاہتے تھے۔سرورؔ نے ''زنِ خوش خو'' کے عنوان سے ایک عمدہ نظم بھی کہی ہے جس کے متعلّق قیاس کیا جاتا ہے کہ اُنہوں نے اس نظم میں اپنی اہلیہ شنکر دیوی کے خصائل اور اوصافِ حمیدہ کا ذکر نہایت خوب صورت لب ولہجہ میں کیا ہے۔پیش ہیں۔

گوری گوری ساق سیمیں ، پیاری پیاری ایڑیاں
قد چھریرا جسم سانچے میں ڈھلا نازک بدن
چھوٹے چھوٹے دانت کلیاں موتیا کی خوش نما
پتلے پتلے نرم و نازک ہونٹ برگ یاسمن
گورے گورے ہاتھوں میں تھیں دھانی دھانی چوڑیاں
پیارے پیارے بازوؤں میں ہلکے ہلکے نو رتن

شادی کے بعد سرورؔ قصبہ کے ایک سب پوسٹ ماسٹر سے انگریزی زبان کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔اُنہوں نے بہت جلد انگریزی سیکھ لی اور دو سال ہی میں انگریزی مڈل کا امتحان بھی پاس کرلیا۔اس کے بعد وہ اپنے طور پر بھی انگریزی ادب کی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہے۔وہ انگریزی زبان کے رومانی شعرا کیٹس ،شیلی اور براؤننگ کے کلام کا مطالعہ نہایت دل چسپی سے کرتے تھے۔اُنہوں نے انگریزی کی کئی بہترین نظموں کے اُردو میں ترجمے بھی کیے۔اُن کے یہ تراجم روانی،سلاست اور شگفتہ اُسلوب کے سبب طبع زاد معلوم ہوتے ہیں۔

سرورؔ کا آبائی پیشہ طبابت تھا۔ان کے والد حکیم منشی پیارے لال کا شمار اپنے دَور کے نام وَر اطبا میں کیا جاتا تھا۔جہان آباد اور قرب و جوار کے مریض علاج معالجہ کے لئے اُن سے رجوع کرتے تھے جن کا علاج وہ حسبِ ضرورت یونانی یا آیورویدک طریقے سے کرتے تھے۔اس لئے سرورؔ بھی فنِ طب میں دل چسپی لینے لگے۔جہان آباد میں طب کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں تھا اس لئے انہوں نے اپنے والد سے آیور ویدک اور یونانی طب کی تعلیم حاصل کی اور باقاعدہ طور پر علاج معالجہ کرنے لگے۔قدرت نے اُن کے ہاتھوں میں شفا عطا کی تھی۔دُور دُور سے لوگ اُن کے پاس علاج کرانے کے لئے آتے تھے۔سرورؔ نے طب کے پیشے کو کبھی ذریعہ معاش نہیں بنایا۔وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ طبیب کو رحم دل،کریم النفس اور خدا ترس ہونا چاہیے۔اُن کا خیال تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو یہ صفت اس لئے عطا کرتا ہے کہ وہ لوگوں کے دُکھ درد کو دُور کرے اور غریبوں کا علاج بھی خوش دلی سے کرے۔فنِ طب میں اُنہوں نے اس قدر مہارت حاصل کرلی تھی کہ ان کے والد بھی کبھی کبھی مختلف نسخوں میں ان سے مدد لیا کرتے تھے۔

سرورؔ بڑی حد تک معاشی تگ ودَو سے دُور رہے۔اس بے فکری کی وجہ سے اُنہوں نے پڑھنے لکھنے پر پورا اور برابر دھیان دیا۔ان کی نظمیں مختلف اخبارات ورسائل میں شائع ہوتی رہتی تھیں۔اخبار ''انیسِ ہند'' میں بھی ان کا کلام شائع ہوتا رہا۔ان کی فنی وتخلیقی صلاحیتوں سے متاثر ہوکر اخبار انیسِ ہند اور مطبع وِدیادرپن میرٹھ کے مالک رام چندر ویشیہ نے اُنہیں ۱۸۹۷ء میں میرٹھ بُلا لیا اور معقول مشاہرے کے عوض اخبار و مطبع کا اسسٹنٹ ایڈیٹر اور اسسٹنٹ مینیجر کے عہدہ پر فائز کردیا۔یہ ملازمت اُن کے مزاج اور طبع کے موافق نہ تھی اس لئے وہ ۱۸۹۸ء

میں اس سے دست بردار ہو گئے۔ سرورؔ کا ابتدائی کلام میرٹھ سے شائع ہونے والے رسائل کایستھ ہتکاری، آریہ سندیش اور انیسِ ہند میرٹھ میں شائع ہوتا تھا۔ شعروشاعری میں سرورؔ کے اساتذہ کے بارے میں مورّخوں اور تذکرہ نگاروں میں اختلافات ہیں۔ بعض کے مطابق انہوں نے کسی کی شاگردی اختیار نہیں کی تھی اور بعض کے مطابق وہ کرامت حُسین بہار، میر بیان و یزدانیؔ میرٹھی اور جنگ بہادر جنگؔ میرٹھی سے شعر گوئی میں مشورہ لیا کرتے تھے۔

ہلدور ضلع بجنور کے رئیس لالہ ڈال چند کی ایما پر راجہ والی نہٹور نے اُنہیں اپنے فرزند کا اتالیق مقرر کر دیا۔ سرورؔ نے اُن کے بیٹے کی تعلیم وتربیت کے ساتھ لالہ ڈال چند کو بھی شعر کہنا سکھا دیا۔ لالہ ڈال چند کی ایما پر انہوں نے چند ماہ سَو روپئے ماہ وار مشاہرے پر نہٹور کے راجا کے بچّوں کی تعلیم وتربیت کا کام بھی کیا۔ سرورؔ نے نہٹور میں چھ سات مہینے کی مدّت ہی گزاری تھی کہ انہیں اپنی اہلیہ کے بیمار ہونے کی اطلاع ملی۔ وہ فوراً جہان آباد آ گئے اور اپنی بیوی کا علاج کرنے لگے۔ نہ کوئی دوا کارگر ہوئی اور نہ دعاؤں ہی نے اثر کیا۔ آخر کار دسمبر ۱۸۹۹ء میں اُن کی اہلیہ کی وفات ہوگئی۔ اس صدمے نے اُن کی زندگی کی تمام مسرّتیں چھین لیں۔ بس اُن کی تسلّی اور اُن کی اُمّیدوں کا سہارا اُن کا ایک دو سال کا بیٹا واسودیو تھا۔ وہ اپنے بیٹے کی خاطر ملازمت چھوڑ کر گھر ہی پر رہنے لگے۔ بیوی کے داغِ مفارقت سے وہ اس قدر رنجیدہ وملول رہتے تھے کہ انہوں نے شعر گوئی ترک کر دی اور تقریباً تین سال تک ایک بھی شعر نہیں کہا۔ اس کے ساتھ ہی شراب نوشی شروع ہوگئی جو آخری ہچکی تک ساتھ رہی۔ بیوی کی وفات کا غم جب کچھ کم ہوا تو وہ اپنے قصبہ کے قریبی گاؤں فتح گنج غربی کے رئیس عبدالواحد خاں کے پسر عبدالواجد خاں اور پیلی بھیت کے رئیس ساہو منگل سین کے بیٹے دامودر داس کے اتالیق مقرر ہوئے اور درس تدریس کے فرائض انجام دینے لگے۔

رسالہ زمانہ، کان پور کے مدیر منشی دیانرائن نگم نے ۱۹۰۵ء میں اُنہیں کان پور بُلا لیا اور زمانہ کے مینیجر کی حیثیت سے اُن کی تقرری کر دی۔ وہ نظموں کا معاوضہ شراب کی نذر کر دیتے تھے اور طبابت کو ذریعہ معاش بنانا نہیں چاہتے تھے لہٰذا رفتہ رفتہ اُن کی مالی حالت بدتر ہوتی گئی۔ نومبر ۱۹۰۶ء میں سرورؔ کو اپنے اکلوتے بیٹے کے بیمار ہونے کی خبر ملی۔ وہ کان پور سے جہان آباد آ گئے۔ اُن کے بیٹے کو نمونیا ہو گیا تھا۔ وہ رات دن ایک کر کے اس کی تیمارداری اور علاج کرتے رہے مگر بیٹا جاں بر نہ ہو سکا، آخر کار ۱۹۰۶ء میں نو دس سال کی عمر میں اس کا بھی انتقال ہو گیا۔ رفیقۂ حیات کی وفات کے بعد بیٹے کے انتقال نے انہیں رنج ومحن کا مجسّمہ بنا دیا۔ اُنہوں نے خاموشی اختیار کر لی اور اُن کی آنکھوں کے آنسو خشک ہو گئے۔ اُن کے والد نے بیوی اور بیٹے کے انتقال کے غم کو بھلانے کے لئے اُس روز انہیں بہت زیادہ شراب پلا دی مگر اس شراب نے اُن کا غم غلط کرنے کے بجائے اُن کے غم میں اور اضافہ کر دیا۔ وہ اپنے جگر گوشہ کو نذرِ آتش کرنے کے بعد اپنے ایک دوست منشی عبداللہ خاں کے مکان میں نڈھال ہو کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے اپنے جواں مرگ بیٹے کے لئے ایک لوری ''دل بے قرار سو جا'' لکھی تھی۔

بیٹے کے غم سے شراب نوشی میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ دوپہر کو گھر سے نکل کر اپنے دوست بلدیو پرساد کی دکان پر جا بیٹھتے۔ اگر کوئی خط ہوتا تو اس کا جواب لکھ دیتے، اور اگر کسی نظم کا معاوضہ آ جاتا تو اس کی شراب منگوا لیتے اور پھر شراب اور تصوّر یار میں ڈوب جاتے۔ اس دَوران اُن کا کلام مخزن، زمانہ، تنویر الشرق کلکتہ، شمس بنگالہ کلکتہ، عصمت دلّی، ادیب الٰہ آباد، اُردوئے معلیٰ علی گڑھ، زبان دہلی وغیرہ میں شائع ہوتا تھا۔

سرورؔ کا مجموعۂ کلام انڈین پریس الٰہ آباد سے طبع ہونے والا تھا جس کا پروف پڑھنے کے لئے وہ ۲۹ر نومبر ۱۹۱۰ء کو جہان آباد سے الٰہ آباد کے لئے روانہ ہوئے۔ پیلی بھیت پہنچتے ہی ان کے سینے میں درد ہونے لگا۔ شراب نوشی کی کثرت کی وجہ سے ذات الجنب کا عارضہ لاحق

ہوگیا تھا۔علاج معالجہ اور تمام کوششوں کے باوجود اُن کی جان بچائی نہ جاسکی۔۳؍دسمبر ۱۹۱۰ء کو صرف ۳۹؍سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوگیا۔ سرورؔ کی وفات پر ان کے ہم عصر تمام شعرا و اُدبا نے اپنے رنج وغم کا اظہار کیا۔

سرورؔ جدید اُردو شاعری کی تحریک کے ایک اہم رکن اور ممتاز شاعر تھے۔اُن کا شمار اُردو نظم کے اوّلین معماروں کیا جاتا ہے۔اُن کی نظموں کے موضوعات اپنے عہد کے شعرا سے ہم آہنگ بھی ہیں اور منفرد بھی۔ان کا ایک اہم کارنامہ یہ بھی ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز تک اُردو شاعری کے جو قدیم وجدید رجحانات ایک دوسرے سے مختلف ومتضاد تھے انہیں وہ بڑی حد تک نہ صرف قریب لائے بلکہ اُنہیں ایک دوسرے میں پیوست بھی کر دیا۔دراصل انہوں نے جدید شاعری کو جلا بخشنے اور مقبولِ خاص وعام بنانے کے لئے خارجی اور داخلی عناصر کے ساتھ شاعری کے قدیم وجدید تصوّرات واقدار کے خوش گوار امتزاج سے ایک نئے اُسلوب، رنگ وآہنگ اور لب ولہجے کی بنیاد ڈالی۔یہی نہیں بلکہ مواد اور موضوع کی نئی وسعتوں سے بھی اُردو شاعری کو روشناس کرایا۔سرورؔ نے دیگر صنفِ سخن کی بہ نسبت نظمیں زیادہ کہی ہیں۔ان کے کلام کا ایک بڑا حصّہ قوم ووطن کی محبت اور عظمت کے نغمات پر مشتمل ہے۔وہ قوم ووطن کا ذکر کئی پہلوؤں سے کرتے ہیں۔اُنہیں مادرِ وطن ہندو ستان سے والہانہ عشق ہے۔وہ اس سرزمین کے چپّے چپّے اور ذرّے ذرّے سے محبت کرتے ہیں اور اسی وارفتگی کی وجہ سے اُن کے کلام میں ایران وعرب کی روایتی اشیا کے ساتھ خالص ہندوستانی عناصر کی بھی جلوہ گری ہے۔اُن کے کلام میں ہندو دیوی دیوتا، ہندوستان کے پہاڑ، دریا، اشیا، پھل پھول، چرند پرند، آب وہَوا، جھرنے، جھیل، موسم اور دیگر اشیا اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ نظر آتی ہیں۔یہی نہیں اُن کے یہاں ہندوستان کی قدیم وجدید تاریخ، روایات، رسوم وعقائد اور تہذیب وتمدّن کا ذکر بھی نہایت گہرائی اور گیرائی کے ساتھ نظر آتا ہے۔وہ روزمرّہ کے واقعات ومسائل کو دل چسپ طریقے سے بیان کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔اُنہیں تصنّع، بناوٹ اور مبالغہ آرائی پسند نہیں۔اسی لئے اُن کا کلام حقائق کا آئینہ دار ہے۔وہ الفاظ کے انتخاب میں بہت احتیاط برتتے ہیں۔اُنہیں اُردو اور فارسی کے ساتھ ہندی زبان وادب سے بھی واقفیت تھی۔اسی لئے وہ فارسی تشبیہات وتراکیب اور ہندی زبان کے الفاظ کے استعمال سے کلام میں زور واثر اور چستی وروانی پیدا کرنے میں قدرت رکھتے تھے۔

سرورؔ کے مجموعۂ کلام جامِ سرور، خم خانۂ سرورؔ اور خم کدۂ سرورؔ کے علاوہ کئی کتابچہ جیسے خونِ ناحق، نیرنگِ قلق، دشنۂ قلق، نشترِ ماتم، نالۂ خونچکاں، کے علاوہ منظوم ڈراما 'شیون' اور ناول 'ہنگامۂ محشر اور وصال' بھی زیورِ طبع سے آراستہ ہوکر منظرِ عام پر آچکے ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱﴾ سرورؔ کا ابتدائی تخلص کیا تھا؟

﴿۲﴾ سرورؔ کی پیدائش کہاں ہوئی؟

﴿۳﴾ سرورؔ کا آبائی پیشہ کیا تھا؟

﴿۴﴾ شنکر دیوی کون تھیں؟

﴿۵﴾ ''زمانہ'' کان پور کے مدیر کون تھے؟

﴿۶﴾ سرورؔ کا انتقال کب ہوا؟

﴿۷﴾ سرورؔ کی شاعری کا خاص موضوع کیا ہے؟

04.04 دُرگا سہائے سُرورؔ کی نظم نگاری

سرورؔ کا شمار اردو کے اوّلین نظم گو شعرا میں ہوتا ہے۔ سرورؔ جہان آبادی نے مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کی اور نظم کو نئے نئے عنوانات سے مالا مال کیا۔ انہوں نے مذہبی اور تاریخی واقعات پر بھی کئی بہترین نظمیں کہی ہیں۔ اُن کی نظمیں حُسنِ فطرت اور مظاہرِ قدرت کی بہترین تصاویر ہیں۔ انہوں نے انگریزی زبان کی کئی نظموں کا منظوم ترجمہ بھی بڑی چابک دستی سے کیا ہے۔ سرورؔ اُس دَور کے شاعر ہیں جب ہندوستان میں اصلاحی اور سیاسی تحریکیں بڑی حد تک آپس میں مل جُل کر سرگرمِ عمل تھیں۔ حبّ الوطنی کا تصوّر بڑی تیزی سے پروان چڑھ رہا تھا، سیاسی جدّ و جہد تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی اور ہندوستان انقلاب و آزادی کے دَور میں داخل ہو رہا تھا۔

سرورؔ کے جسم کا خمیر اسی مُلک کی مٹّی سے اُٹھا تھا۔ انہوں نے اسی مُلک اور اسی ماحول میں اپنی آنکھیں کھولیں تھیں۔ وہ یہیں پلے بڑھے اور جوان ہوئے تھے۔ یہاں کی فضاؤں میں رچے بسے جذبات و احساسات اور فکر و شعور نے ان کی پرورش کی تھی۔ اسی لئے انہیں اس ماحول اور اس مُلک کے ذرّے ذرّے سے لگاؤ تھا۔ دراصل سرورؔ کی شاعرانہ زندگی کا آغاز مُلک ہند کی آزادی اور خوش حالی کے ارمانوں سے ہوا ہے۔ یہی جذبات و احساسات اور یہی ارمان اُن کے شعری وجدان کے لئے تحریک بن کر اُبھرتے ہیں۔ اُن کے یہاں انہیں ارمانوں اور جذبات کی نمود مختلف شکلیں اختیار کر لیتی ہے۔ کبھی یہ جذبہ خیر سگالی، امن، انصاف اور مساوات کا مطالبہ بن کر اُبھرتا ہے تو کبھی سامراجی نظام اور ظلم و بربریت کے خلاف شعلے کی مانند ظاہر ہوتا ہے، کبھی ماضی کی عظمت و رفعت کی یاد دلاتا ہے تو کبھی قومی روایات اور اعلیٰ اقدار کی پامالی کے پُر درد مرثیہ کی شکل میں ظاہر ہونے لگتا ہے۔ سرورؔ اپنے آبا و اجداد کے بے مثال کارناموں کو اپنے احساسات میں تازگی اور زندگی میں حرکت و گرمی پیدا کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور اُن پر فخر بھی کرتے ہیں۔ پیش ہے اُن کی ایک نظم ''خاکِ وطن'' کا ایک بند۔

آہ! اے خاکِ وطن! اے سرمۂ نور نظر
آہ! اے سرمایۂ آرائشِ جان و جگر
تیرے دامن میں شگفتہ تھے کبھی قدرت کے پھول
گُندھ رہے تھے تیری چوٹی میں کبھی وحدت کے پھول
جب مسلّط خلق پر تھی خوابِ غفلت کی گھٹا
موتی برساتی تھی تجھ پر ابرِ رحمت کی گھٹا

سرورؔ اُردو کے پہلے ایسے شاعر ہیں جنہوں نے وطن کے لئے مقدّس ماں اور دیوی کا تصوّر پیش کیا۔ عقیدہ کی طہارت اور خلوص و محبت نے اُن کے نغمات میں عبادت کی شان پیدا کر دی ہے یعنی اُن کی حُبّ الوطنی ایک پرستارِ وطن کی پرستش کے درجہ کی چیز بن کر سامنے آتی ہے۔ انہوں نے اپنی ایک نظم بہ عنوان ''مادرِ ہند'' میں وطن کو مادرِ مشفق، مادرِ دل سوز، مادرِ دَم ساز اور خلد کی پاک دیوی جیسے مقدّس القاب سے مخاطب کیا ہے۔ دیکھئے وہ کس احترام سے گویا ہوتے ہیں۔

ظلِّ شفقت ہو ترا اے مادرِ مشفق ! دراز — خاک پر کیا کیا تری، تیرے مکینوں کو ہے ناز
سرزمینِ عیش ہے اے مادرِ دل سوز! تو — آرزوؤں کی ہے بزمِ انبساط افروز! تو
آسماں کے نور کی ہے جلوہ گاہِ ناز تو — خلد کی ہے پاک دیوی، مادرِ دَم ساز تو

یہی نہیں انہوں نے مادرِ وطن کولکشمی، سرسوتی اور دُرگا دیوی کے پیکر میں ڈھال کر اپنی بے پناہ عقیدت ومحبت کا ثبوت بھی فراہم کیا ہے وہ کہتے ہیں۔

تیرا دیواستھان دیوی دل کے کاشانے میں ہے   تیری تصویرِ مقدّس ہر صنم خانے میں ہے
لکشمی تو ہے، زمانے میں اُجالا ہے ترا   ہر کنول کا پھول ، پانی میں شوالہ ہے ترا
سَرسَتی کا روپ ہے ، دُرگا کا ہے اَوتار تو   نطق و دانش کی ہے دیوی ، مادرِ غم خوار تو
اُف! یہ سُندر چھب تری، یہ سانولی صورت تری
دل کے مندر کی ہے زینت موہنی مورت تری

حُبِّ وطن کے اظہار کے جومختلف طریقے سروؔر نے اپنائے ہیں وہ طریقے اُردو کے کسی شاعر کے یہاں نظر نہیں آتے۔گلِ لالہ ایک قِسم کا سُرخ پھول ہوتا ہے جس کے اندر سیاہ داغ ہوتا ہے۔سروؔر اپنی ایک مشہور نظم ''لالۂ حرا'' میں گلِ لالہ کومخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر مجھے صحرا میں تھوڑی سی جگہ مل جائے اور تیرا ساتھ میسّر ہو جائے تو مَیں یہ واضح کرنے کی کوشش کروں کہ مَیں بھی تیری ہی طرح ایک شرارِ غم ہوں جس کے سینے میں حُبِّ وطن کے تپ دروں کے پھپھولے اور جگر میں تیری ہی طرح سیاہ داغ ہیں یعنی میرے سینہ وجگر وطن کی بہارِ باغ کے بہترین نمونے ہیں۔سروؔر ایک سچّے وطن پرست شاعر ہیں۔اُن کے یہاں حُبِّ وطن کا جذبہ نہایت عظیم اور بلند ہے۔وہ شمعِ انجمن کی طرح سوزِ غمِ وطن میں ہمیشہ جلتے رہتے ہیں جس کا اظہار انہوں نے شمعِ انجمن کومخاطب کرتے ہوئے اپنی ایک نظم ''شمعِ انجمن'' میں اس طرح کیا ہے۔

راتوں کو جس طرح تُو جلتی ہے انجمن میں   جلتا ہوں مَیں بھی یوں نہیں سوزِ غمِ وطن میں
لپٹے ہوئے ہیں شعلے دونوں کے پیرہن میں   آتش بجاں ہیں دونوں اس محفلِ کہن میں
یعنی گداز الفت دونوں کے ہے دلوں میں

سروؔر اپنے عہد کے سیاسی شعور کی بیداری اور سماجی ترقّی کے احساس سے پوری طرح متاثر تھے۔جغرافیائی حدود کی وسعت،تعلیم کے فروغ اور اخبار ورسائل کی اشاعت سے سیاسی شعور اور قومی ہم آہنگی میں بتدریج اضافہ ہورہا تھا۔معاشی بدحالی، بے انصافی، جبر، استبداد اور استحصال نے ہندوستانیوں کوافلاس وپس ماندگی میں زندگی گزارنے کے لئے مجبور کر دیا تھا۔ہر ہندوستانی احساسِ کمتری کا شکار تھا۔ایسے نازک اور ابتر حالات میں سامراجی طاقتوں کے خلاف ردِّعمل ہونا ہی تھا جسے سروؔر بھی شدّت سے محسوس کر رہے تھے۔اسی ردِّعمل کے تحت سروؔر نے اُس وقت ہندوستانیوں میں بیداری پیدا کرنے کے لئے مادرِ وطن کی عظمت کے گیت گائے۔ہندوستان کی عظمتِ رفتہ کی داستانیں نہایت موثر پیرائے میں پیش کیں۔اُن کی نظمیں خاکِ وطن، لکشمی جی، سرزمینِ وطن، نیرنگِ زمانہ، قومی نوحہ، چتّوڑ کی گذشتہ عظمت، شیونِ عروس وغیرہ انہیں عظیم ہستیوں کے کارناموں سے بھری ہوئی ہیں سروؔر کی حُبّ الوطنی مذہب کی طرح عظیم ہے۔وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین تفریق کے قائل نہیں۔وہ رنگ ونسل، ذات پات، فرقہ ومذہب، علاقہ وزبان سے بالاتر ہوکر وطن ہند سے محبت کرتے ہیں۔وہ جس شان و شوکت سے ہندو عہد کے ہندوستان کی عظمت کے گیت گاتے ہیں۔وہ اُسی خلوص دل سے اسلامی عہد کے ہندوستان کا تذکرہ بھی کرتے ہیں۔انہوں نے مغلیہ عہد کی تنزّلی اور پامالی کا ذکر نہایت دردانگیز لہجے میں کیا ہے۔انہیں صرف ایک عظیم سلطنت کے ختم ہونے کا افسوس نہیں تھا بلکہ ایک بے مثل تہذیب اور عظیم کلچر کے مٹ جانے کا شدید ملال تھا۔وہ کہتے ہیں۔

جس پہ لہرایا گیا صدیوں تک اسلامی نشاں نذرِ طوفاں ہو گیا وہ تختۂ عہدِ کہن
خانہ ویرانی برستی ہے دَر و دیوار پر نقشِ عبرت اب ہیں آثارِ صنادیدِ کہن
رزم میں تھی گُل کھلاتی جن کی تیغِ خوں فشاں اُن کے مرقد پر ہے پھولا لالۂ خونی کفن

سرورؔ کی اس نظم میں مناظرِ فطرت کی رنگینی، کیف و مستی اور دل آویزی اپنے شباب پر ہے۔ انہوں نے یہاں فطرت کے اُن پہلوؤں کو بڑی چابک دستی سے اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے جن سے ذوقِ جمال اور احساسِ حُسن کی تسکین بھی ہوسکتی ہے۔ شبِ ماہ ہو یا تاروں بھری رات، شگوفوں کا چٹکنا ہو یا گلوں کا تبسّم، نسیمِ سحر کے جھونکے ہوں یا پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو، برسات کی پھوہاریں ہوں یا قوسِ قزح کی رنگینی، کویل کی کوک ہو یا پپیہے کی پی، گُلگونۂ شفق ہو یا سرمئی شام غرض ہر مناظرِ فطرت اور ہر مظاہرِ قدرت نے سرورؔ کے شعری وجدان کو جلا بخشی۔ اُنہوں نے اپنی نظموں میں دل فریب اور دل نواز نظاروں کی تصاویر ایسی فن کارانہ چابک دستی سے کھینچی ہیں کہ عروسِ فطرت سولہ سنگار کیے ہوئے جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ اُن کی نظموں کا ہندوستانی پس منظر اور ماحول ان تصاویر میں اس قدر جمالیاتی کیف و رنگ بھر دیتا ہے کہ قاری اور سامع پر محویت سی طاری ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی ایک نظم ''فضائے برشگال'' میں موسمِ باراں میں فطرت کے خدوخال کو کس طرح اُبھار کر اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں ملاحظہ فرمائیے۔

اُٹھا وہ جھوم کے ساقی چمن میں ابرِ بہار چٹک رہے ہیں شگوفے برس رہی ہے پھُوار
ترانہ ریز ہے یوں شاخِ سرو پر قمری کہ جیسے گاتی ہو مدھ بن میں کوئی سُندر نار
حنائی پنجہ ہے یوں شاخ شاخ لالہ و گُل نئی دُلہن کی ہوں جیسے ہتھیلیاں گُل نار
ہے موتیوں کی لڑی یا قطار بگلوں کی ہَوا میں اُڑتے ہیں جگنو کہ چھوٹتے ہیں شرار

سرورؔ کی شاعری عشق مجازی کے جذبات سے بھی معمور ہے۔ اُن کی متعدّد نظمیں وارداتِ قلب، جذبات و احساسات، ہجر و وصال، حُسن و عشق کے راز و نیاز اور دل و دل بر کے ناز و انداز کی متنوّع کیفیات کی ترجمان ہیں۔ سرورؔ ماورائی عشق کے قائل نہیں۔ اُن کا عشق خیالی اور عارفانہ نہیں بلکہ وہ پوری طرح جسمانی یا زمینی ہے یا جس کا تعلّق جسم و جمال سے ہے۔ اُن کے یہاں سوقیانہ پن، ابتذال، لذّت پرستی اور سستی جذباتیت نہیں پائی جاتی۔ اُن کے یہاں عشق کے پاکیزہ جذبات و احساسات کے ساتھ جسمانیت کی جلوہ گری ہے۔ اُن کی محبوب کوئی آسمانی شے یا تخیّلی پیکر نہیں بلکہ اسی دنیا کی پروردہ گوشت پوست کی عام عورت ہے۔ وہ عورت کو حُسن و خوبی کا مجسمہ اور قدرت کا بہترین مظہر تصوّر کرتے ہیں۔ اُنہوں نے اپنے محبوب کے سراپا، اس کا قد اس کا لباس، اس کی چوڑیاں، نورتن اور بدن سے اُٹھتی ہوئی مسحور کن خوشبو کی دل فریب اور دل گداز انداز میں تصویر کشی کی ہے۔ اس بابت چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

گوری گوری ساق سیمیں ، پیاری پیاری ایڑیاں
قد چھریرا جسم سانچے میں ڈھلا نازک بدن
چھوٹے چھوٹے دانت کلیاں موتیا کی خوش نما
پتلے پتلے نرم و نازک ہونٹ برگ یاسمن

گورے گورے ہاتھوں میں تھیں دھانی دھانی چوڑیاں
پیارے پیارے بازوؤں میں ہلکے ہلکے نو رتن

کلامِ سرورؔ مادی حُسن کی بہترین اور مکمّل تصاویر کے لئے اپنی مثال آپ ہے۔ وہ جسمانی سکون کو سب سے بڑی نعمت سمجھتے ہیں۔ اُن کے نزدیک روحانی کیفیات کی بہرہ مندی تصوّف، ماورائی اشیا یا روایتی نظام سے نہیں بلکہ عشق مجازی ہی سے حاصل ہوتی ہیں وہ کہتے ہیں۔

بھینی بھینی بس کے آتی تھی تنِ نازک سے بو صانعِ قدرت نے صندل کا بنایا تھا بدن

سرورؔ قومی رہنماؤں اور مُلک وقوم کے جاں نثاروں، شاعروں، ادیبوں کی بہت قدر کرتے تھے۔ انہوں نے ایسی ہی چند ہستیوں کی وفات پر نہایت پُر درد مراثی بھی کہے ہیں، سرورؔ کے یہ مراثی محض آنسوؤں کے سیلاب، نالۂ وشیون اور سینہ کوبی تک ہی محدود نہیں بلکہ مرحومین کی شخصیت، سیرت، صفات واخلاق کے بہترین ترجمان ہیں۔ لالہ لاجپت رائے کی موت ایک قومی سانحہ تھی۔ اُن کا شمار کاروانِ آزادی کے رہنماؤں میں کیا جاتا تھا۔ اُن کی وفات پر سرورؔ نے جو مرثیہ لکھا اس کا ایک بند ملاحظہ کیجیے۔

اے محبِّ قوم اے سرمایۂ جانِ وطن مرحبا اے نازشِ اجزائے ارکانِ وطن
حبذا اے جلوہ افروزِ شبستانِ وطن آفریں صد آفریں اے جوہرِ کانِ وطن
ہو کے طوفاں میں اسیرِ حلقۂ گرداب تو
بن کے چمکا تاجِ شہرت کا دُرِ نایاب تو

قومی رہنماؤں کے ساتھ ساتھ سرورؔ نے اپنے معاصر ادبا اور شعرا پر بھی مرثیہ کہے ہیں۔ نواب محسن الملک، محمد حسین آزاد اور داغؔ دہلوی وغیرہ پر ان کے شخصی مرثیے ملتے ہیں۔ اس طرح کے مراثی میں محمد حسین آزاد کی وفات پر لکھا گیا مرثیہ سب سے زیادہ رقت آمیز اور پر درد ہے۔ اس کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کو شاعر نے اپنا کلیجہ نچوڑ کر رکھ دیا ہے۔ پیش ہے اس مرثیہ کا ایک بند۔

اَے دیوانے کہاں پیدا ہیں اب روشن دماغ
ہوگئی مرنے سے تیرے بزم دِلّی بے چراغ
چٹکیاں پہلو میں لے گا کس کا اندازِ بیاں
کس کی باتیں اب چبھیں گی بن کے دل میں برچھیاں
آہ یوں کھینچے گا نظم و نثر کی تصویر کون؟
اپنے دیوانوں کو پہنائے گا اب زنجیر کون؟

سرورؔ ایک زندہ دل انسان تھے۔ انہوں نے کائنات اور زندگی کے حقائق کو نہ صرف بہت قریب سے محسوس کیا بلکہ اُن کی گوناگوں حقیقتوں اور مسائل پر سنجیدگی سے غور بھی کیا۔ وہ انسان کو صرف عاشق، صوفی، رشی، مُنی یا تارک الدنیا ہی کے روپ میں نہیں دیکھتے بلکہ دنیا میں رہنے بسنے اور دنیا والوں میں دل چسپی لینے والے انسان کی حیثیت سے بھی دیکھتے ہیں۔ اسی لئے ان کے یہاں زندگی صرف جوانی اور غم صرف غمِ عشق تک محدود نہیں۔ اُن کی بیش تر نظمیں طفلی کی معصومیت، جوانی اور شباب کی اُمنگوں کا آئینہ دار ہیں۔ عہدِ طفلی میں نہ تو تہذیب و تمدّن کی ملمع کاری ہوتی ہے اور نہ کسی قسم کا تصنّع۔ دیکھئے سرورؔ نے اپنی اک نظم ''بچپن کی یاد'' میں عہد طفلی کی تمنّا کس انداز میں کی ہے۔

پھر خاک کا گھروندا آنگن میں مَیں بنا لوں چھوٹی سی اپنی کشتی پانی میں پھر بہا لوں
طفلی کے پیارے پیارے معصوم گیت گالوں پھر بانسری بجا لوں ، پھر جھُنجھُنا بجا لوں
دو دن کو اے جوانی دے دے اُدھار بچپن

سرورؔ نے چند رباعیات بھی کہی ہیں۔انہوں نے اگر چہ نئے موضوعات پر بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن اُن کی بیش تَر رباعیوں کے موضوعات روایتی ہیں۔نمونہ کے طور پر ان کی یہ ایک رباعی دیکھیے۔

دل بجھ گیا دل کے داغ اب تک نہ بجھے سوز الم فراغ اب تک نہ بجھے
تھی سینہ میں جو ہوس دھواں بن کے اُڑی محفل کے مگر چراغ اب تک نہ بجھے

سرورؔ نے انگریزی اور سنسکرت زبانوں کی کئی مشہور نظموں کے ترجمے بھی کیے ہیں۔اکسیرِ سخن، وقتِ اَجل، سالِ گزشتہ، مرغابی، ترانۂ خوب، خاتمۂ ہستی، وصفِ زبانی، رویائے اکبر اور آنے والی گھڑی اُن کے بہترین منظوم تراجم ہیں۔سرورؔ کی شاعرانہ صلاحیتوں کی قدر کرتے ہوئے ان کے معاصرین نے ان کی بلندی کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

''سرورؔ ان شعرا میں سے تھے جنہوں نے موجودہ دَور کی شاعری کی طرح ڈالنے میں حصہ لیا اور جن کی خدمات کو اردو زبان کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔سرورؔ کے کلام کی مستی ایک ایسی چیز ہے جو ہمیشہ زندہ رہے گی۔''

(نیاز فتح پوری)

''درگا سہائے سرور جہاں آبادی اردو شاعری کے ان معماروں میں ہیں جن کی روح ہندوستانی، مزاج شاعرانہ، ذوق جمالیاتی اور نقطۂ نظر وسیع تھا۔''

(احتشام حسین)

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۸﴾ سرورؔ نے شاعری کی کس صنف پر خاص توجہ دی؟
﴿۹﴾ ''خاکِ وطن'' کس کی نظم ہے؟
﴿۱۰﴾ ''جب مسلّط خلق پر تھی خواب غفلت کی گھٹا'' کا مصرع ثانی کیا ہے؟
﴿۱۱﴾ سرورؔ نے وطن کو کس کس روپ میں دیکھا ہے؟
﴿۱۲﴾ ''گلِ لالہ'' کیا ہے؟
﴿۱۳﴾ سرورؔ نے کس طرح کے مرثیے لکھے ہیں؟
﴿۱۴﴾ دوسری زبانوں سے ترجمہ کی گئی سرورؔ کی کوئی پانچ نظموں کے نام لکھئے۔

04.05 دُرگا سہائے سُرورؔ کی نظم ''عروسِ حُبِّ وطن''، متن

آ! اَے عروسِ حُبِّ وطن ! میرے بَر میں تو — آنکھیں تری تلاش میں ہیں محوِ جُستجو
آ! اَے نگار تُجھ کو گلے سے لگاؤں میں — آ مُجھ سے ہم کنار ہو اے شوخِ خوب رو!
وہ دِن خُدا کرے کہ مناؤں شبِ وصال — گردن ہو تیری اور میرے دستِ آرزو
زانو ہو تیرا اور سرِ شوریدہ ہو مِرا — میرا مشامِ جاں ہو، تری زُلفِ مُشک بو
تیری شرابِ عشق کا آنکھوں میں ہو سرور — خلوت میں ہو نہ ذکرِ مَے و شیشہ و سبو
لپٹوں جو بے خودی میں تُجھ سے شبِ وصال — بانہیں ترے گلے میں ہوں، لب پر یہ گفتگو
ٹوٹیں وہ پاؤں، جن کو نہ تیری تلاش ہو — پھوٹے وہ آنکھ، جس کو نہ ہو تیری جُستجو
وہ گھر ہو بے چراغ، جہاں تیری ضَو نہ ہو — وہ دل ہو داغ، جس میں نہ ہو تیری آرزو
دنیا و آخرت میں نہ انجام ہو بہ خَیر — تیرے سِوا جو غَیر کی ہو مُجھ کو جستجو
حُوروں پہ میں مروں تو جہنم نصیب ہو — کافِر ہوں میں، جو مُجھ کو بتوں کی ہو آرزو
ناقوس اور اذاں میں نہیں قیدِ کُفر و دیں — اُس لے لئے، کہ جِس کا پرستِش کدہ ہے تو
گنگا نہائے شیخ اگر تیرا اِذن ہو — تیرا اشارہ ہو تو برہمن کرے وضو
تیرا طریقِ عِشق ہی ایمان ہے مرا — تیرے فدائیوں میں ہوں اے شوخِ خوب رُو

جلوہ نہ ہو کِسی بُتِ رعنا کا سامنے
وہ دِن خُدا کرے کہ ہو آنکھوں میں تو ہی تو

04.06 دُرگا سہائے سُرورؔ کی نظم ''عروسِ حُبِّ وطن'' کی تشریح

سرورؔ کے جذبۂ حُبُّ الوطنی کی یہ خوبی ہے کہ وہ وطن کا ترانہ مختلف اور متنوّع طریقے سے گاتے ہیں۔ان کے یہاں وطن کا تصوّر صرف عظمتوں اور خوبیوں کا اظہار نہیں ہے بلکہ وہ وطن کو ''ماں''، ''دیوی'' اور ''محبوبہ'' جیسی شکلوں میں بھی دیکھتے ہیں۔اس نظم میں بھی سرورؔ نے وطنی محبت کے گن گائے ہیں اور وطن کو محبوبہ کی شکل میں مجسم طور پر دیکھا ہے۔اس کے سراپا اور اس کے حُسن کی رنگینی و رعنائی کا بیان اس طرح کیا ہے جیسے کوئی شاعر اپنے محبوت کے سراپا کا ذکر کرتا ہے اور حجلۂ عروسی کی مختلف کیفیات سے دوچار کراتا ہے۔

وطن کو محبوبہ اور پھر دلہن کے طور پر تصور کرتے ہوئے سرورؔ کہتے ہیں کہ اے حُبِّ وطن کی دلہن آ اور مجھے اپنی زوجیت میں قبول کر لے۔ مجھے اپنا شریکِ حیات بنا لے۔کیوں کہ نگاہیں تیری تلاش میں ہیں اور مری خواہشیں تجھ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔میرے دل کی رفیق آ! میری خواہش ہے کہ میں تجھے گلے سے لگا لوں۔مجھ میں سما جا، میرے اندر ڈوب جا۔اے روشن جمال مجھ سے ہم کنار ہو جا۔خدا کرے کہ وہ رات جلد از جلد آئے جب میں تیری قربت حاصل کر تیرے ساتھ وصل کے مزے لوں، تیرے گلے میں میری باہوں کے ہار ہوں اور میرے دل و دماغ میں تیری خواہش اور آرزو ہو اور اسی کے ساتھ تیرا اور میرا ملاپ ہو۔اے وطنِ جانِ جاناں تیرے زانو پر میرا پریشاں حال سر رکھا ہو اور

تیری مہکی ہوئی زلفوں سے میرا شوریدہ سر معطر ہو رہا ہو۔ میں صرف تیری ہی آنکھوں میں خمار کے نظارے نہ دیکھوں بلکہ میری آنکھوں میں تیری چاہت والفت کی شراب موجود ہو اوراس میں تیرا ہی خمار موجود ہو۔ جب جب مجھے تیرے ساتھ تنہائی کے مواقع میسر ہوں تب جام وسبو کی باتیں نہ ہوں بلکہ تیری شرابِ عشق کی داستاں ہو۔ اگر شبِ وصل میسر ہو اور جذبۂ بے اختیاری میں مَیں تجھ سے لپٹ جاؤں اور میرے ہاتھ تیرے گلے میں پڑے ہوں تب میری زبان پر یہ کلمات ہوں کہ اے میری محبوب! میری عروسِ حب وطن جن پیروں کو تیری تلاش نہ ہوں، جو قدم تیری عظمت ووقار کے لئے نہ اُٹھیں تو وہ بے مقصد ہیں اوران کا ٹوٹ جانا بہتر ہے۔ وہ آنکھ جس میں تیری چاہت کے نظارے نہ ہوں جن میں تیرے عشق کے شرارے نہ تیر رہے ہوں وہ پھوٹ جانیں کے لائق ہیں۔ اے میری محبوب! جس گھر میں تیری چاہت، تیرا قرب، تیری عظمت کے گن نہ گائے جاتے ہوں، تیری الفت کی روشنی جس گھر میں موجوں نہ ہو وہ گھر گھر نہ رہے۔ اس میں روشنی کرنے والا کوئی نہ رہے اور وہ ہمیشہ کے لئے تاریکی کے گرت میں ڈوب جائے۔ اسی طرح جس دل میں تیری رفاقت نہ ہو اور تجھ سے محبت نہ رکھتا ہو، جس دل میں تیرے لئے جذبات نہ مچلتے ہوں وہ بھی داغ دار ہو جائے۔ شاعر دعوے کے ساتھ کہتا ہے کہ میرے دل میں صرف تیری ہی چاہت ہے۔ ما سوا تیرے کسی اور کا تصوّر بھی میرے دل میں نہیں آ سکتا اور یہ بات بالکل سچ ہے اگر اس میں کسی قسم کا جھوٹ یا فریب شامل ہو تو دنیا وآخرت دونوں جہان میں میرا انجام بخیر نہ ہو۔ انسانی حُسن وجمال کی بات ہی کیا اگر بہشت کی حور بھی تیرے مقابل ہو تو میں تیرا ہی انتخاب کروں۔ اگر میرے دل میں اس وقت بھی ذرا سے وسوسہ آئیں تو مجھے دوزخ نصیب ہو اور اگر دنیاوی بتانِ عشق میں مبتلا ہوؤں تو مجھے آواگون کی دولت نصیب نہ ہو بلکہ کافر کی موت مروں۔ جس کے دل میں تیری محبت اور تیرا عشق موجود ہو اس کے لئے سنکھ کی آواز اور اذان کی آواز میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ جس کے اندر تیری چاہت کے جلوہ موجود ہوں وہاں پر مذہبی تفریق بے معنی ہو جاتی ہے۔ یہاں پر شاعر قومی یکتا کا درس دے رہا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ جس کے لئے تو لائق عبادت ہو جائے پھر اس کے اندر ہندو مسلم، کفر وایماں کا فرق نہیں رہ جاتا۔ تیری چاہت اور تیرے عشق میں سب ایسے رنگ جائیں کہ شیخ گنگا اشنان کرے اور برہمن وضو کے ذریعہ نجات حاصل کرے۔ یعنی باہمی میل جول اور مساوات کی ایسی مثال قائم ہو کہ حاسد رشک کریں۔ مذہبی دوریاں اور تفرقے بالکل ختم ہو جائیں۔ اے میری محبوب وطن تیرا عشق ہی مرا ایمان ہے اور میری خواہش ہے کہ میں تیرے جاں نثاروں میں گنا جاؤں اور میرا شمار تجھ پر فدا ہو جانے والوں کی صف میں ہو۔ خدا کرے کہ وہ دن بھی آئیں اور ایسے آئیں کہ تو میری رَگ رَگ میں اس طرح سما جائے کہ تیرے سامنے کسی اور کا جلوہ میری نظروں میں نہ ٹک سکے۔ کسی بھی محبوبِ مجازی کا جلوہ، تیرے سامنے بے رنگ وبے نور رہے اور چاروں طرف صرف تو ہی جانِ جاناں کی شکل میں جلوہ گر رہے۔

04.07 دُرگا سہائے سُرورؔ کی نظم ’’عروسِ حُبِّ وطن‘‘ کا تجزیہ

سرورؔ جہان آبادی نے بھی مختلف عنوانات کے تحت حُبِّ وطن کے جذبات سے معمور کئی بہترین نظمیں کہی ہیں۔ سرورؔ کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ اُنہوں نے اُردو شاعری کے حوالے سے سب سے پہلے وطن کا تصوّر مقدّس ’’ماں‘‘ اور ’’دیوی‘‘ کی حیثیت سے کیا۔ یہاں پر اس نظم میں اُنہوں نے وطن کو ’’محبوبہ‘‘ (دلہن) کی روپ میں دیکھا ہے۔

آریائی تہذیب ومعاشرت میں زمین یعنی دھرتی کو ماتا یعنی ماں کی حیثیت حاصل تھی۔ آریائی تہذیب کے افراد زمین یعنی پرتھوی کو مادرِ مہربان، شفیق ماں یا ماتا تصوّر کرتے تھے۔ دھرتی یا زمین ہی تمام افراد کو ضروریاتِ زندگی کی چیزیں فراہم کرکے اُن کی پرورش اپنی اولادوں

کی طرح کرتی ہے۔ سرورؔ اُردو کے پہلے ایسے اہم شاعر ہیں جن کا عقیدہ صدیوں پرانی اس ہندوستانی مزاج سے مناسبت رکھتا ہے جو وطن کو ماتر بھومی یعنی مادرِ وطن تسلیم کرتا ہے۔ سرورؔ اُس عہد کے شاعر ہیں جب ہندوستان میں سیاسی جدّ وجہد کی تحریکیں سرگرم عمل ہونے لگی تھیں۔ ہر طرف انقلاب وآزادی کے نعرے بلند ہورہے تھے۔ انہوں نے اپنی شعری زندگی کا آغاز مُلک ہند کی آزادی اور خوش حالی کے ارمانوں سے کیا۔ انہیں ارمانوں اور رجحانات نے اُن کے جذبات واحساسات اور فکر ونظر کو جلا بخشی۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری کا ایک بڑا حصّہ مادرِ وطن کی عظمت کے نغمات پر مشتمل ہے۔ اُن کی نظم ''عروسِ حُبِّ وطن'' بھی حُبّ الوطنی یعنی دیش بھکتی کے جذبے سے پوری طرح معمور ہے۔ سرورؔ اپنے سینے میں ایک حسّاس اور دھڑکتا ہوا دل رکھتے ہیں۔ اُن کی نگاہ بہت وسیع ہے۔ اُنہیں خاکِ وطن کی ہر چیز میں حُسن ودل کشی نظر آتی ہے۔ وہ اس کی اداؤں کو ادائے جاں نواز، اُس کی صدا کو صدائے دل نواز اور آسماں کے نور کی جلوہ گاہِ ناز کہہ کر اپنی شیفتگی اور فریفتگی کا ثبوت دیتے ہیں۔ دراصل سرورؔ کی یہ نظم عقیدہ کی طہارت، بے پناہ خلوص، بھگتی اور محبوبیت کی شان کی وجہ سے اپنی مثال آپ ہے۔

وطن کی محبت کو سرورؔ تمام اچھائیوں اور اعلیٰ انسانی اقدار کا معیار مانتے ہیں۔ ان کی نظر میں انسانی زندگی کا اعلیٰ وارفع جذبہ اور سب سے برتر مقصدِ زندگی وطن سے محبت کی ہے۔ وطن کی چاہت میں وہ سب کچھ نچھاور کرنے کو تیار ہیں۔۔ اس نظم میں اُنہوں نے وطن کی عظمت کو اس طرح چاہا ہے۔

ٹوٹیں وہ پاؤں، جن کو نہ تیری تلاش ہو
پھوٹے وہ آنکھ ، جس کو نہ ہو تیری جُستجو
وہ گھر ہو بے چراغ ، جہاں تیری ضَو نہ ہو
وہ دل ہو داغ ، جس میں نہ ہو تیری آرزو
حُوروں پہ میں مروں تو جہنم نصیب ہو
کافِر ہوں میں ، جو مُجھ کو بتوں کی ہو آرزو
تیرا طریقِ عِشق ہی ایمان ہے مرا
تیرے فدائیوں میں ہوں اے شوخِ خوب رُو

سرور کے عہد میں وطن کا موجودہ تصوّر پوری طرح واضح نہیں ہو پایا تھا اس لئے وہ کبھی وطن کو مقدّس ماں کی شکل میں دیکھتے ہیں اور کبھی محبوبہ کی شکل میں اور کبھی اس کی عظمت کا اظہار دیومالائی انداز میں کرتے ہیں۔ حُبّ الوطنی کے جذبہ سے معمور ''عروسِ حُبِّ وطن'' سرورؔ کی ایک منفرد انداز کی نظم ہے۔ اس نظم کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس نظم میں وطن کو قدرِ اعلیٰ کی حیثیت حاصل ہے۔ وطن کے ساتھ اُن کی تمام آرزوئیں اور تمنّائیں وابستہ ہیں۔ وہ اسے ہم سفر اور شریکِ زندگی بھی تصوّر کرتے ہوئے مذہب وملّت، فرقہ ومصلحت وغیرہ غرض کسی بھی شَے یا فرد کو حُبّ الوطنی کے درمیان حائل نہیں کرنا چاہتے۔ وہ وطن کو ایک ایسا پرستش کدہ تصوّر کرتے ہیں جہاں ناقوس واذاں، کُفر ودیں، شیخ و برہمن کے درمیان کوئی امتیاز وتفریق نہیں۔ اسی لئے وہ وطن کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے بھی تیّار رہتے ہیں۔ وہ عروسِ حُبِّ وطن کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی تمنّاؤں اور آرزوؤں کا اظہار بہترین لطیف پیرائے میں کرتے ہیں۔

04.08 خلاصہ

جدید نظم گو کی حیثیت سے سرورؔ کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اُنہوں نے قدیم وجدید دَور کے شعری نظریات کے اختلافات کو کم کرنے اور اُن میں مفاہمت کرانے کا قابلِ قدر کارنامہ انجام دیا۔ کلامِ سرورؔ کی ایک اہم خصوصیت عنوانات کا انتخاب اور تنوّع بھی ہے۔ اُن کی بیش تر نظموں کے موضوعات معاصرین اور قدما کی نظموں کے موضوعات سے مختلف ہیں۔ سرورؔ کی رگ و پے میں حُبّ الوطنی اور قوم پرستی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ آریہ قوم کے چشم و چراغ تھے اور وطن عزیز کو مادرِ مہربان، مادرِ مشفق، مادرِ دَم ساز اور دیوی جیسے القاب سے مخاطب کرتے تھے۔ وہ اُردو کے پہلے ایسے شاعر ہیں جنہوں نے وطن کے لئے ماں، دیوی اور محبوبہ کا تصوّر پیش کیا۔

عہدِ سرورؔ میں ایک طرف باہمی خلفشار، طبقاتی کش مکش و سماجی اضطراب کو ہَوا دی جارہی تھی تو دوسری طرف ہندوستان سیاسی جدّ وجہد، انقلاب اور آزادی کے دَور میں داخل ہورہا تھا۔ سرورؔ ایک نہایت حسّاس اور دردمند شاعر تھے۔ اُن کے دل و ذہن پر ایسے پُر آشوب حالات و ماحول کا اثر ہونا لازمی تھا۔ اسی لئے انہوں نے اپنی شاعری کا آغاز وطنِ ہند کی آزادی اور خوش حالی کے ارمانوں سے کیا۔ انہوں نے قوم و وطن کی محبت سے سرشار ہوکر وطن کی عظمت کے گیت گائے۔ اُن کے کلام میں یہی جذبات و احساسات اور یہی ارمان مختلف شکلوں میں نمودار ہوئے ہیں۔ کبھی وہ اپنے کلام کے ذریعہ امن، انصاف اور مساوات کا مطالبہ کرتے ہیں تو کبھی سامراجی نظام کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں، کبھی اہلِ ہند کو ماضی کی عظمت و رفعت کی یاد دلاتے ہیں تو کبھی اعلیٰ اقدار اور قومی روایات کے منتشر ہونے کی طرف واضح اشارے بھی کرتے ہیں۔ وہ مُلک کی آزادی اور خوش حالی کے لئے مذہب و ملّت کی تفریق سے بالاتر ہوکر اتّحاد، ہم آہنگی اور اجتماعیت پر زور دیتے ہیں وہ ہندوستان کی تشکیلِ نو کے لئے ماضی اور حال کی صالح بنیادوں کو اُستوار کرنے کے خواہاں تھے۔

سرورؔ کا کلام حُسنِ فطرت اور مظاہرِ قدرت کی حسین تصاویر کا مرقّع ہے۔ انہوں نے کائنات کی خارجی تصویر کشی کے ساتھ داخلی کیفیات کی بھی جان دار عکّاسی کی ہے۔ سرورؔ کے یہاں روایتی عشق اور عشق سے متعلّق روایتی رموز و علائم نظر نہیں آتے۔ اُن کے یہاں عشق والہانہ لگاؤ، خستگی، ربودگی، شدید چاہت، ایثار اور روحانی ہم آہنگی سے عبارت ہے۔ اُن کے کلام میں محبت کی جسمانیت اور ارضیت کا واضح تصور پایا جاتا ہے۔

سرورؔ نے اپنے کلام میں صنفِ نازک کے جذبات و احساسات کی دل آویز تصویریں اور گوناگوں تفسیریں بھی پیش کی ہیں۔ اُنہیں زندگی اور کائنات کے مختلف حقائق و مسائل سے گہری واقفیت تھی۔ انہوں نے انسانی زندگی کے مختلف مدارج بالخصوص عہدِ طفلی کی بھرپور عکّاسی کی ہے۔ سرورؔ قنوطی نہیں بلکہ ایک رجائی شاعر تھے۔ وہ اگرچہ تمام عمر محرومیوں اور ناکامیوں کا شکار رہے مگر وہ اس کائنات کی رنگینی اور دل کشی کو سمیٹ کر ایک زندہ دل انسان کی طرح راحتوں اور مسرّتوں سے ہمکنار اور لطف اندوز ہونا چاہتے تھے۔ اُن کی بیش تر نظمیں اُن کے اسی نظریے کی ترجمان ہیں۔

04.09 فرہنگ

اشجار : شجر کی جمع۔ بہت سے درخت

اندازِ تکلّم : بات کرنے کا ڈھنگ۔ گفتگو کا طریقہ

اَوتار : کسی دیوی یا دیوتا کا کسی کے جسم میں داخل ہو کر پیدا ہونا

بادِ جنوب : جنوبی ہَوا۔ دکن کی طرف سے چلنے والی ہَوا

بزمِ انبساط افروز : خوشیوں کو بڑھانے والی محفل۔ محفلِ عیش ونشاط

بے قرار کرنا : مضطرب کرنا۔ بے چین کرنا

پاکیزہ : طاہر۔ بے نقص۔ عمدہ

تختۂ خلدِ بریں : جنّت الفردوس کا ایک حصّہ۔ خلدِ بریں کا ایک ٹکڑا

جاں بخش : جان عطا کرنے والا۔ تازگی دینے والا۔ فرحت بخشنے والا

چاندنی رات : شبِ ماہ۔ شبِ مہتاب۔ قمری مہینے کی چودھویں، پندرہویں اور سولویں رات، جب چاند کی روشنی تقریباً ساری رات رہتی ہے

خوش گوار : خوش آئند۔ خوش ذائقہ۔ لذیذ۔ پسندیدہ

خوش منظر : خوش نما۔ خوب صورت

خوش نما : خوب صورت۔ حسین

دانش : علم۔ عقل۔ دانائی

دراز ہونا : بڑھنا۔ طویل ہونا۔ لمبا ہونا

دُرگا : بھوانی دیوی۔ پاروَتی۔ شیو کی اہلیہ

دیواستھان : مقدّس جگہ۔ دیوی یا دیوتا کے سکونت یا رہنے کی جگہ

دیوی : دیوتا کی تانیث۔ پاک باز عورت

شِوالا : شیو کا مندر۔ مہادیو کا استھان۔ وہ مندر جہاں شیو کی مورت یا شیولنگ نصب ہو

غم خوار : غم گسار۔ ہم درد۔ دُکھ درد کی شریک۔ مصیبت میں ساتھ دینے والی

قوتِ بازو : بازو کی طاقت۔ زورِ بازو

نطق : گویائی۔ بولنے کی قوّت

نفس کا تار : تارِ نفس۔ سانس کا سلسلہ

نورِ دانش : علم کی روشنی

04.10 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درجِ ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : سرورؔ کی کسی ایک نظم کا ایک بند قلم بند کیجیے۔

سوال نمبر۲ : نظم ''عروسِ حب وطن'' کا خلاصہ تحریر کیجیے۔

سوال نمبر۳ : سرورؔ کی زندگی کے کسی ایک اہم واقعہ پر روشنی ڈالیے۔

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : اُردو نظم گو شعرا میں سرورؔ کے مقام و مرتبہ کا تعیّن کیجیے۔

سوال نمبر۲ : سرورؔ کی نظم نگاری کی بنیادی خصوصیات پر روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر۳ : سرورؔ کی حیات و شخصیت کے اہم گوشوں پر روشنی ڈالیے۔

04.11 حوالہ جاتی کتب

۱۔ جامِ سرورؔ	از	سرورؔ جہان آبادی
۲۔ سرورؔ جہاں آبادی اوران کی شاعری	از	سیما صغیر
۳۔ سرورؔ جہان آبادی: حیات اور شاعری	از	ڈاکٹر حکم چند نیّر
۴۔ ہندوؤں میں اُردو	از	سیّد رفیق مارہروی

04.12 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ وحشتؔ

﴿۲﴾ ضلع پیلی بھیت کے قصبہ جہان آباد میں

﴿۳﴾ ویدگیری (حکمت)

﴿۴﴾ سرورؔ کی اہلیہ

﴿۵﴾ منشی دیانرائن نگم

﴿۶﴾ ۳؍دسمبر ۱۹۱۰ء

﴿۷﴾ حب الوطنی

﴿۸﴾ نظم نگاری پر

﴿۹﴾ سرورؔ کی

﴿۱۰﴾ موتی برساتی تھی تجھ پر ابر رحمت کی گھٹا

﴿۱۱﴾ دیوی، ماں اور محبوبہ کے روپ میں

﴿۱۲﴾ گلِ لالہ ایک قسم کا سُرخ پھول ہوتا ہے جس کے اندر سیاہ داغ ہوتا ہے۔

﴿۱۳﴾ شخصی مرثیے

﴿۱۴﴾ وقت اجل، سالِ گزشتہ، مرغابی، ترانۂ خوب، خاتمۂ ہستی

اکائی 05 : علّامہ اقبالؔ (سیّد کی لوحِ تربت)

ساخت

05.01 : اغراض ومقاصد

05.02 : تمہید

05.03 : علامہ اقبالؔ کے حالاتِ زندگی

05.04 : علامہ اقبالؔ کی نظم نگاری

05.05 : علامہ اقبال کی نظم ''سیّد کی لوحِ تربت''، متن

05.06 : علامہ اقبال کی نظم ''سیّد کی لوحِ تربت'' تشریح

05.07 : علامہ اقبال کی نظم ''سیّد کی لوحِ تربت'' تجزیہ

05.08 : خلاصہ

05.09 : فرہنگ

05.10 : نمونہ امتحانی سوالات

05.11 : حوالہ جاتی کتب

05.12 : اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

05.01 اغراض ومقاصد

علّامہ اقبالؔ اردو کے عظیم المرتبت شاعر ہیں۔ اُنہوں نے اردو شاعری میں نئی روح پھونکی۔ اُنہوں نے فلسفہ اور حکمت کو شاعری کی زبان عطا کی۔ شعر وفلسفہ کا حسین امتزاج ہی کلام اقبالؔ کی سب سے اہم خصوصیت ہے۔ اقبالؔ کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ اُنہوں نے نظمیں غزلوں کے انداز میں لکھی ہیں اور ان کی غزلوں میں نظم کا سا ربط وتسلسل پایا جاتا ہے۔ اس اکائی کا مقصد طلبا کو اقبالؔ کی شاعرانہ عظمت سے واقف کرانا ہے، ساتھ ہی اس اکائی میں اقبالؔ کی ایک نظم ''سیّد کی لوحِ تربت'' کا تجزیہ بھی پیش کیا جارہا ہے۔

05.02 تمہید

اس اکائی میں علّامہ اقبالؔ کی حیات اور کارناموں پر مختصر مگر جامع روشنی ڈالی جائے گی اور ان کی شاعری کی خصوصیات کا بھی جائزہ لیا جائے گا۔ جس میں ان کے فکر اور فن کا ارتقا بھی شامل ہے۔ اس اکائی کے مطالعے سے آپ اقبالؔ کی شعری بصیرت سے آگہی حاصل کرسکیں گے۔ آپ کے مطالعے کے لئے اقبالؔ کی نظم ''سیّد کی لوحِ تربت'' کا تجزیہ سادہ اور آسان زبان میں کیا گیا ہے اور اکائی کا خلاصہ بھی دیا گیا ہے۔ اس اکائی کے مطالعے سے آپ اقبالؔ کی زندگی اور فن سے متعلّق معلومات حاصل کریں گے۔

05.03 علامہ اقبالؔ کے حالاتِ زندگی

علاّمہ اقبالؔ اردو عظیم المرتبت شاعر ہیں۔ اقبالؔ کا پورا نام شیخ محمد اقبال اور اقبالؔ تخلّص تھا۔ وہ ایک کشمیری خاندان سے تعلّق رکھتے تھے۔ یہ خاندان برہمن تھا اور اٹھارہویں صدی کے آغاز میں مشرّف بہ اسلام ہوا۔ اس خاندان کا قیام سری نگر میں تھا۔ اپنی نیکی، شرافت اور پاکبازی کے سبب یہ خاندان معزّز اور ممتاز تھا۔ اس خاندان نے اٹھارہویں صدی میں ہجرت کی اور سیالکوٹ میں مقیم ہو گئے۔ علاّمہ اقبال کے دادا کا نام شیخ محمّد رفیق تھا اور والد کا نام شیخ نور محمد تھا اور امام بی بی ان کی والدہ تھیں۔ نور محمد کے دو بیٹے پیدا ہوئے ایک شیخ عطا محمد اور دوسرے علاّمہ اقبالؔ جو ۹ رنومبر ۱۸۷۷ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ اقبالؔ کی تاریخ ولادت میں قدرِ اختلاف پایا جاتا ہے لیکن تقویمِ ہجری وعیسوی کے حساب کے بعد محقّقین نے ۹ رنومبر ۱۸۷۷ء کو درست قرار دیا۔

اقبالؔ کی ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں ہوئی۔ پانچ برس کی عمر میں ایک مکتب میں داخل کرایا گیا۔ یہ مکتب شوالہ والی مسجد میر حسام الدّین، محلّہ کشمیریاں میں واقع تھا۔ اُنہوں نے مکتب میں قرآن مجید، ناظرہ اور فارسی کی مروّجہ تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد میر حسن کی خواہش پر ان کے مکتب واقع کوچہ میر حسام الدّین میں اردو، عربی اور فارسی کی تعلیم اور قرآن مجید کا درس حاصل کیا۔ اقبال کی تخلیقی صلاحیتوں کو اُبھارنے میں میر حسن نے بہت اہم رول ادا کیا۔

۱۸۹۳ء میں اقبالؔ نے اسکاچ مشن ہائی اسکول سیالکوٹ سے انٹرنس کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ عربی ان کا اختیاری مضمون تھا۔ یہ امتحان گجرات کے سینٹر سے دیا گیا۔ اسی سال وہ رشتۂ ازدواج میں بندھ گئے۔ یہ ان کی پہلی شادی تھی۔ کریم بی بی، خان بہادر عطا محمد سول سرجن گجرات کی صاحبزادی تھیں۔ اس بیوی سے اقبالؔ کے دو بچّے ہوئے، معراج بی بی اور آفتاب اقبال۔ اقبالؔ نے اسکاچ مشن ہائی اسکول سے ایف.اے. کا امتحان پاس کیا۔ اُنہوں نے آرٹس میں انگریزی (لازمی) کے علاوہ فلسفہ اور عربی کے مضامین اختیار کیے۔ ۱۸۹۵ء میں اُنہوں نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ وہ ایف.اے. پاس کرنے کے بعد مزید تعلیم لے لئے لاہور چلے آئے۔ لاہور کی ادبی اور ثقافتی فضا نے اس ذہین نوجوان کی صلاحیتوں کو خوب نکھارا۔ آپ نے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ بی.اے. انگریزی لازمی کے ساتھ فلسفہ، عربی ان کے اختیاری مضامین تھے۔ ۱۸۹۷ء اقبال نے سیکنڈ دویژن میں بی.اے کا امتحان پاس کیا اور دو تمغے حاصل کیے۔ اس دَوران پروفیسر ٹامس آرنلڈ کی شاگردی کا موقع ملا۔ ۱۸۹۹ء میں اقبالؔ نے ایم.اے. فلسفہ کا امتحان دیا اور درجہ سوم میں کامیاب ہوئے۔ ۱۳ رمئی ۱۸۹۹ء کو ہی پنجاب یونیورسٹی میں بطور میکلوڈ عربک ریڈر ان کا تقرّر عمل میں آیا اور مئی ۱۹۰۳ء تک وہ یونیورسٹی اورینٹل کالج میں تحقیق و تصنیف، درس وتدریس اور عربی اور اردو مطبوعات میں کو منظّم کرنے کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ ریسرچ اسکالری کے اس عرصہ میں اقبال تقریباً دو سال رخصت بلا تنخواہ لے کر گورنمنٹ کالج لاہور میں اسسٹنٹ پروفیسری کی اسامی پر عارضی طور پر مقرّر کر دیا گیا اور یکم ستمبر ۱۹۰۵ء کو تین سال کی خصوصی رخصت لے کر اعلیٰ تعلیم کے حصول لے لئے انگلستان چلے گئے۔ اقبال نے کیمبرج سے فلسفہ اخلاق پر مقالہ لکھ کر بی.اے کیا۔ ۱۹۰۷ء میں میونخ یونیورسٹی پی.ایچ.ڈی کی ڈگری لے کر ''ایران میں مابعد الطبیعیات کی نشو ونما وارتقا'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھا۔ یہ مقالہ اُنہوں نے پروفیسر میک ٹیگر یٹ کی رہنمائی میں تیّار کیا اور اس طرح ۱۹۰۸ء میں مڈل ٹیمپل سے بیرسٹری کی سند بھی حاصل کی۔

۲۲/ اکتوبر ۱۹۰۸ء کو چیف کورٹ نے وکالت لے لئے اقبالؔ کی درخواست منظور کی اور بطور وکیل چیف آف کورٹ اُنہوں نے لاہور میں پریکٹس شروع کر دی۔ یکم جنوری ۱۹۲۳ء میں اقبال کو علمی و ادبی خدمات کی خراج پیش کرتے ہوئے حکومت نے اُنہیں ''سر'' کے خطاب سے نوازا۔

اگر چہ علاّمہ شروع سے ہی ہندوستان کی سیاست میں دل چسپی لیتے رہے مگر ۱۹۲۶ء کے بعد اُنہوں نے عملی سیاست میں حصّہ لینا شروع کر دیا اور اسی سال مجلس قانون ساز کے ممبر منتخب ہوئے۔ اکتوبر ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے اور اپنے مشوروں سے نمائندگی کا حق ادا کیا۔ لندن میں کانفرنس کی کارروائیوں میں حصّہ لینے کے علاوہ مختلف انجمنوں کی تقریبات میں بھی شرکت کی۔ بعض اسلامی ملکوں کے اکابرین سے بھی ملاقاتیں کیں۔ لندن، اٹلی، روم، وینس، سکندریہ، قاہرہ، فلسطین ہوتے ہوئے واپس بمبئی آئے۔ اُنہوں نے ۱۹۳۲ء میں تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کی اور لندن سے پیرس، اسپین، میڈرڈ گئے۔ پیرس میں ان کی ملاقات فرانسیسی فلسفی ہنری برگساں سے ہوئی۔ پھر اقبالؔ یہاں سے تین ہفتوں لے لئے اسپین کی سیّاحت لے لئے روانہ ہوگئے۔ مسجدِ قرطبہ میں نفل پڑھی۔ ہسپانیہ میں قدیم اسلامی آثار اور خصوصاً مسجدِ قرطبہ کو دیکھ کر اقبالؔ بے حد متاثر ہوئے۔ مسلمانوں کی شان وشوکت کے آثار نے دل و دماغ پر ایک کیفیت طاری کر دی۔ ان کیفیات کا اظہار آپ نے اپنی شاعری میں کیا۔ ۱۹۳۳ء میں وہ افغانستان گئے۔ ۴/ ستمبر ۱۹۳۳ء کو پنجاب یونیورسٹی اور ۱۹۳۴ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے اقبالؔ کو ڈی.لٹ کی اعزازی ڈگریاں تفویض کیں۔ ان کی صحت خراب رہنے لگی تھی۔ اور یوں علالت کا سلسلہ شروع ہوا آخر ۲۱/ اپریل ۱۹۳۸ء کو اس مردِ قلندر نے اس جہانِ فانی کو خیر باد کہا اور اللہ کے ابدی دربار میں حاضر ہوگیا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۱﴾ علاّمہ اقبالؔ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

﴿۲﴾ علاّمہ اقبالؔ کی ابتدائی تعلیم کہاں ہوئی؟

﴿۳﴾ علاّمہ اقبالؔ نے کس موضوع پر پی. ایچ. ڈی کا مقالہ داخل کیا؟

05.04 علامہ اقبالؔ کی نظم نگاری

اردو زبان وادب کی تاریخ میں علاّمہ اقبالؔ کو ایک خاص مقام و مرتبہ حاصل ہے۔ وہ بیک وقت ایک مفکّر، بلند پایہ شاعر، دانش وَر، جیّد فلسفی، محبِّ وطن، انسان دوست اور پیغامبر شاعر کی حیثیت سے بلند مرتبے کے مالک ہیں، اقبال نے اردو شاعری میں ایک نئی روح پھونکی۔ اقبالؔ کی شخصیت شعر و فلسفہ کا سنگم ہے۔ تعقّل و تفکر کے ساتھ ذوقِ جمال کی آمیزش نے اقبالؔ کی شاعری کو ایک بلندی کے ساتھ گہرائی بھی عطا کر دی۔ شعر و فلسفہ کا یہی حسین امتزاج کلام اقبال کی خصوصیت ہے۔ اقبالؔ نے فلسفیانہ افکار کو جس سلیقے اور فن کاری کے ساتھ شاعری کے حسین قالب میں ڈھالا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ یہ اقبالؔ کی خوش ذوقی تھی کہ اُنہوں نے فلسفے کی خشکی کو رعنائی اور رنگینی عطا کر دی۔

اقبالؔ نے اردو شاعری کو نیا رنگ و آہنگ بخشا۔ غزل میں حکمت و فلسفہ اور متنوّع موضوعات کو شامل کر کے اس کے دامن کو وسیع تر کر دیا۔ غزل کو حُسن و عشق کے دائرے سے نکالنے میں ان کا نام سرِ فہرست ہے۔ اُنہوں نے غزل میں بھی اپنے فلسفیانہ افکار کا اظہار کیا ہے۔ ان کی غزلوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں نظموں کا سا تسلسل پایا جاتا ہے اور نظموں میں غزل کا سا انداز ہوتا ہے۔ اقبالؔ کی شاعری میں

نظم اور غزل کے کچھ ایسے قریب آ جاتے ہیں کہ جس کی مثال پوری اردو شاعری میں نہیں ملتی۔ ان کی نظموں میں کئی اشعار غزل کے رنگ و آہنگ میں ملتے ہیں۔ یعنی نظم کا اٹوٹ حصّہ ہونے کے باوجود ان کو علاحدہ پڑھا جائے تو غزل کے شعر کی طرح ہر لحاظ سے مکمّل ہوتے ہیں، مثلاً:

اس موج کے ماتم میں روتی ہے بھنور کی آنکھ
دریا سے اُٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی

یہ شعر نظم کا حصّہ ہونے کے باوجود، خیال اور معنویت کے لحاظ سے اپنے آپ میں مکمّل ہے۔ اقبالؔ کے ایسے سیکڑوں اشعار ہیں جنہیں لوگ دوہراتے رہتے ہیں۔ ان میں زیادہ تر اشعار ان کی نظموں کے ہی ہوتے ہیں۔

اقبالؔ کی شاعری کی ابتدا غزل سے ہوئی۔ وہ داغؔ کے شاگرد تھے۔ ابتدا میں اقبالؔ نے داغؔ کے رنگ میں غزلیں کہیں لیکن بہت جلد ان کا انفرادی رنگ پوری طرح اُبھر آیا۔ چوں کہ ان کا اپنا ایک مخصوص فلسفۂ حیات تھا۔ وہ اپنے فلسفیانہ افکار کو شاعری کے ذریعے عام کرنا چاہتے تھے۔

ابتدائی دَور کی شاعری میں اقبال نے زیادہ تر وطنی نظمیں کہی ہیں اور بعض نظموں میں انسان اور فطرت کے تقابل کرتے ہوئے انسان کی حقیقت کو جاننے اور انسانی زندگی کے مسائل کا حل تلاش کرنے کی کوشش ملتی ہے۔ شروع میں انجمن حمایت الاسلام کے جلسوں میں اپنا کلام سنایا کرتے تھے۔ یہیں سے ان کی شہرت کا آغاز ہوا۔ اقبالؔ اردو کے پہلے شاعر ہیں جس کا ایک مستقل پیام اور مربوط فلسفۂ حیات ہے۔ اسی لئے اُنہیں پیامبر شاعر بھی کہا جاتا ہے۔ اقبالؔ کی شاعری کو بلندی عطا کرنے میں ان کا فلسفیانہ نقطۂ نظر برابر کا شریک ہے۔ اقبالؔ کی شاعری اور فلسفے کے کچھ عناصر، خودی، عشق، عمل، اور مردِ مومن ہیں۔ اُنہوں نے انسان کی خودی کو اس کی زندگی کا مرکز قرار دیا ہے۔

خودی کیا ہے ، رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے ، بیداریِ کائنات

علاّمہ اقبالؔ نے خودی کے فلسفے کو اپنی فکر میں مرکزی حیثیت دی ہے۔ خودی کے تصوّر کو سمجھنے کے بعد اقبالؔ کی شاعری کی تفہیم آسان ہوجاتی ہے۔ مولانا عبدالسّلام ندوی کی ''اقبال کامل'' سے یہ اقتباس پیش ہے جو اقبالؔ کے تصورِ خودی کو سمجھنے میں مدد کرے گا:

> ''خودی سے فخر، غرور مراد نہیں بلکہ اس سے وہ استقلال ذاتی مراد ہے، جو ہر مخلوق کے علم و عمل کو ایک مخصوص دائرے میں نمایاں کرتا ہے۔ اس کی ذات وصفات کی بود و نمود کے مظاہر متعیّن کرتا ہے اور اس کی نشو ونما اور بالیدگی کے سامان فراہم کرتا ہے۔ اس لئے وہ جوہر ہے عرق نہیں، آفتاب ہے، آفتاب کا سایہ نہیں۔ متحرک ہے ساکن نہیں، غرض وہ ایک حقیقی زندگی ہے اور زندگی کی تمام لذّتیں اس کے استحکام، اس کی توسیع اور اس کے اثبات سے وابستہ ہیں۔''

اس سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ خودی سے مراد خود پرستی یا خود پسندی نہیں بلکہ اپنی ذات پر بھروسہ اور یقین ہے۔ جب انسان کی خودی بلند ہوتی ہے۔ تو ان کو اپنی منزل آسمانوں میں نظر آتی ہے۔ اور جب پست ہوتی ہے تو انسان زمین میں دھنس جاتا ہے۔ اقبالؔ اپنی قوم میں وہی ذوقِ یقیں پیدا کرنا چاہتے تھے۔ جو زنجیروں کو بھی کاٹ دے۔

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد

خودی کو بیدار اور باعمل بنانے لے لئے ''عشق'' ضروری ہے۔ اقبال نے ''عشق'' کا لفظ عام معنوں میں استعمال نہیں کیا ہے بلکہ مخصوص معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اقبال کے یہاں عشق ایک جذبہ ہے اور قوتِ عمل ہے۔ فلسفۂ خودی کی تشکیل کے دَوران اقبال مولانا رومی کے تصوّرِ عشق سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔ یہی تصوّر ان کے فلسفہ کا اہم ترین حصّہ ہے۔ خودی کی سعی پیہم اور ارتقا کے دَوران جو چیز اُسے آگے بڑھاتی ہے وہ یہی تصوّر ہے۔

عشق کی مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات

اقبال عقل پر عشق کو فوقیت دیتے ہیں کیوں کہ عقل تذبذب اور ہچکچاہٹ پیدا کرتی ہے۔ جب کی عشق کسی بھی خطرہ کو خاطر میں نہیں لاتا اور بے دھڑک آگ میں کود پڑتا ہے۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

اور جب عشق کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ تو انسان کبھی بھی بے کار اور بے عمل نہیں رہ سکتا۔ حرکت اور عمل کا پیکر بن جاتا ہے اور جس میں یہ تمام جذبے ہوں وہ مردِ مومن ہے۔ اقبال کا مردِ مومن وہ مثالی انسان ہے جو دنیا میں سب سے بلند مرتبت ہے۔ اور ان کے نظریۂ خودی کے ارتقا کی آخری کڑی ہے۔ اقبال مردِ مومن کی صفات اور اس کے انفرادی ارتقا کی منازل ہی بیان نہیں کرتے، بلکہ وہ اس معاشرے کو بھی پوری تصویر ہمارے سامنے کھینچ دیتے ہیں جس میں مردِ مومن کی تربیت کے پورے سامان موجود ہوں ان کا یہ معاشرہ اسلامی تعلیمات پر مبنی ہے۔

ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی
عقل کی منزل ہے وہ، عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمیِ محفل ہے وہ

اقبال کے خیالات، احساسات اور جذبات بالکل منفرد تھے۔ ان خیالات اور جذبات کے اظہار لے لئے اُنہوں نے زبان کو بھی نئے انداز و مفہوم میں استعمال کرنا ضروری سمجھا تھا۔ اس طرح اُنہوں نے اپنی زبان خود تخلیق کی۔ مطلب یہ ہے کہ اب تک جو الفاظ اردو زبان میں خاص مفہوم کے تحت استعمال ہوئے تھے ان کو الگ اور مختلف مفہوم میں اُنہوں نے استعمال کیا۔ جیسے خودی یا عشق۔ ان کے علاوہ اُنہوں نے شاہین اور مردِ مومن کے الفاظ بھی نئے مفہوم میں استعمال کیے۔ جیسے شاہین ایک پرندہ ہے، اس کی خاص صفات کے پیشِ نظر اُنہوں نے اس کو ایک علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ شاہیں علامت ہے بلند پروازی کی، استغنا، غیرت اور جرأت کی۔ یہ پرندہ اپنا گھونسلہ نہیں بناتا۔ پہاڑوں کی چٹانوں میں بسیرا کرتا ہے۔ دوسروں کا شکار کیا ہوا نہیں کھاتا، جب تک وہ خود شکار نہیں کر لیتا۔ اس کی ان ہی صفات کے پیشِ نظر اس لفظ کو عام اور معمولی مفہوم میں استعمال نہیں کیا بلکہ خاص طور پر غیر معمولی مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ اس لئے جب کبھی اور جہاں کہیں وہ اس لفظ کو استعمال کرتے ہیں، یہ سارے مفاہیم ظاہر ہوتے ہیں۔

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

☆

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

کلام اقبال کے الفاظ نہایت شیریں اور سادہ ہوتے ہیں اور موقع اور صنف کے تقاضے کا بھی اُنہیں احساس رہتا ہے۔ اس لئے ان کے کلام میں استعمال ہونے والے الفاظ سادہ اور سبک ہوتے ہیں۔ محاورے اور ضرب الامثال بھی برجستہ ہوتے ہیں۔ تراکیب میں زیادہ تر فارسی رنگ غالب رہتا ہے اور معانی کے تقاضے کے لحاظ سے جدید اور خوش نما تراکیب وضع کرنے پر بھی اقبالؔ کو قدرت حاصل ہے۔ منظر نگاری اور محاکات میں اقبالؔ اپنے قلم سے وہی کام لیتے ہیں جو ایک مصوّر اپنے قلم سے لیتا ہے۔

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اُودے اُودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے، پیرہن

علاّمہ اقبال کی شاعری میں، ان کے تخلیقی ارتقا کو سمجھنے کے لئے اسے تین اَدوار میں بانٹا جاتا ہے۔ پہلا دَور ابتدا سے لے کر ۱۹۰۵ء تک پر محیط ہے۔ اس دَور کی نظمیں وغزلیں ان کے مجموعۂ کلام ''بانگِ درا'' میں ملتی ہیں۔ اُنہوں نے ابتدا میں روایتی انداز کی شاعری کی اور وطن کی عظمت کے ترانے گائے اور فطرت کے حُسن کو بے نقاب کیا۔ اس دَور کی شاعری میں ''وطنیت'' کا پرچار ملتا ہے۔ ان کی بہت سی نظمیں مثلاً 'ترانۂ ہندی، تصویرِ درد، نیا شوالہ، صدائے درد، ہندوستانی بچّوں کا قومی گیت، وطن پرستی کے موضوع پر لکھی گئی ہیں۔

سارے جہاں سے اچھّا ، ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی ، یہ گلستاں ہمارا

☆

پتّھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے

ایک حُسن پرست کی طرح اس دَور میں اقبال کا دوسرا واضح رجحان مناظرِ فطرت کی تصویر کشی تھا۔ ہمالہ، ابرِ کوہسار، ایک آرزو، ماہِ نو، جگنو، ابر، کنارِ راوی وغیرہ ایسی ہی نظمیں اس دَور کی حسین تخلیقات ہیں۔ مناظرِ فطرت سے اقبالؔ کا یہ لگاؤ ان کی شاعری میں ہمیشہ باقی رہا۔ اس دَور میں مناظرِ فطرت کو اقبالؔ نے انسانی زندگی کے پس منظر میں بے حد اہمیت دی۔

چشمۂ کوہسار میں ، دریا کی آزادی میں حُسن
شہر میں صحرا میں ویرانے میں آبادی میں حُسن

☆

روح کو لیکن کسی گم گشتہ شَے کی ہے ہوس
ورنہ اس صحرا میں کیوں نالاں ہے یہ مثلِ جرس

اقبالؔ کی شاعری کا دوسرا دَور ۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۸ء تک کا ہے۔ یہ زمانہ آپ کے قیام یورپ اور حصولِ تعلیم کا زمانہ ہے۔ اس زمانے میں یورپ کا قریب سے مشاہدہ کرنے کے بعد اقبال میں اسلام سے وابستگی کا جذبہ قوی تر ہو گیا تھا۔ دنیا کے سیاسی اور مسلمانوں کے سماجی حالات دیکھ کر اُنہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ صرف ہندوستان کے مسلمان ہی نہیں بلکہ پوری ملّتِ اسلامیہ کو بے داری اور رہنمائی کی ضرورت ہے۔ اس دَور کی نظموں میں براہِ راست مسلمانوں کو مخاطب کیا ہے۔ مثلاً علی گڑھ کے نام، عبدالقادر کے نام، صقیلہ وغیرہ ہیں۔ اس دَوران اُنہوں نے یورپ کے فلسفہ اور فلسفہ اسلام کا گہرائی سے مطالعہ کیا۔ اس دَور کی نظموں میں فلسفیانہ رنگ گہرا ہونے لگا۔ وطن پرستی کے محدود دائرے سے نکل کر وہ آفاقی مسائل کی طرف متوجّہ ہوئے۔ اُنہوں نے اس دَور کے سنگین مسائل کی طرف توجّہ دی۔ جمہوریت اور سرمایہ دارانہ نظام کو تنقید کا نشانہ بنایا۔

علاّمہ اقبالؔ کی شاعری کا تیسرا دَور ۱۹۰۸ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس دَور کی شاعری کی بدولت اُنہیں دنیا کے لازوال شعرا کی صف میں جگہ ملی۔ علاّمہ اقبال کی شاعری کے تیسرے دَور تک ملّتِ اسلامیہ سیاسی، سماجی اور اقتصادی زبوں حالی کا شکار ہو چکی تھی۔ تمام مسلمان ملک سامراجی طاقتوں کے غلام بن چکے تھے۔ مسلمانوں میں رنگ و نسل کے اختلاف پیدا ہو چکے تھے۔ آپس میں اتّحاد نا پید تھا۔ بے عملی، ترکِ دین، قرآن سے دوری، مغرب پرستی اور باطل نظریات کو اپنانے کے سبب ان کی ملّی وحدت ٹکڑے ٹکڑے ہو چکی تھی۔ غرہ شوال، ہلالِ عید، شمع و شاعر، شکوہ، جوابِ شکوہ، خطاب بہ جوانانِ اسلام اور اس قبیل کی دوسری نظموں میں مسلمانوں کے زوال کے وجوہات بڑی صراحت سے بیان کیے ہیں۔ ان سب کے باجود اقبال رجائیت کا دامن نہیں چھوڑتے اُنہیں یقین ہے کہ ایک دن:

شب گریزاں ہوگی، آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا جلوۂ توحید سے

اقبالؔ کے اردو میں چار مجموعے بانگ درا، بالِ جبرئیل، ضربِ کلیم اور ارمغانِ حجاز ہیں۔ اور فارسی میں ان کے کئی شعری مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ اسرارِ خودی، پیامِ مشرق، زبورِ عجم اور جاوید نامہ قابلِ ذِکر ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۴﴾ اس شعر کو مکمّل کیجیے: ۔ اس قوم کا شمشیر کی حاجت نہیں رہتی

﴿۵﴾ ابتدائی دَور کی شاعری میں اقبالؔ نے کس موضوع پر سب سے زیادہ نظمیں لکھیں؟

﴿۶﴾ علاّمہ اقبال ابتدا میں اپنے کلام پر کس سے اصلاح لیتے تھے؟

05.05 علامہ اقبال کی نظم ''سیّد کی لوحِ تربت''، متن

اے کہ تیرا مرغِ جاں تارِ نفس میں ہے اسیر اے کہ تیری روح کا طائر قفس میں ہے اسیر
اس چمن کے نغمہ پیراؤں کی آزادی تو دیکھ شہر جو اُجڑا ہوا تھا اُس کی آبادی تو دیکھ
فکر رہتی تھی مجھے جس کی وہ محفل ہے یہی صبر و استقلال کی کھیتی کا حاصل ہے یہی
سنگِ تربت ہے مرا گرویدۂ تقریر دیکھ
چشمِ باطن سے ذرا اس لوح کی تحریر دیکھ

☆

مدّعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیمِ دیں ترکِ دنیا قوم کو اپنی نہ سکھلانا کہیں
وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لئے اپنی زباں چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامۂ محشر یہاں
وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے دیکھ! کوئی دل نہ دُکھ جائے ترے تقریر سے
محفلِ نو میں پرانی داستانوں کو نہ چھیڑ!
رنگ پر جو اَب نہ آئیں ان فسانوں کو نہ چھیڑ

☆

تو اگر کوئی مدبّر ہے تو سن میری صدا ہے دلیری دستِ اربابِ سیاست کا عصا
عرضِ مطلب سے جھجک جانا نہیں زیبا تجھے نیک ہے نیّت اگر تیری تو کیا پروا تجھے
بندۂ مومن کا دل بیم و ریا سے پاک ہے
قوّتِ فرماں روا کے سامنے بے باک ہے

☆

ہو اگر ہاتھوں میں تیرے خامۂ معجز رقم شیشۂ دل ہو اگر تیرا مثالِ جامِ جم
پاک رکھ اپنی زباں تلمیذِ رحمانی ہے تو ہو نہ جائے دیکھنا تیری صدا بے آبرو
سونے والوں کو جگا دے شعر کے اعجاز سے
خرمنِ باطل جلا دے شعلۂ آواز سے

05.06 علامہ اقبال کی نظم ''سیّد کی لوحِ تربت''، تشریح

﴿۱﴾ پہلا بند:۔

پہلے بند میں تربت (مزار کا پتّھر جس پر نام اور تاریخ وفات کندہ ہوتی ہے) وہ سرسیّد کی قبر پر زیارت لے لئے آئے زائر سے مخاطب ہو کر کہتی ہے کہ میری لوحِ تحریر کو پڑھنے لے لئے صرف بصارت ہی نہیں بلکہ بصیرت کی بھی ضرورت ہے آج کے حالات میں اگر سر سیّد اپنی قوم کے علما، سیاسی قائدین اور شعرا سے کچھ کہنا چاہتے تو وہ یہی باتیں ہوتیں جنہیں نظم کے اگلے بندوں میں پیش کیا گیا ہے۔

﴿۲﴾ دوسرا بند:۔

دوسرے بند میں شاعر نے دین کے ساتھ ساتھ دنیا کی اہمیت کو ظاہر کیا ہے۔ ترکِ دنیا مذہبِ اسلام کی تعلیمات میں شامل نہیں اس لئے وہ کہتے ہیں کہ اگر تم عالمِ دین ہو اور مذہبی تعلیمات کی اشاعت کرنا چاہتے ہو تو مذہب کی حقیقی تعلیمات ہی عوام تک پہنچانا، مذہب کے نام پر ترکِ دنیا کرنے کی طرف اُنہیں ہرگز مائل نہ کرنا کہ رہبانیت اسلام میں ممنوع ہے۔ یہاں اقبالؔ اپنے فلسفیانہ خیالات کو سرسیّد کی تربت کی زبانی بیان کر رہے ہیں۔ ایک اور اہم موضوع فرقہ بندی ہے۔ اسلام میں جس سے بچنے کی ہدایت دی گئی ہے۔ یہاں شاعر فرقہ بندی اور نااتّفاقی کے سبب دنیا میں ہونے والے فسادات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ہمیں ہر طرح کے تعصّب اور گروہ بندی سے بچنا چاہیے۔ مذہبی رہنما یا خطیب کے کلام میں وہ اثر ہونا چاہیے جو دلوں کو توڑنے کی بجائے اُنہیں جوڑ کر آپس میں اتّفاق پیدا کرے اور یہ پیامِ محبّت پہنچانے لے لئے زبان کا شیریں اور طرزِ ادا کا شگفتہ ہونا ضروری ہے۔ ورنہ دوسروں کی دل شکنی ہوسکتی ہے۔ عفو درگزر کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے شاعر مزید کہتا ہے کہ پرانی گزری ہوئی باتوں کو چھیڑنا زخموں کو کُریدنے کے برابر ہے۔ جس سے راحت کے بجائے تکلیفیں ہی اُٹھانی پڑتی ہیں۔ بے حد مدبّرانہ انداز میں شاعر نے یہاں علما کو مخاطب کر کے کہا ہے تفرقہ بندی سے اجتناب کرنا چاہیے کیوں کہ یہ نفرت اور تباہی کے سوا کچھ نہیں لاتی۔

﴿۳﴾ تیسرا بند:۔

نظم کے تیسرے بند میں لوحِ تربت سیاسی قائدین سے مخاطب ہو کر کہتی ہے کہ تو اگر ایک مدبّر ہے اور سیاست سے وابستہ ہے اور عوام کی خدمت کا سچّا جذبہ رکھتا ہے اور تجھے اپنی نیک نیتی پر پورا بھروسہ ہے تو کسی سے ڈرے بغیر، بے خوف ہو کر اپنا کام کرنا چاہیے اور ایک مومن کی پہچان بھی یہی ہوتی ہے کہ وہ حق بات لے لئے کسی سے ڈرتا نہیں بھلے ہی اس کے مدّ مقابل بادشاہِ وقت ہی کیوں نہ ہو۔

﴿۴﴾ چوتھا بند:۔

چوتھے بند میں اقبالؔ نے سرسیّد کی زندگی اور اصلاحی کارناموں سے جو اثر قبول کیا، اس کو سرسیّد کی لوحِ تربت کی زبان سے ناصحانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ اس بند میں لوحِ تربت کا روئے سخن شاعر و ادیب کی طرف ہے۔ لوحِ تربت کہتی ہے کہ تم اگر شاعر و ادیب، بے نظیر تحریر لکھنے پر قادر ہو اور انسانی زندگی کا ایسا عمیق مشاہدہ رکھتے ہو جیسے کہ جامِ جم۔ اس شعر میں اقبالؔ نے جام جم کو تلمیح کے طور پر استعمال کیا ہے۔ تلمیح شاعری کی ایک صنعت ہے۔ جس میں شاعر کسی واقعہ کی طرف ہلکا سا اشارہ کرتا ہے اور وہ واقعہ قاری کے ذہن میں تازہ ہو جاتا ہے۔ ایران کے بادشاہ جمشید کے پاس ایک ایسا جام (پیالہ) تھا، جس میں وہ ساری دنیا کے حالات و واقعات دیکھ سکتا تھا۔ یہاں اقبالؔ شاعر کے دل کو جامِ جم کہہ رہے ہیں اور مزید کہتے ہیں کہ شاعر کو اپنی زبان کو بدگوئی اور خوشامد سے پاک رکھنا چاہیے۔ کیوں کہ شاعر ''تلمیذ رحمانی'' یعنی خدا کا شاگرد ہوتا ہے۔ کیوں کہ شاعری خاص عطیۂ الٰہی ہے جو سب کو نصیب نہیں ہوتی۔ اس لئے شاعر کو اپنے کلام کو بے وقعت ہونے سے بچا لینا چاہیے۔ آخر میں کہتے ہیں کہ شاعری کا مقصد انسانوں کی بھلائی اور گمراہوں لے لئے بیداری ہونا چاہیے اور ایک شاعر کی آواز میں اتنا دَم ہوتا ہے کہ وہ اپنی آواز کے شعلوں سے باطل کو جلا کر خاک بنا سکتا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:۔

﴿۷﴾ نظم ''سرسیّد کی لوحِ تربت'' اقبالؔ کے کس مجموعے میں شامل ہے؟

﴿۸﴾ اس نظم میں اقبالؔ نے کس کس کو مخاطب کیا ہے؟

﴿۹﴾ اس شعر کو مکمّل کیجیے! سونے والوں کو جگادے شعر کے اعجاز سے

05.07 علامہ اقبال کی نظم ''سیّد کی لوحِ تربت'' تجزیہ

'لوحِ تربت' علاّمہ اقبال کی اہم اور مشہور نظموں میں شمار کی جاتی ہے۔ اقبالؔ کا ایک مستقل پیام اور مربوط فلسفۂ حیات ہے۔ اسی لئے اُنہیں پیامبر شاعر کہا جاتا ہے۔ وہ اپنی قوم وملّت کو غفلت کے خواب سے بیدار کرنا چاہتے تھے۔ مذہب میں جو بدعتیں پیدا ہوگئی تھی ان کی اصلاح لے لئے وہ شاعری کو سب سے مؤثّر اور مفید ذریعہ جانتے تھے۔ ان کا مقصد احیائے قوم تھا۔ اُنہوں نے شعروادب کی قوّت وتاثیر کو انسانی زندگی کے ارتقا اور اعلیٰ اخلاقی اقدار سے ہم آہنگ کرنے لے لئے استعمال کیا۔ سرسیّد احمد خان اور اقبالؔ میں یہ بات قدرے مشترک تھی کہ دونوں ہی اپنی قوم لے لئے سچّائی ہم دَردی رکھتے تھے اور قوم کو اس پستی اور زبوں حالی سے نکال کر ترقّی کی منزلوں پر گام زَن دیکھنا چاہتے تھے۔ دونوں نے تقدیر کی بجائے تدبیر پر زور دیا، جہاں سرسیّد نے اپنے مضامین میں یہ کہا کہ خدا بھی ان کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ وہیں اقبال نے کہا۔

تدبیر کے دستِ رنگیں سے تقدیر درخشاں ہوتی ہے
قدرت بھی مہرباں ہوتی ہے جب کوششِ انساں ہوتی ہے

اقبالؔ کی شاعری میں تقدیر کا فلسفہ یا تصوّر بہت جدید، مثبت، حیات بخش، روح پرور، ہمّت افزا اور ولولہ انگیز ہے۔ جو پژمردہ، شکستہ مایوس ذہن ودل میں امّید، حوصلہ، عزم اور جوش پیدا کرتا ہے۔ تقدیر کے متعلّق اشعار اس قدر زور، جوش، یقین کی گیرائی اور مثبت نظریہ سے پُر ہیں کہ قارئین کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتے۔ خالقِ کائنات تقدیر ساز ہے لیکن وہ یہ بھی کہتا ہے کہ وہ اس قوم کی حالت نہیں بدلتا جو خود اپنے کو نہیں بدلتی۔ اقبالؔ کی شاعری کی بنیاد اسلامی ہے اور اس میں سارا زور انسانی قدروں، انسانی امکانات اور انسان کی مضمر لامحدود طاقتوں پر ہے۔

اپنی قوم تک اسلامی پیام پہنچانے لے لئے اقبالؔ نے سرسیّد جیسے مصلح قوم کا سہارا لیا۔ اقبال سرسیّد کی خدمت کا اعتراف کرتے ہیں۔ سرسیّد اپنی ذات میں انجمن تھے اور ہمہ جہت شخصیت کے مالک بھی، عظیم مصلح، غیر معمولی بصیرت کے ماہرِ تعلیم، روشن خیال مذہبی مفکّر، سیاسی مدبّر، بے باک صحافی، غیر جانب دار مورّخ اور منفرد طرزِ تحریر کے ادیب وانشا پرداز کی حیثیت سے سرسیّد تاریخ کا ایک روشن باب ہیں۔ ایک طرف اُنہوں نے مسلمانوں کی تعلیم کے مسئلہ کو موضوع بنایا تو دوسری طرف مسلمانوں کی اخلاقی، سماجی اور سیاسی بدحالی دور کرنے اُنہیں پستی سے نکالنے کا زبردست کام کیا۔

سرسیّد کا یہ ماننا تھا کہ ہمارے زوال کا اہم سبب یہ ہے کہ ہم علوم وفنون سے دُور ہوگئے ہیں۔ دنیا میں وہی قومیں ترقّی کرتی ہیں جو علوم وفنون میں مہارت رکھتی ہیں اس لئے اُنہوں نے سب سے پہلے تعلیم کی طرف توجّہ کی اور مغربی علوم کو سیکھنے پر زور دیا۔ کیوں کہ ان ہی علوم کے بل بوتے پر مغربی ممالک ساری دنیا پر چھا گئے تھے۔ سرسیّد کی تعلیمی تحریک کی شدید مخالفت ہوئی لیکن وہ باوجود مخالف حالات کے اپنے کام میں

لگے رہے۔ اقبالؔ سرسیّد کے انہیں نظریات سے متاثّر نظر آتے ہیں۔ سرسیّد نے اپنے دَور کے حالات کے مطابق جو پالیسی اپنائی، اقبالؔ نے نہ صرف اس پالیسی سے اتّفاق کیا بلکہ اس پالیسی کے بارے میں اُنہوں نے سرسیّد کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین بھی پیش کیا:

''میں تسلیم کرتا ہوں کہ سرسیّد کے خیالات اور ان خیالات کے ماتحت اُنہوں نے جو کچھ اقدامات کیے وہ تنقید سے بالاتر نہیں، ان میں گفتگو کی گنجائش ہے لیکن یہ اقدامات ضروری تھے۔ حالات کا تقاضہ تھا کہ ایسا کوئی اقدام کیا جاتا جس سے مسلمانوں کی توجّہ وقت کے تقاضوں اور مستقبل کی طرف مفعطف ہوتی۔ سرسیّد احمد کی خوبی یہ ہے کہ اُنہوں نے یہ اقدام کیا۔ یہ اقدام بہرحال ضروری تھا یہی بات ہے جو ان کے نکتہ چینوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔''

اقبالؔ اور سرسیّد میں جو قدر مشترک تھی وہ یہ کہ دونوں نے اپنی اپنی فکر سے مسلمان قوم کو جدید حالات کے مطابق زندگی گزارنے کے لئے تیّار کیا۔ اس سلسلہ میں سرسیّد نے تعلیمی، مذہبی، سیاسی اور ادبی اصلاح کو اہمیت دی۔ سرسیّد کے خیالات نے جب اقبالؔ کے لئے راہ ہموار کی تو اُنہوں نے آگے بڑھ کر نہ صرف برِّصغیر بلکہ عالمِ اسلام کے مسلمانوں کو موضوعِ بحث بنایا اور ان تک اپنا پیغام پہنچایا۔ اس نظم میں اقبالؔ نے اپنے خیالات و افکار کو سرسیّد جیسے مصلح قوم کی لوحِ تربت کی زبان سے ادا کر کے اسے جان دار بنا دیا ہے۔

05.08 خلاصہ

شاعرِ مشرق علاّمہ اقبال ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ شیخ نور محمّد ان کے والد کا نام تھا۔ ان کی ابتدائی تعلیم مکتب شوالہ والی اور مسجد حسام الدّین میں ہوئی۔ ۱۸۹۳ء اُنہوں نے اسکاچ مشن ہائی اسکول سیالکوٹ سے انٹرنس کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ اسی سال ان کی شادی سول سرجن خان بہادر عطا محمد کی بیٹی کریم بی بی سے ہوئی۔ اسکاچ مشن ہائی اسکول سے ایف.اے. کا امتحان پاس کیا۔ مزید تعلیم کے لئے لاہور چلے آئے۔ لاہور کی ادبی اور ثقافتی فضا نے ان کی صلاحیتوں کو خوب نکھارا۔ طالبِ علمی کے زمانے میں ہی اُنہوں نے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ ۱۸۹۷ء میں اُنہوں نے بی.اے کا امتحان پاس کیا اور ۱۸۹۹ء میں فلسفہ میں ایم.اے. کیا۔ پھر درس و تدریس سے وابستہ ہوئے۔ ستمبر ۱۹۰۵ کو تین سال کی رخصت خاص لے کر اعلیٰ تعلیم کے حصول لے لئے انگلستان چلے گئے۔

۱۹۰۷ء میں میونخ یونیورسٹی سے پی.ایچ.ڈی کی ڈگری لے لئے ''ایران میں مابعد طبیعات کی نشو ونما و ارتقا'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھا۔ ۱۹۰۸ء میں مڈل ٹیمپل سے بیرسٹری کی سند بھی حاصل کی۔ ہندوستان لوٹ کر وکالت شروع کر دی۔ یکم جنوری ۱۹۲۳ء کو حکومت کی جانب سے اُنہیں 'سر' کے خطاب سے نوازا گیا۔

۱۹۲۶ء میں مجلسِ قانون ساز کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔ دنیا کے مختلف ممالک کا دَورہ کیا اور وہاں مسجدِ قرطبہ میں نفل نماز ادا کی اور مسلمانوں کے شان دار ماضی سے اس قدر متاثّر ہوئے کہ شاہ کار نظم ''مسجدِ قرطبہ'' تخلیق کی۔ ۶ دسمبر ۱۹۳۳ء کو پنجاب یونیورسٹی اور دسمبر ۱۹۳۴ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے اقبالؔ کو ڈی.لٹ. کی اعزازی ڈگری عطا کی۔ صحت خراب رہنے لگی اور آخر ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو انتقال ہوا۔

اقبالؔ بلند پایہ شاعر کے ساتھ ساتھ ایک مفکّر اور فلسفی بھی تھے۔ اُنہوں نے فکر و فلسفہ کو شاعری کے حسین قالب میں ڈھال کر پیش کیا۔ فکر و فلسفہ کا یہی امتزاج کلامِ اقبال کی خصوصیت ہے دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اُنہوں نے غزل اور نظم کی سرحدوں کو مٹا دیا۔ اُنہوں نے نظموں میں غزل کا سا انداز اپنایا اور ان کی غزلوں میں نظم کا سا ربط و تسلسل پایا جاتا ہے۔ ان کی نظموں میں کئی اشعار غزل کے رنگ و آہنگ میں ملتے ہیں۔ یعنی نظم کا اٹوٹ حصہ ہونے کے باوجود ان کو علیٰحدہ پڑھا جائے تو غزل کے شعر کی طرح ہر لحاظ سے مکمّل ہوتے ہیں۔

اس موج کے ماتم میں روتی ہے بھنور کی آنکھ
دریا سے اُٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی

اس کے علاوہ اقبالؔ کی شاعری کے ارتقا کو سمجھنے کے لئے اُنہیں تین اَدوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر دَور کی اپنی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ابتدائی دَور میں ان کا رجحان 'وطنیت' اور فطرت کی طرف تھا۔ دوسرے دَور میں فلسفیانہ افکار دکھائی دیتے ہیں اور تیسرے دَور میں اُنہوں نے اپنا روئے سخن ملّتِ اسلامیہ کی طرف موڑ دیا۔

اقبالؔ کی شاعری کو بلندی عطا کرنے میں فلسفیانہ نقطۂ نظر نے بہت اہم رول ادا کیا۔ اقبالؔ کی شاعری اور فلسفے کے کچھ اہم عناصر خودی، عشق، عمل، اور مردِ مومن ہیں۔ اُنہوں نے خودی کے فلسفے کو اپنے فکر میں مرکزی نقطہ کی حیثیت دی ہے۔ ان کے یہاں خودی سے مراد خود پرستی یا خود پسندی نہیں بلکہ اپنی ذات پر بھروسہ اور یقین ہے۔ اور خودی کو بیدار اور باعمل بنانے کے لئے ''عشق'' کو ضروری عنصر تصوّر کرتے ہیں۔ عشق اقبالؔ کے یہاں عام معنوں میں نہیں بلکہ خاص معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اقبالؔ عقل پر عشق کو فوقیت دیتے ہیں۔ کیوں کہ عقل تذبذب پیدا کرتی ہے اور عشق کسی خطرے کو خاطر میں نہیں لاتا۔

اقبالؔ تدبیر اور عمل پر بہت زور دیتے ہیں۔ اقبال فلسفے میں مردِ مومن کو بھی بہت اہمیت حاصل ہے۔ اور یہی مردِ مومن ان کے نظریۂ خودی کے ارتقا کی آخری کڑی ہے۔ اقبالؔ نے لفظ شاہین کو بھی ایک نئی معنویت عطا کی ہے۔ اس کی صفات کے پیشِ نظر اُنہوں نے اس کو ایک علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ شاہین علامت ہے بلند پروازی کی۔ استغنا کی، غیرت اور اُجرت کی، جب کبھی اور جہاں کہیں وہ اس لفظ کو استعمال کرتے ہیں یہ سارے مفاہیم ظاہر ہوتے ہیں۔

اقبال کی نظم ''سرسیّد کی لوحِ تربت'' کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اقبالؔ نے اپنی قوم کی اصلاح کے لئے اس نظم میں مختلف خیالات پیش کیے ہیں۔ اور یہ تمام خیالات لوحِ تربت (مزار کا پتّھر، جس پر نام اور تاریخ وفات کندہ ہوتی ہے) کی زبانی ادا کیے ہیں۔ یہ نظم تجسیم کی ایک بہترین مثال ہے۔ اس میں شاعر نے ایک بے جان پتّھر کو جان دار بنا کر پیش کیا ہے۔ لوحِ تربت یہ کہتی ہے کہ مجھ کو پڑھنے لے لئے صرف بصارت نہیں بلکہ بصیرت کی بھی ضرورت ہے۔ اس نظم میں اقبالؔ نے علماے دین، مدبّرین اور شعرا کو مخاطب کیا ہے اور باری باری ان کو حق کا ساتھ دینے اور دنیا میں امن و امان بنائے رکھنے کی تلقین کی ہے۔

05.09 فرہنگ

استغنا : بے نیازی
اسیر : قیدی، بندی
اعجاز : معجزہ، کرامت
بیم وریا : خوف اور دکھاوا
تعقّل : سمجھنا، سوچنا، غور کرنا
تفکّر : فکر، سوچ، بچار
تلمیذِ رحمانی : خدا کا شاگرد، مجازاً شاعر
جامِ جم : ایران کے بادشاہ جمشید کا پیالہ جس میں وہ دنیا کے تمام حالات کا عکس دیکھ لیتا تھا۔ اسے جامِ جم سے بھی جانا جاتا ہے۔
طائر : پرندہ
قفس : پنجرہ
لوح : مزار کا پتّھر جس پر نام اور تاریخ وفات کندہ ہوتی ہے۔

05.10 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درجِ ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : علاّمہ اقبالؔ کے حالاتِ زندگی کا مختصر جائزہ لیجیے!
سوال نمبر۲ : علاّمہ اقبالؔ کے تصوّرِ خودی کو مثالوں سے واضح کیجیے!
سوال نمبر۳ : علاّمہ اقبالؔ کی شاعری میں 'شاہین' پر ایک نوٹ لکھئے!

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : علاّمہ اقبالؔ کے فلسفیانہ افکار پر روشنی ڈالیے!
سوال نمبر۲ : علاّمہ اقبالؔ کی شاعرانہ خصوصیات کا تفصیلی جائزہ لیجیے!
سوال نمبر۳ : نظم 'سرسیّد کی لوحِ تربت' کا خلاصہ اپنی زبان میں بیان کیجیے!

05.11 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اقبال کا فن از گوپی چند نارنگ
۲۔ ذِکرِ اقبال از مولانا عبدالمجید سالک
۳۔ روحِ اقبال از ڈاکٹر یوسف حسین خاں
۴۔ فکرِ اقبال از خلیفہ عبدالحکیم

05.12 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ اقبالؔ ۹/نومبر ۱۸۷۷ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔
﴿۲﴾ اقبالؔ کی ابتدائی تعلیم سیالکوٹ کے ایک مکتب میں ہوئی۔
﴿۳﴾ اقبالؔ نے ''ایران میں مابعد طبیعیات کی نشو ونما اور ارتقا'' پر پی.ایچ.ڈی کا مقالہ داخل کیا۔

﴿۴﴾ اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی ☆ ہو جس کے جوانوں میں خودی صورتِ فولاد

﴿۵﴾ ابتدائی دَور کی شاعری میں اقبالؔ نے سب سے زیادہ 'وطنیت' کے موضوع پر نظمیں لکھیں۔

﴿۶﴾ اقبالؔ اِبتدا میں اپنے کلام پر داغؔ سے اصلاح لیا کرتے تھے۔

﴿۷﴾ نظم 'سرسیّد کی لوحِ تربت' بانگِ درا میں شامل ہے۔

﴿۸﴾ اس نظم میں اقبالؔ نے علما، سیاسی قائدین اور شعرا کو مخاطب کیا ہے۔

﴿۹﴾ سونے والوں کو جگا دے شعر کے اعجاز سے ☆ خرمنِ باطل جلا دے شعلۂ آواز سے

اکائی 06 : اختر شیرانی ''اودیس سے آنے والے بتا''

ساخت

06.01 : اغراض ومقاصد

06.02 : تمہید

06.03 : اختر شیرانی کے حالاتِ زندگی

06.04 : اختر شیرانی کی نظم نگاری

06.05 : اختؔر شیرانی کی نظم ''اودیس سے آنے والے بتا'' متن

06.06 : اختؔر شیرانی کی نظم ''اودیس سے آنے والے بتا'' تشریح

06.07 : اختؔر شیرانی کی نظم ''اودیس سے آنے والے بتا'' تجزیہ

06.08 : خلاصہ

06.09 : فرہنگ

06.10 : نمونہ امتحانی سوالات

06.11 : حوالہ جاتی کتب

06.12 : اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

06.01 اغراض ومقاصد

نظم نگاری ایک علیحدہ صنفِ سخن کی حیثیت سے ۱۸۷۴ء میں انجمن پنجاب کے مشاعرے سے وجود میں آئی۔ نظم کی جو بات اسے دوسری اصنافِ سخن سے ممتاز ومیّز کرتی ہے وہ اس کی وحدت، احساسِ تعمیر، خیال وتاثیر اور ترتیب واظہار کا انداز ہے۔ نظم ایک مکمّل شعری وحدت ہے۔ اس کا ہر شعر اپنی علیحدہ حیثیت نہیں رکھتا۔ یہ تو محض ایک رنگ، ایک سُر یا ایک آواز ہے جو صرف اسی وقت مزہ دے سکتی ہے جب دوسرے اَنگنت رنگوں، سُروں اور آوازوں کے ساتھ اسے ترتیب دیا جائے۔

انجمن پنجاب کے مشاعروں میں محمد حسین آزؔاد اور حالؔی نے ایک ایسی صنفِ شاعری کی داغ بیل ڈالی جس میں ربط وبیان اور خیال کی وحدت موجود ہو۔ تکنیک اور فنّی تشکیل وتعمیر سے زیادہ نظم کے نفسِ مضمون میں ایک وسعت اور واقفیت پیدا کرنے پر زور دیا جائے۔ حالؔی نے شاعری کے دو بنیادی تصوّرات قائم کیے۔ ایک اس کا نیچرل ہونا، دوسرے اس کی اخلاقی اہمیت۔ نیچرل شاعری میں زیادہ زور واقعات، افکار اور خیالات کے بیان میں جذبے کی گرمی اور احساس کی لطافت پیدا کرنے کی طرف دیا گیا۔

شبلی نے نظموں میں روانی، سادگی اور ترنّم کو بنیادی جوہر بنایا۔ چکبستؔ، صفیؔ، وحیدالدّین سلیمؔ، سرورؔ جہان آبادی اور نظم طباطبائی نے نظم نگاری میں سنجیدگی، خیال انگیزی اور ترتیب و تسلسل قائم رکھا۔ آگے چل کر اقبال نے نظم میں فلسفیانہ گہرائی و گیرائی پر زور دیا اور نفسِ مضمون اور تکنیک دونوں حیثیتوں سے اُنہوں نے نظم کو نئی شکل وصورت بخشی۔ یہ اردو کا نیا سفر تھا جس میں اخترؔ شیرانی بھی شریک تھے۔

اس اکائی کے مطالعے سے آپ اخترؔ شیرانی کی حیات اور ان کی شاعرانہ خصوصیات سے واقف ہو جائیں گے۔ اسی کے ساتھ آپ ان کی مقبول نظم ''اودیس سے آنے والے بتا'' کا خصوصی مطالعہ بھی کریں گے۔

06.02 تمہید

اُردو نظم کے نئے سفر میں نئی خیال انگیزی کے ساتھ نئے خیال کو جنم دینے والی صورتوں کا بھی التزام رکھا گیا ہے، دعوتِ فکر دی گئی ہے اور اسی طرح اردو شاعری میں اپنی ایک نئی صنف کو ساتھ لے کر جس کا نام نظم تھا اس طرح آگے بڑھتی رہی کہ ترقّی کی کئی منزلوں کو حاصل کر لیا۔ اسی زمانے میں نوجوان شعرا رومانوی اثرات کے تحت نئے تجربے کر رہے تھے۔ یہ شعرا نظم کے اخلاقی و اصلاحی لہجے سے اُکتا کر زیادہ شیریں اور سُبک جذبوں کی لئے تلاش کرنے لگے۔ عورت ان کے نزدیک ''خلاصۂ کائنات'' تھی اور عشق ''اپنا معبود پیدا کرنے'' کا ایک ایسا عمل تھا جو انسان کی جمالیاتی تربیت اور شعور و بصیرت لے لئے ضروری ہوتا ہے۔ اُنہوں نے اردو نظم کو سپردگی، مٹھاس اور سوز و گداز سے آشنا کیا۔ اس ضمن میں اخترؔ شیرانی نے نظم کے فارم میں بھی تجربات کیے اور اپنے رومانی اور عشقیہ جذبات و احساسات کو نظم کرنے کے لئے اس صنف کا سہارا لیا۔

06.03 اختر شیرانی کے حالاتِ زندگی

اخترؔ کے دادا مولوی اسمٰعیل خاں شیروانی، نواب وزیرالدّولہ (۱۸۳۴ء سے ۱۸۶۵ء) کے زمانے میں ٹونک (راجستھان) میں آئے اور ہمیشہ کے لئے یہیں کے ہو رہے۔ اختر کے والد حافظ محمود شیرانی ٹونک میں ہی پیدا ہوئے اور دنیائے اردو ادب میں ایک بلند پایہ محقّق کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ اخترؔ شیرانی کی پیدائش ۴ر مئی ۱۹۰۵ء کو ٹونک میں ہوئی۔ ان کا تعلّق سرحدی پٹھانوں کے قبیلے سے تھا۔ ان کے بزرگ محمود غزنوی کی فوج کے ساتھ ہندوستان آئے اور راجستھان کے ضلع ناگور کے مقام ''بڑی کھاٹو'' میں بس گئے۔ اس کے بعد ''چھوٹی کھاٹو'' میں منتقل ہو گئے، جہاں اس قبیلے کی ایک چھوٹی سی بستی آباد ہو گئی اور قبیلے کی نسبت سے اس کا نام ''شیرانیوں کی ڈھائی'' پڑ گیا۔ ان کے ایک بزرگ شیخ احمد کھٹّو کا ذِکر جہانگیر نے اپنی تزک میں کیا ہے۔ اخترؔ شیرانی کا سلسلۂ نسب افغانوں کے اسی مشہور خاندان ''شیرانی'' سے تھا، جس کی مناسبت سے شیرانی کہے جانے لگے۔ گھر والوں نے ان کا نام محمد داؤد خاں رکھا تھا۔ مسعود خسرو اخترؔ ان کا تاریخی نام تھا لیکن ادب کی دنیا میں اپنے تخلّص اور خاندان کی نسبت سے اخترؔ شیرانی کے نام سے متعارف ہوئے۔

اخترؔ نے قرآن مجید، فارسی اور اردو کی ابتدائی تعلیم ٹونک کے مدرسوں اور مکتبوں میں حاصل کی۔ ان کے والد حافظ محمود شیرانی ۱۹۱۴ء میں انگلستان سے واپس آئے تو اخترؔ کی ذہنی نشو ونما کے ساتھ ساتھ جسمانی تعلیم و تربیت کی طرف توجّہ فرمائی اور ٹونک کے ایک مشہور پہلوان قیّوم خاں کو ورزش کرانے اور کشتی سکھانے کے لئے مقرّر کر دیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ خوش نویسی اور فن خطاطی کی تعلیم کا بھی باقاعدہ بندوبست کیا گیا۔ اس طرح اپنے والدِ محترم کے زیرِ سایہ اخترؔ اپنی علمی، ادبی، ذہنی اور جسمانی تربیت پاتے رہے۔

۱۹۲۱ء میں اختؔر اپنے والد کے پاس لاہور چلے گئے یہاں ان کے والد نے اورینٹل کالج لاہور میں داخل کرادیا۔اس کالج میں اختؔر نے اپنی خداداد ذہانت اور قابلیت کے وہ جوہر دکھائے کہ ان کے استاد بھی حیران رہ گئے۔لاہور میں اختؔر نے منشی فاضل اور ادیب فاضل کے امتحانات امتیازی خصوصیت کے ساتھ پاس کیے۔اس کے بعد اُنہوں نے انگریزی تعلیم کی طرف توجّہ کی اور میٹرک کا امتحان پاس کیا۔اس کے بعد وہ اپنی سرگرمیوں، رومانی ولولوں اور جوانی کی سرمستیوں میں ایسے ڈوبے کہ آگے اور تعلیم حاصل نہ کر سکے۔

بچپن سے ہی ان کی رومانی فطرت اور شعر گوئی کی طرف مائل طبیعت اپنا رنگ دکھانے لگی۔ابتدا میں ٹونک میں صابر علی شاکر سے اصلاح لی۔لاہور پہنچ کر علاّمہ تاجؔور نجیب آبادی سے مشورۂ سخن کیا۔نوجوان اختر کی شعری صلاحیتوں کو لاہور کے ادبی حلقوں میں محسوس کیا جانے لگا اور اسی کو محسوس کرتے ہوئے ''عالمگیر'' لاہور کے مدیر حافظ محمّد عالم نے ان سے فرمائش کی کہ وہ منتخب تصاویر پر نظمیں لکھیں۔اختؔر نے ان کی فرمائش پر جوگن، تیتری اور حُسنِ معصوم وغیرہ نظمیں کہیں۔اس طرح اختؔر کی رومانی شاعری کا آفتاب بلند ہوتا گیا اور اس زمانہ میں جب کہ انقلابی تحریک اور رومانی تحریک کے خلاف علمِ بغاوت بلند تھا، اختؔر نئے رومانی تحریک کی ایک نئی آب وتاب کے ساتھ علم برداری کی۔

۱۹۴۳ء میں جب ان کے والد ملازمت سے سبک دوش ہوکر لاہور سے اپنے وطن ٹونک آئے تو اختؔر کو بھی اپنے ہم راہ ٹونک لے آئے۔کچھ ہی عرصہ بعد ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ابھی باپ کا غم ہی کم نہیں ہوا تھا کہ اختؔر کے داماد محمد نظیر الدّین بانا س ندی میں ڈوب گئے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ملک بھر میں فرقہ وارانہ فسادات پھیلے ہوئے تھے۔ایسے میں اختؔر اپنے اہل وعیال کو ٹونک ہی میں چھوڑ کر مرنے سے تقریباً چھ ماہ قبل لاہور چلے گئے۔وہاں ۹ ستمبر ۱۹۴۸ء کو زیادہ شراب پینے کی وجہ سے اختؔر کا لاہور ہی میں انتقال ہوگیا۔خدا نے اُنہیں سعادت مند اولاد عطا کی تھی جس نے اپنے خاندان کا نام روشن کیا۔ان کے صاحبزادے مظہر محمود خاں نے تاریخ اور فارسی میں ایم.اے کیا اور شیخوپورہ پاکستان میں گورنمنٹ کالج میں لکچرر رہوئے۔

اختؔر کے شاگردوں میں ن.م.راشؔد، احمد ندیم قاسمی، مرزا ادیبؔ کے نام خصوصیت کے ساتھ لیے جاتے ہیں۔ان کی کل تصانیف کی تعداد تقریباً پندرہ ہے، جن میں شعری تصانیف میں ''پھولوں کے گیت'' (بچّوں کے لئے نظموں کا مجموعہ) ۱۹۳۶ء، نغمۂ حرم (نظمیں) ۱۹۳۹ء، شعرستان ۱۹۴۱ء، طیورِ آوارہ، شہناز ۱۹۴۶ء، لالۂ طور ۱۹۴۷ء اور شہرُود بعد انتقال ۱۹۴۹ء ہیں۔

نثری تصانیف میں ترکی ڈارمہ ضحاک کا اردو ترجمہ ۱۹۳۰ء، آئینہ خانے میں ۱۹۳۴ء، ترجمہ جوامع الحکایات، ترجمہ لوامع الروایات مصنّفہ محمد عوفؔی مطبوعہ ۱۹۴۳ء وغیرہ ہیں۔آپ ماہ نامہ ہمایوں ۱۹۲۲ء کے شریک مدیر اور ''انتخاب لاہور'' کے مدیر رہے۔''خیالستان'' ۱۹۳۰ء میں اور ۱۹۳۵ء میں ''رومان'' نام کا رسالہ نکالا۔اختؔر نے مکتوب نگاری میں بھی اپنے قلم کا کمال دکھایا۔رومانی نثر اور ادب لطیف کے نمونے پیش کیے۔اختؔر اور سلمٰی کے خطوط کے نام سے خادم حسین نے ان خطوط کو مرتّب کر کے ۱۹۵۷ء میں شائع کیا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۱﴾ اختؔر شیرانی کہاں پیدا ہوئے تھے اور ان کے والد کا کیا نام تھا؟

﴿۲﴾ اختؔر کے اہم شاگردوں کے نام بتایئے؟

﴿۳﴾ اختؔر کے بعض شعری مجموعوں کے نام بتایئے؟

06.04 اختر شیرانی کی نظم نگاری

اختؔر شیرانی کو اردو کی رومانی شاعری میں امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ان کی شاعری میں رندی و سرمستی، سرشاری و کیف جوئی، لذّت پرستی و نشاط اندوزی، حُسن کاری و بہار آفرینی، رنگینی و رعنائی، منظر کشی اور زیبائش اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ جلوہ نما ہے۔ موسیقیت اور نغمگی کا ایک خوش گوار دریا رَواں دَواں ہے۔اختؔر شیرانی کو زبان و بیان پر مکمّل دَست رَس حاصل تھی۔اُنہوں نے اپنے احساسات و جذبات اور تصوّرات کو بڑے دل کش اور جان دار پیکروں میں ڈھال کر منظر نگاری کے زمرے میں لا کھڑا کیا ہے۔تشبیہات و استعارات کی منھ بولتی تصویریں ذہن و تصوّر کے سامنے رونما کر دیں۔ان کی شاعری میں جواں دلوں کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں۔

اختؔر کی شاعری میں رومانیت کے تقریباً تمام عناصر پائے جاتے ہیں۔اپنے اردگرد کے ماحول سے گریز، زندگی کی تلخیوں سے فرار، یادِ ماضی، مستقبل کے حسین خواب، حُسن اور حُسن کی تلاش، بے انتہا تصوّریت، جذباتیت، تخیلیت اور ہر قسم کے بندھنوں سے آزاد ہونے کی تڑپ ان کی شاعری کے موضوعات ہیں۔

محبت کے اقرار سے شرم کب تک کبھی سامنا ہو تو مجبور کر دوں
نہیں زندگی کو وفا ، ورنہ اختؔر محبت سے دنیا کو معمور کر دوں

رومان مزاج کے شاعر کی آرزوئیں، تمنّائیں اور خواہشیں اس قدر دشوار ہوتی ہیں کہ ہر خواہش پہ دَم نکلے۔یعنی اسے اپنی اُمیدوں کو پورا نہ ہونے کا افسوس کرنا پڑتا ہے اور زندگی سراپا درد بن کر رہ جاتی ہے۔اختؔر کے یہاں بھی غم، ہجر، تنہائی، درد اور کسک سے لبریز اشعار پائے جاتے ہیں۔

رہ گئے بن کے ہم سراپا غم یہ نتیجہ ہے دل لگانے کا

اسی غم کی بدولت اختؔر کے کلام میں سوز و گداز بھی پیدا ہو گیا ہے۔اس سوز و گداز کے سبب ہی ان کے کلام میں تغزّل رَچ بس گیا ہے اور یہ تغزّل ان کی غزلوں، نظموں، سانیٹ، گیت اور ماہیوں میں بھی پایا جاتا ہے۔مثال کے طور پر تغزّل سے بھرپور یہ اشعار دیکھئے۔

کچھ تو تنہائی کی راتوں میں سہارا ہوتا تم نہ ہوتے نہ سہی ذِکر تمہارا ہوتا
کس کو فرصت تھی زمانے کے ستم سہنے کی گر نہ اس شوخ کی آنکھوں کا اشارہ ہوتا

اختؔر کے یہاں حُسن پرستی کا وہ انداز پایا جاتا ہے جو عبادت کے قریب پہنچا دیتا ہے۔حُسن ان کی آنکھوں میں بے پناہ اور دل میں بے انتہا سُرور پیدا کرتا ہے اور عشق کی تڑپ ان کے تمام جذبات، احساسات اور خیالات کو تحریک دیتی ہے۔وہ ہر لمحہ حُسن کا دیدار چاہتے ہیں اور تلاشِ حُسن میں سرگرداں رہتے ہیں۔اختؔر شیرانی کی شاعری منزلِ لیلیٰ کی تلاش ہے اور اس تلاش میں وہ مختلف وادیوں میں جا نکلتے ہیں۔ان کی نظموں میں گو کہ فکری عنصر بہت کم ہے لیکن جذباتی فراوانی قدم قدم پر ملتی ہے۔فارم کے لحاظ سے اختؔر نے سانیٹ کو رواج دیا اور مستزاد سے بہت کام لیا۔اُنہوں نے حُسن اور رومان کی تکمیل میں مختلف ذرائع سے صوری آہنگ، موسیقی اور صوتی تلذّذ پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ نظموں میں بندوں کی ترکیب و ترتیب کو بدلا ہے، قافیے کا نیا بندوبست کیا ہے، بحر کے ارکان کو دو مصرعوں میں تقسیم کر کے لکھا ہے اور درمیانی قافیے کا استعمال کیا ہے۔جیسا کہ ماقبل ذکر آیا ہے کہ اختؔر نے انگریزی طرز میں سانیٹ بھی لکھے ہیں اور اسے مقبول بھی کیا ہے۔

سانیٹ میں مصرعوں کی تعداد معیّن ہوتی ہے لیکن قافیے کی ترکیب کے کئی اُسلوب ہوتے ہیں۔اس لحاظ سے سانیٹ اردو شاعری کی روایتی اصناف سخن کے مقابلے آزاد پسند صنف ہے۔اس کے علاوہ اخترؔ نے پنجابی کی طرز پر اردو میں چند ماہیے بھی تحریر کیے ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۴﴾ اخترؔ شیرانی کس مزاج کے شاعر ہیں؟

﴿۵﴾ اخترؔ نے اردو نظموں کے علاوہ اور کن اصناف پر طبع آزمائی کی ہے؟

﴿۶﴾ اخترؔ کا کوئی ایک رومانی شعر سنایئے!

﴿۷﴾ رندی وسرمستی، سرشاری وکیف جوئی، حُسن کاری، بہار آفرینی اور رنگینی ورعنائی کس قسم کی شاعری کی خصوصیات ہیں؟

06.05 اخترؔ شیرانی کی نظم ''اودیس سے آنے والے بتا''، متن

(ایک نووارد ہم وطن سے کسی غریب الوطن کا خطاب)

﴿۱﴾

او دیس سے آنے والے بتا
او دیس سے آنے والے بتا کس حال میں ہیں یارانِ وطن
آوارۂ غربت کو بھی سُنا کس رنگ میں ہے کنعانِ وطن
وہ باغِ وطن ، فردوسِ وطن وہ سروِ وطن ، ریحانِ وطن
او دیس سے آنے والے بتا

﴿۲﴾

او دیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی وہاں کے باغوں میں مستانہ ہوائیں آتی ہیں؟
کیا اب بھی وہاں کے پربت پر گھنگور گھٹائیں چھاتی ہیں؟
کیا اب بھی وہاں کی برکھائیں ویسے ہی دِلوں کو بھاتی ہیں؟
او دیس سے آنے والے بتا

﴿۳﴾

او دیس سے آنے والے بتا
شاداب و شگفتہ پھولوں سے معمور ہیں گلزار اب کہ نہیں؟
بازار میں مالن لاتی ہے پھولوں کے گندھے ہار اب کہ نہیں؟
اور شوق سے ٹوٹے پڑتے ہیں نو عمر خریدار اب کہ نہیں؟
او دیس سے آنے والے بتا

06.06 اختر شیرانی کی نظم ''اودیس سے آنے والے بتا'' تشریح

﴿۱﴾ پہلے بند کی تشریح

یہ نظم جس کا عنوان ''اودیس سے آنے والے بتا'' ہے، اختر شیرانی کی بہترین نظموں میں سے ایک ہے۔ جس میں ایک شخص جو اپنے وطن سے دُور پردیس میں جا کر آباد ہو جاتا ہے، مدّتیں گزر جاتی ہیں، جس کی وجہ سے اس کے دل میں یادیں ہی یادیں آباد ہو کر اسے ایک طرح سے بے چین کرتی رہتی ہیں مگر وہ مجبور و لاچار ہے۔ زندگی کی ان ہی مجبوریوں میں گھرا ہوا ایک شخص جب اپنے وطن کے کسی دوست کو سامنے پاتا ہے تو جذباتِ وطنیت یادوں کی برسات لے کر کچھ اس طرح اُمڈ برستی ہیں کہ اشعار کی جھڑی لگ جاتی ہے یا آنسوؤں کی۔ یہاں چوں کہ اختر شیرانی ایک بے حد حسّاس طبیعت کے شاعر تھے اور ان کے وطن ٹونک شہر کے متعلّق ان سے حال چال دریافت کرتے ہیں۔ بس اس بند میں اُنہیں جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے۔

پہلے بند کے پہلے مصرعے میں شاعر بے ساختہ ہو کر اپنے دوست سے پوچھ رہا ہے کہ اے میرے دوست بتا! دوست احباب کیسے ہیں؟ میں ایک آوارۂ غربت، جو اپنے وطن سے دُور آ گیا ہوں۔ مجھے سناؤ کہ اس وطن کے لوگ کہ جہاں حضرت یوسف جیسے خوب صورت نوجوان جنم لیتے ہیں وہ کس رنگ میں ہیں؟ یعنی خوش و خرّم تو ہیں یا نہیں؟ وہ باغ کی طرح کھلتا، پھلتا پھولتا سرسبز و شاداب وطن ٹونک جو میرے لئے جنّت کی مانند ہے، کیسا ہے؟ سب دوست احباب، عزیز و اقارب ادبا و فضلا جو سرو کے درخت کی مانند ہمیشہ اونچائیوں کو چھونے کی کوشش کرتے ہیں ہمیشہ منفرد رہتے ہیں، وہ سب کیسے ہیں؟ وہ میرے ریحان وطن یعنی خوشبودار درختوں کی مانند اپنے علم اور انسانیت کی مہک لٹانے والے میرے اہلِ وطن کیسے ہیں؟ کس حال میں ہیں؟ خدارا مجھے سب کچھ بتاؤ۔ اختر نے یہاں ''بتا'' میں ایسی ''شتابی'' کا پہلو رکھ دیا ہے کہ جس میں بے تکلّفی اور بے ساختگی کی وہی شان پیدا ہو گئی ہے، جو ایک بے تکلّف دوست سے ملنے پر ہوا کرتی ہے۔

پھر یہ شخص اپنے وطن سے دُور رہ کر کس طرح اپنے لوگوں کی خیریت، اپنے وطن، اپنے شہر کے حالات جاننے کو بے قرار رہتا ہے۔ بے چین رہتا ہے اور پھر کوئی ہم وطن مل جائے تو وہ کس کس طرح کے اس سے سوال کرتا ہے، پوچھتا ہے، مخاطب کرتا ہے۔ اسی کیفیت کو اختر شیرانی نے ان مصرعوں میں ڈھالنے کی کامیاب کوششیں کی ہے۔ یہاں کنعانِ وطن سروانِ وطن اور ریحان وطن استعارے کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ ان استعارات نے شعر کی دل کشی اور تاثّر میں اضافہ کر دیا ہے اور شعر میں تہ داری اور معنی میں وسعت پیدا کر دی ہے۔ کنعان، ریحان اور سرو کی جو خوبیاں ہیں وہ سب اہلِ وطن میں شاعر محسوس کر رہا ہے، دیکھ رہا ہے بلکہ مان کر چل رہا ہے کہ اس کے وطن کے لوگ ایسے ہی ہیں۔ اپنے ہم وطنوں کو اتنی محبت، خلوص اور احترام کے ساتھ اتنے بہتر طریقے سے یاد کرنا اور پھر اس حقیقت کو نظم میں ڈھالنا اختر شیرانی کا بہترین کارنامہ ہے۔

﴿۲﴾ دوسرے بند کی تشریح

دوسرے بند میں اختر شیرانی دریافت کرتے ہیں کہ..... ''اے دوست بتاؤ! کیا اب بھی یعنی پہلے کی طرح وہاں سرسبز و شاداب باغوں میں جھوم جھوم کر مستانہ ہوائیں چلتی ہیں، جو دلوں میں سُرور، اُمنگ اور تاثیر پیدا کر دیتی ہیں۔ شگفتگی کا احساس کرا دیتی ہیں؟ کیا اب بھی وہاں کے پہاڑوں پر گھنگھور گھٹاؤں کا نشیمن ہے۔ کیا اب بھی وہاں برسات کی جھڑی ویسی ہی لگتی ہے۔ اسی طرح موسلا دھار بارش ہوتی ہے اور وہ بارش وہاں کے لوگوں کے دلوں میں گدگدی پیدا کرتی ہے..... بتا اے دوست، جلدی بتا!

ٹونک کے نوابوں کے وقت میں لگائے گئے بہت سے باغات تھے جن میں ملک اور ملک کے باہر سے بیج اور نایاب پودے اور پھول منگوا کر لگوائے گئے تھے۔ اخترؔ شیرانی کا اشارہ اُنہیں باغوں کی طرف ہے۔ اسی طرح ٹونک میں دو اونچی پہاڑیاں بہت مشہور ہیں ایک ''رسیا کی چھتری'' اور دوسری ''اَن پورنا'' کہلاتی ہے۔ پربت کا ذِکر اسی ضمن میں ہوا ہے۔ اخترؔ شیرانی نے مستانہ ہواؤں، گھنگھور گھٹاؤں اور برکھا کا دِلوں کو لبھانے کا ذکر اس خوب صورتی، سلاست، روانی، دل کشی اور بے قراری سے کیا ہے کہ نظم میں رومانیت کا عنصر غالب آ گیا ہے اور یہی اختر کی شاعری کی پہچان بھی ہے۔ ہوا کے مستانہ ہونے کا تصوّر، گھٹا کا گھنگھور ہونا اور برکھا کا دلوں کو لبھانا ایسے اشارے ہیں جو لطافت پیدا کرتے ہیں۔ بلاشبہ اخترؔ نے اپنی یادوں میں بسے اپنے وطن کے مناظرِ قدرت کی تصویر کشی نہایت سلیقے اور کامیابی سے کی ہے اور دوست کو اس طرح مخاطب کیا ہے کہ ہر پڑھنے سننے والے کو محسوس ہوتا ہے کہ واقعی پردیس میں اپنے دیس کی یادیں اسی طرح دیوانہ کر دیتی ہیں۔

﴿۳﴾ تیسرے بند کی تشریح

ابتدا سے ہی ٹونک کی فضا میں خوشبو کا بڑا دخل رہا ہے۔ وہاں باغ بہت تھے جن میں موگرا، چنبیلی، چمپا اور گلاب کے پودوں اور مورسلی وغیرہ کے درختوں کی بھرمار تھی۔ جب ان پھولوں کے گندھے ہار مالنیں جب بازار میں لے کر آتیں تو بازار مہک اُٹھتا اور خریدار ٹوٹ پڑتے۔ ایک معمولی رکشا چلانے والا تک گرمیوں کی شام کو جب کوئی غزل گنگناتا ہوا، گلے اور کلائی میں موگرے کے پھولوں کا ہار ڈالے مدمست ہو کر رکشا چلاتا تھا تو اس میں بیٹھنے والے گراہک کو بھی اس کے جمالیاتی حُسن پر رشک آنے لگتا تھا۔ پانچ چھ سال قبل تک ایک روپئے کے پانچ ہار ملتے تھے۔ وہ سب باقاعدہ پکّے دھاگے میں گندھے ہوتے تھے۔ بے حد اہتمام سے پروئے ہوئے یہ ہار آج بھی ایک روپئے کا ایک دَست یاب ہے۔ ان کا چلن اب بھی ویسا ہی ہے جیسا اخترؔ شیرانی کے زمانے میں تھا۔ شام کو اکثر مرد اپنے گھر جاتے وقت اُنہیں خرید کر لے جاتے ہیں۔

اخترؔ شیرانی نے اس بند میں اُنہیں تمام رواجوں کی طرف اشارہ کیا ہے اور اپنے ہم وطن سے پوچھ رہے ہیں کہ مجھے بتا اے دوست! کیا اب بھی باغوں میں مہکتے تر و تازہ پھولوں کی بہار ہے، کیا اب بھی مالنیں بازار میں ہار پرو کر لاتی ہیں؟ کیا اب بھی ان کے خریدار اتنی ہی تعداد میں ہوتے ہیں جتنی کہ میں نے دیکھی تھی یا ہم تم دیکھا کرتے تھے؟ ٹوٹ پڑنا، محاورہ کو اخترؔ نے بڑی کامیابی سے برتا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۸﴾ نظم ''او دیس سے آنے والے بتا'' میں کس علاقے کی تہذیب کی عکّاسی ملتی ہے؟

﴿۹﴾ نظم میں شاعر کس جذبے سے سرشار ہے؟

﴿۱۰﴾ نظم کے آخری بند میں 'ٹوٹے پڑنا' سے کیا مراد ہے؟

06.07 اخترؔ شیرانی کی نظم ''او دیس سے آنے والے بتا'' تجزیہ

اخترؔ شیرانی کی مشہور نظم ''او دیس سے آنے والے بتا'' جذباتِ وطنیت کی مکمّل ترجمان ہے۔ یہ حُبُّ الوطنی کی ایک شاہ کار مثال ہے بلکہ یہ اُردو کے منظوم لٹریچر میں اپنا ایک خاص مقام اور وزن رکھتی ہے۔ اس نظم کی اشاعت کے بعد اس دَور کی اردو دنیا میں ایک ہلچل سی مچ گئی تھی اور پنجاب کے ادبی و شعری حلقوں میں یہ نظم سب سے زیادہ بلند مقام پر تھی۔ اس نظم کی رومانی فضا کو دیکھ کر بعض ناقدین نے فیصلہ کر دیا تھا

کہ اختؔر نے ''اس نظم کی اُڑان سے صرف خیالی دنیا آباد کی ہے حقائق وواقعات سے اس کا دُور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔'' لیکن یہ بھی مکمّل سچائی ہے کہ اس نظم میں ٹونک کی وادیاں اور اس کے باغ، اس کی رنگینیاں، اس کی بدلیاں اور اس کی پہاڑیاں وآبادیاں۔

غرض ان تمام حقیقتوں کو اس کامیابی کے ساتھ نظم کیا ہے کہ اس میں افسانوی رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ اختؔر نے خود اس نظم کو اپنی نظموں میں سب سے زیادہ پسندیدہ قرار دیا ہے اور ایک خط میں اعجاز سکندر نازشؔ کو لکھتے ہیں:

''یہ بتانا کہ اپنی نظموں میں کون سب سے زیادہ عزیز ہے، بہت مشکل ہے لیکن اگر مجھے یک بیک جواب دینے پر مجبور کیا جائے تو شاید ''اور دیس سے آنے والے بتا'' کا نام لوں۔ اس کی شانِ نزول کیا ہے؟ صرف وہ تاثّرات جو ایک دیس سے آنے والے سے برسوں کے بعد مل کر کسی غریب الوطن پر مرتّب ہوتے ہیں اور آنسو یا شعر بن کر چھلک پڑتے ہیں۔ یہ واضح رہے کہ جہاں بچپن گزارا ہو اس مقام کی یاد تو ہر ایک کے گوشۂ دل میں چھپی رہتی ہے لیکن جس شخص کو اس مقام سے جُدا ہوئے پندرہ سال گزر چکے ہوں، اس کی تلخیِ جذبات اور شدّتِ احساس ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے میرا بھی ایسا ہی حال تھا۔''

(ماخوذ از مکاتیب نمبر ''نقوش'' لاہور)

اختؔر کی شاعری میں رومانی عنصر کی دو جہتیں نمایاں تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ ایک عالم کے گھر میں پیدا ہوئے تھے اور دوسرے ٹونک کی علمی وادبی فضا اور وہاں کے ذرّے ذرّے میں مچلتا رومان۔ راہیؔ شہابی نے اپنے مضمون ''اختؔر شیرانی کی شاعری کا دوسرا رُخ'' میں لکھا ہے:

''جب تک اختؔر کا عہدِ شباب تھا، ٹونک کا آفتاب اقبال عروج پر تھا۔ ٹونک آبادی کے لحاظ سے ایک چھوٹا سا شہر یا بڑا قصبہ ہے۔ چاروں جانب سر بہ فلک پہاڑ اور ان پہاڑوں کے دامن میں بل کھاتی حسین وخوش نما باناس ندی ہے۔ آئے دن ساحلِ باناس پر میلے لگا کرتے ہیں۔ کھیل تماشے ہوا کرتے ہیں۔ برسات کے دنوں میں اور گرمیوں کی ٹھنڈی چاندنی راتوں میں تو ٹونک کی رنگینیاں پوری طرح جوان ہو جاتی ہیں۔ برسات میں ''نوگزے'' (مقام) ساحل پر جھومتے ہوئے بڑے بڑے درختوں کی شاخیں جھولوں کا نشیمن بن جاتی ہیں۔ جن پر معصوم وحسین دوشیزائیں تیتریوں کی طرح لہرا لہرا کر برکھا کے رنگین ترانے اَلاپتی ہیں۔ گرمیوں کی چاندنی راتوں میں ''ککراج'' اور ''گلوڈ'' کے کنارے ندی کی ٹھنڈی ریت پر حُسن و جمال اور شباب ورعنائی کی جنت اُتر آتی ہے۔ کہیں ''چار بیت'' گائی جا رہی ہیں تو کہیں شعر وسخن کی محفل جمی ہوئی ہے۔ کہیں کچھ نازک اندام کے نقرئی قہقہے فضاؤں میں نغمگی پیدا کر رہے ہیں..... غرض وہاں عشق ومستی اور کیف ورنگینی کا ایک حشر بپا رہتا ہے..... اختؔر کا خمیر اسی خاک سے اُٹھا تھا۔''

اختؔر شیرانی نے اپنی نظم ''اودیس سے آنے والے بتا'' میں ٹونک شہر کی اُنہیں پُر فضاؤں اور یادوں کو بڑے مؤثّر انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ کم عمری میں ہی ٹونک سے شعر کہتے ہوئے لاہور گئے تھے۔ چنانچہ جاتے ہی لاہور کے رسالوں اور اخباروں میں آپ کی نظمیں شائع ہونے لگیں اور شہرت ومقبولیت حاصل ہوتی گئی لیکن اختؔر شیرانی کو اپنے وطن ٹونک سے بے پناہ محبت تھی، جس کا مؤثّر بیان ان کی تمام شاعری میں نظر آتا ہے۔ ''اودیس سے آنے والے بتا'' میں اُنہوں نے وطن دوستی کے پاک جذبے کو جس سادہ اور سلیس انداز سے اپنی شاعری کے ہار

میں پرو دیا ہے وہ اردو شاعری لے لئے عظیم سرمایہ ہے۔ ماضی کی حسین یادیں اختؔر کا پیچھا نہیں چھوڑتیں، چاہے وہ میٹھی ہوں یا کڑوی، انسان کی زندگی میں رَس گھولتی رہتی ہیں۔ اختؔر شیرانی کا کلام بھی یادوں کا کلام کہا جا سکتا ہے۔ اس نظم یں وہ وطن کی یاد میں ڈوب کر دیس سے آنے والے سے دیس کا حال چال دریافت کرتے ہیں۔ ان کے ایک دوست اور ٹونک کے نام وَر شاعر صاحبزادہ حامد سعید خاں ساحلؔ جب ٹونک سے لاہور گئے اور اختؔر سے ملے تو ان سے مخاطب ہو کر اختؔر نے یہ نظم لکھی۔ چنانچہ اس نظم کے پس منظر میں ہم ٹونک کے سماجی، تہذیبی، تاریخی اور رومانی زندگی کو بخوبی دیکھ سکتے ہیں، جس میں اپنے پرائے، ندی نالے، پہاڑ، دھوپ چھاؤں، چاند سورج، جھولے، پیڑ پودے، پنگھٹ، پہاڑیاں، چوپال، بازار، دَر و بام، گلیاں، کوچے، دوست، محبوبائیں، دوشیزائیں..... سبھی کو اختؔر شیرانی نے اپنی نظم میں یاد کیا ہے اور ان کا حال چال پوچھا ہے۔ ہر غریب الوطن کے دل میں احساس اور زبان پر یہی کلمہ رہتا ہے کہ ''ہم تو ہیں پردیس میں اور دیس میں نکلا ہوگا چاند'' اور چاند پر نظر پڑتی ہے تو یادیں اُبھر آتی ہیں۔ مسلسل یادیں، دیس بدیس کی یادیں، آدمی کے دل میں اُترتی بچپن سے لڑکپن اور لڑکپن سے جوانی میں قدم رکھتے ہوئے دنوں کی یادیں..... اپنا شہر، اپنے لوگ، اپنی زمین، اپنا آسمان، اپنا کلچر، اپنی تہذیب، اپنے سکھ دکھ، کچھ کھٹّے میٹھے..... یہ سب وطن سے دُور رہنے والے کو اتنی شدّت سے ستاتے ہیں کہ مانو وہ جس جگہ رہ رہا ہے وہاں کوئی رونق ہی نہ ہو۔ تمام رونقیں، تمام یادیں بس اسی وطن تک سمت کر رہ جاتی ہیں۔ گویا جسم پردیس میں اور رُوح دیس میں ہی رہ جاتی ہے۔ اختؔر شیرانی نے اُنہیں جذبات کی ترجمانی نہایت مؤثّر انداز میں اس نظم میں کی ہے، جس کی سلاست، روانی، سادگی، صداقت اور دل میں گھر کر جانے والا اندازِ بیان بے شک اس نظم کو اردو نظم نگاری کی دنیا میں ممتاز مقام عطا کرتا ہے۔

06.08 خلاصہ

غرض یہ کہ اختؔر شیرانی نے اپنے وطن کی ایک ایک یاد کو شعر کا جامہ پہنا دیا ہے اور اس خوب صورت نظم کا حصّہ بنا دیا ہے۔ حقیقت کو اس طرح خیال کی ہم آہنگی سے ایسے بیان کرنا کہ حقیقت ایک جادوئی دنیا کا احساس کرا دے یا پھر واقعات کو اس طرح افسانوی رنگ میں ڈھال دینا کہ اس میں رومان پیدا ہو جائے بلاشبہ اختؔر کا کارنامہ ہے اور یہی وہ رومان ہے جس کی وجہ سے اختؔر شیرانی اردو ادب میں اپنی علیحدہ پہچان رکھتے ہیں۔ وہ حُسن اور رومان کی تکمیل میں صوتی آہنگ، موسیقی، صوتی تلذّذ پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں۔ ان کے یہاں حُسن پرستی کا انداز ایک عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔

حالاں کہ اختؔر کا دعویٰ تھا کہ ان کی شاعری تصوّف سے پاک ہے۔ اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ ان کا عشق ایک ماورائی کیفیت لیے ہوئے تھا۔ ان کی شاعری میں ہوس اور شہوانی جذبے کی پرچھائیاں ضرور نظر آتی ہیں لیکن ان کی فطرت کا کوئی جوہر ایسا تھا جو ان چیزوں کو بھی پاکیزہ بنا دیتا ہے۔ اُنہوں نے آزادی کے ترانے بھی گائے اور وطن دوستی کے بھی۔ آزادی پر اپنا عشق تک قربان کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور وطن پرستی کا جذبہ جب جوش دکھاتا ہے تو وہ ساقی کو بھی تلوار اُٹھانے کا مشورہ دیتے نظر آتے ہیں۔ ان کی وطنی نظموں میں اس مٹّی کی سوندھی خوشبو نمایاں طور پر موجود ہے۔ جس مٹّی میں ان کا جنم ہوا، پرورش ہوئی، لڑکپن کھیلا، عہدِ شباب میں قدم رکھا، بس یہی ارضیت ان کی نظموں کی جان ہے۔

''او دیس سے آنے والے بتا'' کے علاوہ نذرِ وطن، وادیِ گنگا میں ایک رات، اے عشق کہیں لے چل، سلمیٰ، عذرا، جہاں ریحانہ رہتی ہے، ایک شاعر کی شادی پر، اے سرزمینِ گجرات، سرزمین عشق، فنونِ لطیفہ کی دنیا میں، ساقی اُٹھ تلوار اُٹھا، گلبانگِ قفس وغیرہ نظمیں مشہور ہیں۔

06.09 فرہنگ

ادبا : بہت سے ادیب، ادیب کی جمع

ادراک : عقل، پانا، دریافت کرنا

ارضیت : زمین سے متعلّق، زمین

استدلال : دلیل لانا، دلیل طلب کرنا

آماجگاہ : وہ جگہ جہاں نشانہ رکھیں اور مراد اس سے شاہ نشین بھی ہوا ہے۔

اہل وعیال : گھر کے لوگ (بیوی بچّے وغیرہ)

تخیل : کسی چیز کا خیال میں لانا

تغزّل : غزل کہنا، غزل کا آہنگ

فضلا : فاضل کی جمع، علما

منفرد : تنہا، اکیلا، واحد

نزول : نازل ہونا، اترنا

وسعت : پھیلاؤ، کشادگی

06.10 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درجِ ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : اختؔر شیرانی کے مختصر حالاتِ زندگی لکھئے؟

سوال نمبر۲ : اختؔر شیرانی کے رومانی انداز کی ترجمانی کیجیے؟

سوال نمبر۳ : نظم ''اودیس سے آنے والے بتا'' میں ٹونک کی کن کن فضاؤں کا ذکر آیا ہے؟

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : اختؔر شیرانی کی نظم گوئی پر روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر۲ : اختؔر شیرانی کی شاعری میں جذبۂ حبّ الوطنی کی نشان دہی کیجیے۔

سوال نمبر۳ : ''اودیس سے آنے والے بتا'' اس نظم کا اردو شاعری میں کیا مقام ہے؟ بتائیے۔

06.11 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اردو میں رومانوی تحریک از محمّد حسن

۲۔ جدید اردو ادب از محمد حسن، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی، ۱۹۷۵ء

۳۔ کلیات اختؔر شیرانی از گوپال متّل، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۱۹۹۷ء

06.12 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ اختؔر شیرانی ٹونک، راجستھان میں پیدا ہوئے تھے اور ان کے والد کا نام حافظ محمود شیرانی تھا۔

﴿۲﴾ اختؔر کے اہم شاگردوں میں ن.م. راشد، احمد ندیم قاسمی، مرزا ادیب وغیرہ شامل ہیں۔

﴿۳﴾ پھولوں کے گیت، شعرستان، اخترستان، طیورِ آوارہ، لالۂ طور

﴿۴﴾ اختؔر شیرانی رومانی شاعر ہیں۔

﴿۵﴾ سانیٹ اور ماہیے

﴿۶﴾ کچھ تو تنہائی کی راتوں کا سہارا ہوتا ☆ تم نہ ہوتے نہ سہی ذکر تمہارا ہوتا

﴿۷﴾ رومانی شاعری کی

﴿۸﴾ ٹونک، راجستھان کی

﴿۹﴾ حُبُّ الوطنی

﴿۱۰﴾ ٹوٹے پڑنا کے معنی ہجوم ہونا، بھیڑ ہونا ہے جب کہ آخری بند میں اس سے مراد بہت زیادہ خریدار ہونا ہے۔

بلاک نمبر 03

اکائی 07	مخدوم محی الدین،نظم ''چارہ گر''	ڈاکٹرعرشیہ جبیں
اکائی 08	فیض احمد فیضؔ (صُبحِ آزادی)	ڈاکٹرعزیزہ بانو
اکائی 09	اسرارالحق مجازؔ (آوارہ)	ڈاکٹرنکہت جہاں

اکائی 07 : مخدوم محی الدین، نظم ''چارہ گر''

ساخت

07.01 : اغراض ومقاصد

07.02 : تمہید

07.03 : مخدوم محی الدّین کے حالاتِ زندگی

07.04 : مخدوم محی الدّین کی نظم گوئی

07.05 : مخدوم محی الدّین کی نظم ''چارہ گر''، متن

07.06 : مخدوم محی الدّین کی نظم ''چارہ گر''، تشریح

07.07 : مخدوم محی الدّین کی نظم ''چارہ گر''، تجزیہ

07.08 : خلاصہ

07.09 : فرہنگ

07.10 : نمونہ امتحانی سوالات

07.11 : حوالہ جاتی کتب

07.12 : اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

07.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی کے مطالعے کا مقصد آپ کو اردو کے ایک معروف ترقّی پسند شاعر مخدوم محی الدّین کی شخصیت اور شاعری سے واقف کرانا ہے۔ اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ مخدوم کی حیات، شخصیت، ترقی پسند تحریک سے ان کی وابستگی اور ان کی نظم نگاری کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں گفتگو کر سکیں۔

07.02 تمہید

مخدوم محی الدّین کا شمار اردو کے ممتاز ترقی پسند شاعروں میں ہوتا ہے۔ اردو نظم گوئی میں نئے موضوعات اور ہیئت کے تجربے کرنے والے شاعروں میں مخدوم کا نام سرِ فہرست ہے۔ مخدوم کی شاعری رومان وانقلاب کا حسین سنگم ہے۔ عوام سے قریبی تعلّق اور عوامی جدوجہد کے ذاتی تجربے کی وجہ سے ان کی انقلابی شاعری میں گھن گرج کے بجائے انسانی ہم دَردی اور عالمی بھائی چارے کا پہلو اُبھر کر سامنے آتا ہے۔

07.03 مخدوم محی الدّین کے حالاتِ زندگی

مخدوم کا پورا نام ابوسعید محمد مخدوم محی الدین خدری ہے۔۴؍فروری ۱۹۰۸ء کو تلنگانہ کے قصبے اندول ضلع میدک، آندھرا پردیش میں پیدا ہوئے۔ مخدوم کا شجرۂ نسب حضرت ابوسعید خدری سے ملتا ہے جو حضور اکرم ﷺ کے صحابی تھے۔ کہا جاتا ہے کہ مخدوم کے ددھیالی اجداد میں سے رشید الدین نامی ایک صاحب شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر کی فوج کے ساتھ اعظم گڑھ سے حیدر آباد آئے اور یہیں پر ہمیشہ لے لئے سکونت اختیار کر لی۔ مخدوم کے نانا سید جعفر علی کا تعلق بھی شمالی ہند سے تھا۔ وہ غدر کے ہنگاموں کی وجہ سے شاہجہاں پور (یو پی) سے میدک آئے تھے۔

مخدوم کا خاندان مذہبی روایات کی پاس داری اور اپنی علمیت کی وجہ سے معزز و ممتاز تھا۔ مخدوم کے والد غوث محی الدّین تعلقہ اندول میں تحصیل کے اہلکار کے عہدے پر فائز تھے۔ چار سال کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اور والدہ کی دوسری شادی کرادی گئی جس کی وجہ سے مخدوم کا بچپن والدین کی شفقت سے محروم رہا۔ چچا بشیر الدین نے ان کی پرورش کی ذمہ داری سنبھالی۔ چچا بھی والد کی طرح اہلکار تھے جو بعد میں تحصیل دار بنے۔ چچا کی مشفقانہ شخصیت کے زیرِ نگرانی مخدوم نے تربیت پائی۔ گھر کے مذہبی ماحول نے ان سے تمام دینی کام کروائے۔ نماز کی پابندی سے لے کر فرش کی صفائی نمازیوں لے لئے وضو کے پانی کا انتظام معزّز بزرگوں کے احکام کی تکمیل غرض ایک فرماں بردار کی حیثیت سے مخدوم کا بچپن گزرا۔

عربی اور قرآن شریف کی تعلیم گھر میں حاصل کی پھر چچا کے ساتھ حیدر آباد آئے اور منشی کا امتحان پاس کیا۔ بعد ازاں چچا کا تبادلہ میدک ہوا تو اُنہوں نے میدک سے انگریزی کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۲۹ء میں اُنہوں نے جامعہ عثمانیہ میں انٹرمیڈیٹ میں داخلہ لیا۔ انٹر میڈیٹ کے بعد ۱۹۳۴ء میں بی.اے سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا اور ۱۹۳۶ء میں ایم.اے (اردو) کی سند حاصل کی۔ تعلیم کے دَوران مخدوم مالی مسائل سے دوچار ہوئے تو انہوں نے اپنے اخراجات کا بوجھ اُٹھانے لے لئے ٹیوشن کیے۔ ایک صاحب لے لئے عشقیہ خطوط لکھے اور پانی کے برتن، تصاویر، پینٹنگز وغیرہ فروخت کیے اور مترجم کے حیثیت سے بھی اُنہوں نے کام کیا۔ ۱۹۳۹ء میں مخدوم کا تقرّر بحیثیت لکچرار سٹی کالج حیدر آباد میں ہوگیا۔ کوئی دو سال تک اُنہوں نے کام کیا۔ اسی دَوران وہ سیاسی اور اشتراکی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے جس کی وجہ سے اُنہیں ۱۹۴۱ء میں ملازمت سے استعفیٰ دینا پڑا۔

۱۹۲۵ء سے ۱۹۵۵ء تک مخدوم نے بیرونی ممالک کے کئی دَورے کیے۔ یہ دَورے امن کانفرنس، الیکشنوں اور ٹریڈ یونینوں کے عالمی فیڈریشن کی مختلف تقاریب کے سلسلے میں ہوتے تھے۔ مخدوم نے چین، سوویت یونین، مشرقی یورپ کے ممالک اور افریقہ کا بھی دَورہ کیا۔ وہاں اُنہوں نے دوسری جنگ عظیم سے پیدا شدہ مسائل کا ذاتی مشاہدہ کیا اور اس مسائل کے حل کا جائزہ بھی لیا۔

اس دَوران مخدوم کی شادی ۲۲؍اگست ۱۹۳۳ء کو ان کی چچازاد بہن رابعہ بیگم سے ہوگئی۔ مخدوم کے تین لڑکے محمد سعید الدین، نصرت محی الدین، ظفر الدین اور دو لڑکیاں ذکیہ بیگم اور رفیعہ بیگم ہوئیں، جن میں محمد سعید الدین اور رفیعہ بیگم کا انتقال بچپن میں ہی ہوگیا۔

مخدوم کے ادبی سفر کا آغاز طالبِ علمی کے زمانے ہی میں ہوگیا تھا۔ اُنہوں نے بحیثیت شاعر طالب علمی کے زمانے میں ہی شہرت حاصل کر لی تھی۔ شاعری کے علاوہ مخدوم نے ڈرامے بھی لکھے۔ ''ہوش کے ناخن''، ''مرشد اور پھول بن'' ان کے ڈرامے ہیں۔ مخدوم محی الدینے ۲۵؍اگست ۱۹۶۹ء میں ۶۱؍برس کی عمر میں انتقال کیا۔

﴿۱﴾ مخدوم محی الدین کی شخصیت:۔

مخدوم نے متوسط طبقے کے ایک معزز اور وضع دار گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔ چچا کی مشفقانہ شخصیت کے زیر سایہ اُنہوں نے تربیت حاصل کی۔ چچا کے خیالات اور برتاؤ سے وہ بہت متاثر تھے۔ مساوات اور انسان دوستی کے تصوّرات سے ان کا بچپن مالا مال تھا۔ چچا کی زندگی اور گھر کے ماحول نے ان کی شخصیت کی تعمیر میں ایک اہم رول ادا کیا۔ ان کی شخصیت میں خودداری، خوش مزاجی، ملنساری، سادگی اور اخلاص و ہم دَردی کے اوصاف اسی پاکیزہ ماحول کی دین ہیں جو اُنہیں بچپن میں میسر ہوا۔

مجموعی حیثیت سے مخدوم کی شخصیت بڑی جاذبِ نظر تھی۔ جو بھی ان سے ایک بار مل لیتا وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ خلوص و ہم دَردی ان کی شخصیت کا جزو خاص تھی۔ ان کے لہجے میں مٹھاس اور انداز گفتگو نہایت پُرکشش تھا۔ اس لئے لوگ ان سے بہت جلد متاثر ہوتے اور دیر تک اس کا اثر ان پر قائم رہتا۔ مخدوم کی شخصیت کے بارے میں مجموعی حیثیت سے ہمیں داؤد اشرف سے متّفق ہونا پڑتا ہے:

> ''مخدوم کی شخصیت میں بڑی جاذبیت ہے۔ وہ صداقت پسندی اور خلوص کا پیکر ہیں۔ بحیثیت انسان مخدوم بڑے غیر معمولی انسان ہیں۔ ان کی رفتار و گفتار اور طرزِ گفتگو میں غیر معمولی کشش ہے۔ جو بھی ان سے ملتا ہے ان کی شخصیت کو محسوس کیے بغیر نہیں رہتا۔ ان کی ہر بات میں خلوص ہوتا ہے۔ اس لئے ان سے ملنے پر جو تاثرات پیدا ہوتے ہیں وہ دیرپا ہوتے ہیں۔''
>
> (مخدوم ایک مطالعہ، ص ۴۷، ۱۹۶۹ء)

مخدوم کی شخصیت کئی اوصافِ حمیدہ کی حامل تھی۔ ایک سچا ترقی پسند شاعر وہ ہوتا ہے جس میں عوام سے ہم دَردی اور اخلاص کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہو۔ بحیثیت انسان مخدوم میں وہ تمام صفات موجود تھیں جو ایک سچے شاعر اور عوام کے ہم دَرد لیڈر میں ہونی چاہیے۔ مجموعی حیثیت سے مخدوم کی شخصیت بہترین اخلاق کی حامل تھی۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۱﴾ مخدوم محی الدین کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟

﴿۲﴾ مخدوم محی الدین کی شخصیت کیسی تھی؟

﴿۳﴾ شاعری کے علاوہ مخدوم نے کس صنف میں طبع آزمائی کی؟

18.04 مخدوم محی الدین اور ترقی پسند تحریک

مخدوم محی الدین کا شمار اردو کے معتبر ترقی پسند شاعروں میں ہوتا ہے۔ ان کے گھر کا ماحول نہ صرف مذہبی تھا بلکہ اس میں انسان دوستی اور حُبُّ الوطنی کے عناصر کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ ان کے چچا بچپن میں اُنہیں گاندھی جی، محمد علی جوہر اور بی اماں کے واقعات کے ساتھ ساتھ روس کے ظالم بادشاہ کے قصے بھی سنایا کرتے تھے اور یہ بھی بتاتے کہ کس طرح عوام نے اس ظالم بادشاہ کی حکومت کا خاتمہ کیا اور اپنی عوامی حکومت قائم کی اور کس طرح وہاں امیر اور غریب برابر ہو گئے۔ مخدوم کے چچا خود خلافت تحریک کے سرگرم رکن تھے۔ اس طرح گھر کے ماحول اور چچا کی تربیت کا مخدوم کی شخصیت پر گہرا اثر پڑا۔ ایسے ماحول میں پل کر جوان ہونے والا ظاہر ہے عوام کی رہنمائی کا کام اپنے سر ضرور لے گا۔ چنانچہ مخدوم محی الدین خفیہ طور پر ۱۹۳۴ء میں کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ ہو گئے۔

ہندوستان میں ترقی پسند مصنّفین کی انجمن کا قیام اپریل ۱۹۳۴ء ہوا جس میں علی گڑھ کے چند اشتراکی خیالات کے طلبا بھی شامل تھے، ان طلبا میں سبطِ حسن کا نام قابلِ ذکر ہے۔ سبطِ حسن اپنی تعلیم مکمل کر کے جب حیدر آباد پہنچے تو اُنہوں نے قاضی عبدالغفار کی مدد سے حیدر آباد کے ادیبوں کو اس تحریک سے روشناس کرایا۔ اس طرح سبطِ حسن کی کوششوں سے حیدر آباد میں ترقی پسند نوجوانوں کا ایک حلقہ وجود میں آ گیا۔ ان میں مخدوم محی الدین ایک سرگرم رکن تھے۔ ان ترقی پسند ادیبوں کی محفلیں عام طور سے نام وَر شاعرہ سروجنی نائیڈو کے مکان پر 'گولڈن تھریشولڈ' میں منعقد ہوتی تھیں۔ ۱۹۴۰ء میں جب حیدر آباد میں کمیونسٹ پارٹی کا قیام عمل میں آیا تو مخدوم اس کے ممبر ہو گئے۔ اس زمانے میں تمام سیاسی پارٹیوں پر پابندی تھی اس لئے کمیونسٹ پارٹی بھی خفیہ طور پر کام کر رہی تھی۔ ان کی میٹنگیں بھی خفیہ ہوا کرتی تھیں۔

حیدر آباد میں ترقی پسند مصنّفین کی عارضی انجمن پہلے سے موجود تھی لیکن اس کی باضابطہ تشکیل ۱۹۴۳ء میں ہوئی اور مخدوم پہلے کی طرح اس کے سرگرم رکن بنے رہے۔ ترقی پسند تحریک سے مخدوم کی وابستگی، مخدوم اور تحریک دونوں کے لئے مفید ثابت ہوئی۔

مخدوم نے عملی طور پر میدانِ سیاست قدم رکھا تو پہلے برطانیہ حکومت اور نظام حیدر آباد کی کھل کر مخالفت کی جس کی وجہ سے اُنہیں کئی مرتبہ جیل جانا پڑا اور روپوشی کی زندگی بھی گزارنی پڑی۔ ۱۹۴۶ء میں حیدر آباد ٹریڈ یونین کانگریس کی صدارت کی اور اُنہیں فوراً گرفتار کر لیا گیا اور پھر ضمانت پر رہائی حاصل ہوئی۔ پھر سیمنٹ فیکٹری ٹریڈ یونین کی سرگرمیوں کے سلسلے میں ان کے نام وارنٹ جاری ہوا تو وہ پارٹی کی ہدایت پر روپوش ہو گئے۔ اس طرح ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۱ء تک روپوش رہے۔ ۱۹۵۱ء میں جب کانگریس پارٹی برسر اقتدار آئی تو پارٹی کی مخالفت کے سلسلے میں اُنہیں ۱۹۵۱ء میں گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ ۱۹۵۲ء میں حلقہ شاہ بند سے اسمبلی اور حلقہ حیدر آباد سے لوک سبھا کے امیدوار کی حیثیت سے انتخابات میں حصہ لیا لیکن اُنہیں دونوں حلقوں سے شکست اُٹھانی پڑی پھر ضمنی انتخابات میں اسمبلی لے لئے حضور نگر سے کامیابی حاصل ہوئی۔

مخدوم ایک کمیونسٹ لیڈر کی حیثیت سے تحریک کے سلسلے میں ۹/ مارچ ۱۹۵۳ء جولائی ۱۹۵۵ء تک ہندوستان سے باہر رہے۔ اس دَوران ایشیا، یورپ اور افریقی ممالک کا دَورہ کیا۔

اس طرح مخدوم کی ادبی اور سیاسی زندگی ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ عملی طور پر سیاسی زندگی کے تجربات نے ان کی ادبی زندگی کو متاثر کیا۔ اس دَوران اُنہوں نے کئی نظمیں لکھیں جن میں ترقی پسند اور اشتراکی خیالات کی گونج سنائی دیتی ہے۔ مخدوم عملی طور پر چوں کہ عمر بھر مصروف کار رہے۔ اس لئے ان کی بیش تَر تخلیق عام طور پر چلتے پھرتے اور اُٹھتے بیٹھتے ہی ہوا کرتی تھی۔ ان کی بیش تَر نظمیں ان کی اسی معروضیت کی دین ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۴﴾ مخدوم محی الدین ترقی پسند تحریک سے کب وابستہ ہوئے؟

﴿۵﴾ کیا مخدوم کی سیاسی زندگی نے ان کی ادبی زندگی کو نقصان پہنچایا؟

﴿۶﴾ مخدوم نے کس حلقۂ لوک سبھا سے چناؤ لڑا؟

07.04 مخدوم محی الدّین کی نظم گوئی

مخدوم کو شاعری کا ذوق ورثے میں ملا تھا اور ان کی شاعری کی ابتدا طالب علمی کے زمانے میں ہوئی تھی۔ مخدوم نے نظمیں بھی کہی ہیں اور غزلیں بھی لیکن ان کی شہرت نظم نگاری کی حیثیت سے زیادہ ہے۔ ان کی پہلی نظم ''پیلا دوشالہ'' ۱۹۳۳ء میں منظر عام پر آئی۔ یہ ایک مزاحیہ نظم ہے جس کی وجہ سے مخدوم کو حیدر آباد کے ادبی حلقوں میں خوب مقبولیت حاصل ہوئی۔ مخدوم نے اپنی شاعری پر کسی سے اصلاح نہیں لی۔ وہ امیر مینائی کی غزلوں اور عظمت اللہ خان کی نظموں سے بے حد متاثر تھے۔ ان کے علاوہ میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ، فانیؔ، اصغرؔ، حفیظؔ جالندھری، جوشؔ ملیح آبادی اور اخترؔ شیرانی سے بھی اُنہوں نے اثر قبول کیا۔

مخدوم کے تین شعری مجموعے ہیں۔

(۱) پہلا مجموعۂ کلام ''سرخ سویرا'' ۱۹۴۴ء

(۲) دوسرا مجموعۂ کلام ''گلِ تر'' ۱۹۶۱ء

(۳) تیسرا مجموعۂ کلام ''بساطِ رقص'' ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا۔

نوٹ: ان کی بعض نظموں کے ترجمے ہندی، تلگو، مرہٹی، بنگالی کے علاوہ انگریزی، روسی اور جرمنی وغیرہ میں شائع ہو چکے ہیں۔

﴿۱﴾ مخدوم محی الدین کی رومانی شاعری

مخدوم کی ابتدائی شاعری میں رومان کی جھلکیاں زیادہ نظر آتی ہیں۔ ان کی نظمیں ''طور''، ''آتش کدہ''، ''انتظار''، ''سجدہ''، ''جوانی'' اور ''ساگر کے کنارے'' وغیرہ میں داخلی جذبات و احساسات کا اثر زیادہ اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ رومانی شاعری کے تعلّق سے کہا جاتا ہے کہ وہ حالات سے بے زار اور تخیل کی دنیا کا پروردہ ہوتا ہے۔ مخدوم بھی اسی طرح کے شاعر نظر آتے ہیں۔ ان کے بچپن اور جوانی کا زمانہ مایوسی اور نا اُمیدی میں گزرا۔ وہ بے شمار مسائل و مصائب کا شکار رہے لیکن ان کی شوخ طبیعت نے اُنہیں حالات کا گرویدہ ہونے کے بجائے زندگی جینے کا سلیقہ سکھایا۔ عنفوانِ شباب میں دیگر نوجوانوں کی طرح اُنہوں نے بھی سچا عشق کیا ہے اور اپنے عشق کا اظہار اپنی شاعری کے ذریعے کیا ہے۔

مثلاً ان کی نظم ''طور'' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یہیں کی تھی محبت کے سبق کی ابتدا میں نے
یہیں کی جرأت اظہار حرف مدعا میں نے
یہیں دیکھے تھے عشوے ناز و اندازِ حیا میں نے
یہیں پہلے سنی تھی دل دھڑکنے کی صدا میں نے
یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

مخدوم نے اپنے قلبی واردات اور تجربات کو نہایت دل کش اور اچھوتے انداز میں پیش کیا ہے۔ اُنہوں نے فرسودہ مضامین اور کہی ہوئی باتوں کو دہرایا نہیں ہے بلکہ جب وہ اپنے وارداتِ قلبی کو پیش کرتے ہیں تو ان کے انوکھے انداز اور سلیقے کی شگفتگی کی وجہ سے ان کی بات بالکل نئی معلوم ہوتی ہے اور یہی مخدوم کی شاعری کی اہم خصوصیت ہے کہ ان کے یہاں محبت کرنے کا انداز بھی بالکل جدا معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً:

نہ ماتھے پر شکن ہوتی تھی جب تیور بدلتے تھے
خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے

ایک اور شعر ملاحظہ ہو

جو چھو لیتا میں اس کو ، وہ نہا جاتی پسینے میں
مئے دو آتشہ کا مزہ آتا تھا جینے میں

یہ اشعار مخدوم کی محبت کی پاکیزگی اور طہارت کی دلیل ہیں۔شاعر کا ذوق اور اس کے محبت کرنے کا انداز دیگر شعرا کے مقابلے میں نیا اور انوکھا معلوم ہوتا ہے۔

مخدوم کی رومانی شاعری کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ ان کے یہاں غمِ ہجر کا احساس بھی ملتا ہے۔اُنہیں محبوب کی یاد اس وقت شدت سے آتی ہے جب رات ہوتی ہے اور سارا عالم محوِ خواب رہتا ہے۔ایسے میں عاشق ،معشوق کی یاد میں تڑپتا ہے، بے چین و بے قرار رہتا ہے اور آنکھوں سے آنسو جاری رہتے ہیں۔مخدوم کی شاعری میں ہمیں محبوب کی یاد ایک میٹھی چبھن کا احساس دلاتی ہے مثلاً ''انتظار'' کا یہ شعر:

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے

مخدوم کی رومانی شاعری میں منظر کشی کے بہترین مرقع اور تشبیہات واستعارات کا حسن بھی ملتا ہے مثلاً نظم ''ساگر کے کنارے'' میں خاتونِ مشرق کی اداؤں ،اس کی شوخی ،شرم وحیا کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کی ہیں کہ سارا نظارہ متحرک محسوس ہوتا ہے:

کچھ لڑکیاں آنچل کو سمیٹے ہوئے بر میں
گگری لیے سر پر چلیں پانی کے بہانے

انگشتریِ حُسن کے انمول نگینے
سر چشمے محبت کے مسرّت کے خزانے

چلتی ہیں اس انداز سے دامن کو سنبھالے
صدقے ہوئی شوخی تو بلائیں لیں ادا نے

پانی میں لگی آگ پریشان ہے مچھلی
کچھ شعلہ بدن اُترے ہیں پانی میں نہانے

چہروں کو کبھی شرم سے آنچل میں چھپانا
گہہ کھیلنا پانی سے وہ جھینپ اپنی مٹانے

تالاب پہ افلاک کے گم گشتہ ستارے
آتے ہیں صبح ہوتے ہی ساگر کے کنارے

یہاں نہ صرف بہترین منظر کشی ملتی ہے بلکہ تشبیہات کا حُسن بھی جھلکتا ہے مثلاً ہندوستانی حسیناؤں کو بھی حُسن کی انگوٹھی کے انمول نگینے کہا گیا ہے تو کبھی شعلہ بدن تو کبھی افلاک کے کھوئے ہوئے ستارے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یہ تشبیہات ایک طرف شاعر کی زبان و بیان پر قدرت کا اظہار کرتی ہیں تو دوسری طرف اس کے جمالیاتی ذوق کا پتہ دیتی ہیں۔

مذکورہ بالا نظم کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ نظم ہندوستانی تہذیب اور کلچر کی عکاسی کرتی ہے۔ اسی طرح ایک اور نظم ''تلنگن'' ہے جس میں حُسن و عشق کی جلوہ سامانی پورے آب و تاب کے ساتھ نظر آتی ہے:

پھرنے والی کھیت کی مینڈوں پہ بل کھاتی ہوئی
نرم و شیریں قہقہوں کے پھول برساتی ہوئی
کنگنوں سے کھیلتی اَوروں سے شرماتی ہوئی

اجنبی کو دیکھ کر خاموش مت ہو، گائے جا
ہاں تلنگن گائے جا، بانکی تلنگن گائے جا

مخدوم کی رومانی نظموں سے نہ صرف جمالیاتی کیفیت کا احساس ہوتا ہے بلکہ ایک نغمگی کی کیفیت بھی ملتی ہے۔ ان کی بیش تر نظمیں ترنّم سے پُر ہیں، چاہے وہ ''چاند ستاروں کا بن'' ہو یا ''چارہ گر'' ہر جگہ ہمیں غنائی کیف و سرور کا احساس ہوتا ہے اور یہی غنائی کیفیت مخدوم کی رومانی شاعری کی جان ہے۔ مخدوم ے اپنی شاعری کی نغمگی و موسیقی کی کیفیت کا ذکر کرتے ہوئے بغیر وزن والی نظموں کے بارے میں کہا ہے کہ:

''انگریزی میں ایسی شاعری کا رواج ہے۔ تلگوں کا مہاکوی سری سری بھی بلا میٹر اور بلا وزن کی نظمیں لکھتا ہے لیکن میں بلا وزن کی نظمیں نہیں کہہ سکتا۔ کیوں کہ میرے شعروں کی تخلیق موسیقی سے ہوتی ہے اور دل کی دھڑکن ہی میرے میٹر کا وزن ہوتی ہے۔''

(مخدوم سے انٹرویو، امیر عارفی، صبا مخدوم نمبر ۱۹۶۶ء ص ۲۸۸)

مخدوم کو عنفوانِ شباب ہی میں حُسن و عشق کے مراحل سے گزرنے کا ذاتی تجربہ ہوا۔ جیسے جیسے ان کا شعور پختہ ہوتا گیا ان کے تجربات وسیع تر ہوتے گئے۔ اُنہوں نے خود کو صرف حُسن و عشق کے محدود دائرے تک محصور نہیں رکھا بلکہ خارجی دنیا کے مناظر پر بھی ان کی نظر رہی۔ وہ کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم رکن تھے اور اس سلسلے میں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں اور چوں کہ عوامی جدوجہد اور عوامی انقلاب میں وہ بذات خود شریک رہتے تھے اس لئے ان کے تجربات کا حقیقی عکس ان کی نظموں میں جھلکتا ہے۔

﴿۲﴾ مخدوم محی الدین کی انقلابی شاعری

مخدوم کی شاعری میں نہ صرف رومانی موضوعات ملتے ہیں بلکہ ان کی شاعری کا بیش تر حصہ انقلابی آہنگ اور لب و لہجے سے پر نظر آتا ہے۔ ان کی پہلی انقلابی نظم ''باغی'' ہے۔ نظم کے پہلے ہی بند میں ان کا جوش، خود پرستی، ولولہ انگیزی، ان کی تڑپ، ان کی سیمابی کیفیت اور ظلم کے خلاف لڑنے اور مرنے کا حوصلہ نظر آتا ہے۔

مثلاً:

رعد ہوں برق ہوں، بے چین ہوں، پارا ہوں میں
خود پرستار ، خود آگاہ ، خود آرا ہوں میں
گردنِ ظلم کٹے جس سے وہ آرا ہوں میں
خرمنِ جَور جلا دے وہ شرارا ہوں میں

شروع سے آخر تک نظم میں ایک باغیانہ کیفیت رَواں دَواں ہے جس میں ان کا غم وغصہ اور قدیم روایات کو توڑنے اور فرقہ وارانہ خیالات کو ختم کر دینے کا عزم مصمّم کرتا نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خود کو اک آگ بتاتے ہیں جو ان فرسودہ خیالات کو جلا کر خاک کر دینا چاہتی ہے۔ مثلاً:

آگ ہوں آگ ہوں ہاں ایک دہکتی ہوئی آگ
آگ ہوں آگ بس، اب آگ لگانے دے مجھے

اسی طرح ان کی ایک اور نظم ''موت کا گیت'' بھی انقلابی کیفیت سے پُر ہے۔ ان کے علاوہ جنگ، مشرقی حویلی، انقلاب، اندھیرا، زلف چلیپا، سیاہی، اسٹالین اور جنگ آزادی بھی مخدوم کی کامیاب سیاسی اور انقلابی نظموں میں شمار ہوتی ہیں۔ نظم ''موت کا گیت'' مخدوم کی کامیاب انقلابی نظم ہے۔ اس نظم میں شاعر کا انداز والہانہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ ایک استعاراتی نظم ہے جس میں شاعر استعاراتی انداز میں سرمایہ دارانہ اور اعلیٰ طبقے کے خلاف باغیانہ جذبات کا اظہار کرتا ہے:

زلزلو! آؤ دہکتے ہوئے لاؤ آؤ
بجلیو! آؤ گرج دار گھٹاؤ آؤ
آندھیو! آؤ جہنم کی ہواؤ آؤ
آؤ یہ کُرّۂ ناپاک بھسم کر ڈالیں
کاسۂ دہر کو معمورِ کرم کر ڈالیں

مذکورہ نظم میں جہاں شاعر کے جذبات ظلم کے خلاف آتش فشاں کی مانند پھٹے پڑتے ہیں۔ وہیں ان کا دل انسانی ہم دَردی اور خلوص سے لب ریز نظر آتا ہے۔

مخدوم کی انقلابی شاعری کے بارے میں داؤد اشرف رقم طراز ہیں:

''مخدوم کی انقلابی شاعری خلوص، یقین اور خود اعتمادی سے عبارت ہے۔ اُنہیں غربت اور غلامی اور سماج کی بے راہ رَوی اور گندگی سے نفرت ہے اور جب وہ اس کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں تو ان کا لب ولہجہ سخت ہو جاتا ہے۔ ان کی چند نظموں میں جو ابتدائی دَور کی ہیں، لہجے کا جلال شعر پر غالب نظر آتا ہے لیکن بحیثیت مجموعی شعریت ان کی انقلابی شاعری پر غالب ہے۔''

(داؤد اشرف، مخدوم ایک مطالعہ، ۱۹۶۷ء ص ۸۹)

مخدوم کی انقلابی نظموں میں استعاراتی انداز کے ساتھ ساتھ تشبیہات اور علامتوں کا استعمال بھی بھرپور انداز میں ملتا ہے۔ نظم ''چاند تاروں کا بن'' میں اُنہوں نے آزادی کی جدوجہد اور اس کی خاطر کی گئی قربانیوں کی داستان بیان کی ہے اور آزادی کے بعد رونما ہونے والے واقعات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ اس نظم میں اُنہوں نے آزادی لے لئے کہی گئی ایک عرصۂ دراز کی کوششوں کو سیاہ رات سے تشبیہ دی ہے اور آزادی کو اُنہوں نے صبح قرار دیا ہے۔

علامتوں کے سلسلے میں ان کی اہم نظم ''حویلی'' ہے۔ حویلی کو مخدوم نے ایک علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ یعنی حویلی اُنہوں نے اس فرسودہ سماج کو قرار دیا ہے جہاں امیری کے سبب اعلیٰ طبقے کی حکومت ہے، جہاں سرمایہ داروں کا راج ہے اور جہاں کسانوں اور مزدوروں کا استحصال کیا جارہا ہے۔ مخدوم اس نظم کے پردے میں آزادی کے متمنی ہیں اور ایسے سماج کے خواہاں ہیں جہاں ہر انسان خوشی سے زندگی بسر کر سکے۔ مخدوم کی نظموں میں ہمیں منظر کشی کے عمدہ نمونے بھی نظر آتے ہیں۔ نظم ''آسمانی لوریاں'' میں جگہ جگہ اُنہوں نے منظر کشی سے کام لیا ہے۔ مثلاً چند اشعار ملاحظہ ہوں:

روزِ روشن جا چکا ، ہیں شام کی تیاریاں
اُڑ رہی ہیں آسماں پر زعفرانی ساڑیاں
شام رخصت ہو رہی ہے رات کا منہ چوم کر
ہو رہی ہیں چرخ پر تاروں میں کچھ سرگوشیاں
جلوے ہیں بے تاب پردے سے نکلنے کے لئے
بن سنور کر آ رہی ہیں آسماں کی رانیاں
نو عروسِ شب نے پہنا ہے لباسِ فاخرہ
آسمانی پیرہن میں کہکشانی دھاریاں

تمام نظم اسی طرح کی کیفیت سے پُر ہے۔ یہ نظم منظر کشی کا بہترین نمونہ کہی جاسکتی ہے۔

مخدوم کی انقلابی نظموں میں کہیں کہیں باغیانہ جذبات اور انقلابانہ آہنگ ضرور نظر آتا ہے لیکن اس سے ان کے لہجے میں گھن گرج یا نعرہ بازی نہیں ملتی بلکہ غنائیت اور ترنّم کے ساتھ جدوجہد کا حوصلہ اور مستقبل پر یقین ملتا ہے اور یہی ان کی انقلابی شاعری کی خصوصیت ہے۔

مخدوم محی الدین کے یہاں نظم کی ہیئت اور اُسلوب کے کامیاب تجربے بھی ملتے ہیں۔ مثلاً پابند نظم، معرّیٰ نظم، آزاد نظم اور نثری نظم۔ زیادہ تر ان کے یہاں آزاد نظمیں ملتی ہیں۔ ان کے اُسلوب اور طرزِ بیان کی خوبی یہ ہے کہ وہ آزاد نظموں میں بھی ترنّم اور غنائیت کا عنصر ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ نظم ''چاند تاروں کا بن'' اور ''چارہ گر'' اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

مجموعی حیثیت سے مخدوم کی نظموں میں ایک طرح کا توازن ملتا ہے۔ ان کے لہجے کی نرمی اور مٹھاس اور عوام سے قریبی تعلّق اور ہم دَردی کی بدولت ان کی انقلابی نظموں میں بھی گھن گرج اور سختی کے بجائے گہرا سماجی شعور اور حالات کو بدل دینے کا حوصلہ ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری رومان و انقلاب کا حسین امتزاج معلوم ہوتی ہے۔

مخدوم کا رویہ معتدل اور اپروچ سائنٹفک ہے۔ اشتراکی انقلاب میں اُنہیں یقین ہے۔ ان کی یہی آرزو ہے کہ جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کا خاتمہ ہو جائے اور ساری دنیا پر عوام کی حکومت قائم ہو جائے لیکن باوجود اس انقلابی نظریے کے، ان کے یہاں حال سے بے زاری، خوش آئند دنوں کی اُمید، ماحول اور زندگی کو بدل دینے کی خواہش اور وَلولہ نظر آتا ہے۔ اپنے نظریات وخیالات کو وہ خلوص دل کے ساتھ فن کارانہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔

ترقی پسند شاعروں میں مخدوم نے اپنی ایک الگ راہ نکالی ہے۔ ان کے یہاں آزاد، پابند نظم کے تجربوں کے علاوہ زبان و بیان کی سادگی و پرکاری، جمالیاتی رَچاؤ، تشبیہات واستعارات اور علامات کا عمدہ استعمال، نغمگی وترنم کی کیفیت اور انتہائی غم میں بھی مایوسی و دل شکنی کے بجائے زندگی کو بہتر طریقے پر برتنے کا حوصلہ ملتا ہے۔ اور یہی وہ خصوصیات ہیں جو مخدوم محی الدین کو بلاشبہ اردو کے ترقی پسند شعرا میں ممتاز مقام عطا کرتی ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۷﴾ مخدوم محی الدین کی کسی علامتی نظم کا نام بتائیے۔

﴿۸﴾ مخدوم محی الدین کی پانچ نظموں کے نام لکھیے۔

﴿۹﴾ مخدوم محی الدین کے کتنے شعری مجموعے ہوئے اور ان کے نام کیا ہیں؟

﴿۱۰﴾ مخدوم محی الدین کی شہرت اور شناخت اردو شاعری کی کس صنف کی وجہ سے ہے؟

07.05 مخدوم محی الدّین کی نظم ''چارہ گر'' متن

اک چنبیلی کے منڈوے تلے
میکدے سے ذرا دُور اُس موڑ پر
دو بدن
پیار کی آگ میں جل گئے
پیار حرفِ وفا
پیار، اُن کا خدا
پیار، اُن کی چتا
دو بدن
اُوس میں بھیگتے، چاندنی میں نہاتے ہوئے
جیسے دو تازہ رُو، تازہ دَم پھول پچھلے پہر
ٹھنڈی ٹھنڈی سُبک رُو چمن کی ہوا
صرفِ ماتم ہوئی

کالی کالی لٹوں سے لپٹ گرم رخسار پر
ایک پل کے لئے رُک گئی
ہم نے دیکھا اُنہیں
دن میں اور رات میں
نور و ظلمات میں
مسجدوں کے مناروں نے دیکھا انہیں
مندروں کے کواڑوں نے دیکھا انہیں
میکدے کی دراڑوں نے دیکھا انہیں
اَزَل، اَزَل تا اَبد
یہ بتا چارہ گر!
تیری زنبیل میں
نسخۂ کیمیائے محبت بھی ہے؟
کچھ علاج و مداوائے اُلفت بھی ہے؟
اک چنبیلی کے منڈوے تلے
مے کدے سے ذرا دور اس موڑ پر
دو بدن پیار کی آگ میں جل گئے
چارہ گر!

07.06 مخدوم محی الدّین کی نظم ''چارہ گر'' تشریح

نظم ''چارہ گر'' مخدوم محی الدین کی بے حد مقبول نظم ہے۔ یہ ایک آزاد نظم ہے جو ان کے دوسرے مجموعۂ کلام ''گُلِ تر'' میں شامل ہے۔ اس نظم میں شاعر نے اپنے جذبات و احساسات کا اظہار اس فن کارانہ انداز میں کیا ہے کہ یہ نظم قارئین کے دلوں پر اپنا ایک خاص اثر قائم کرتی ہے۔ اس نظم کا موضوع محبت ہے جو صرف دو پیار کرنے والوں کی محبت اور اس کے الم ناک انجام کو پیش کرتی ہے۔

اس نظم میں شاعر کہتا ہے کہ دو پیار کرنے والے ایک خوشبودار چنبیلی کے منڈوے تلے، جو میکدے سے ذرا دُور واقع ہے، اپنی محبت کو قربان کر دیتے ہیں کیوں کہ ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے کہ محبت کرنے والوں کو کبھی وصل نصیب نہیں ہوا۔ ان کی تقدیر میں صرف جدائی لکھی ہوتی ہے۔ حالاں کہ یہ محبت کرنے والے عشق میں اس قدر گرفتار ہیں کہ محبت ہی ان کا ایمان ہے، محبت ہی ان کی زندگی ہے، دن رات سوائے محبت کے اُنہیں کوئی کام نہیں ہوتا، چاہے وہ ٹھنڈی شبنمی صبح ہو یا اندھیری رات۔ اُنہیں محبت کے علاوہ کسی چیز کی سدھ بدھ نہیں ہوتی۔ آگے شاعر کہتا ہے کہ جب یہ محبت کرنے والے نہیں ہوتے تو پھر یہ چمن کی ٹھنڈی ٹھنڈی فضائیں بھی مغموم ہو جاتی ہیں اور ماتم کرنے لگتی ہیں۔

مخدوم کا کہنا ہے کہ ہم نے ان دو پیار کرنے والوں کو دیکھا ہے۔ہم نے اُنہیں ہر حال میں دیکھا ہے۔ہم نے اُنہیں صبح وشام دیکھا ہے۔خوشی اور غم کی حالت میں بھی دیکھا ہے۔نہ صرف ہم بلکہ ان کی محبت کی گواہ مسجد کی مینار بھی ہیں،مندر کے کواڑ بھی ہیں اور میکدے کی دراڑیں بھی۔یعنی اُنہیں محبت میں گرفتار مذہبی رہنماؤں نے بھی دیکھا ہے اور عیش پرست رندوں نے بھی دیکھا ہے۔یہ لوگ آج سے نہیں بلکہ اس وقت سے محبت کرنے والوں کے گواہ ہیں جب کہ دنیا کی ابتدا ہوئی تھی اور یہ اس وقت تک ان کے گواہ رہیں گے جب تک دنیا قائم رہے گی لیکن محبت کرنے والوں کا ہمیشہ ایک ہی جیسا انجام ہوتا رہے گا ان کو کوئی علاج نہیں ہوگا۔پھر شاعر اللہ تعالیٰ سے شکایت کرتا ہے کہ ''اے چارہ گر'' تیرے پاس تو دنیا کے تمام غموں کا علاج ہے تو پھر تیرے پاس کیا محبت کا کوئی کامیاب نسخہ نہیں؟ کیا تیرے پاس محبت کی کوئی ایسی دوا نہیں ہے جس سے اس کا علاج ممکن ہو سکے؟ اگر ایسا کوئی علاج ہے تو ذرا بتا دے ورنہ محبت کا پھر وہی انجام ہوگا جو صدیوں سے ہوتا آ رہا ہے یعنی پھر سے دو بدن محبت کی چھاؤں میں بیٹھے اپنی محبت کی ناکامی کے آنسو بہائیں گے اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس محبت کی آگ میں جل کر خاک ہو جائیں گے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۷﴾ نظم ''چارہ گر'' مخدوم کے کس مجموعہ کلام میں شامل ہے؟

﴿۸﴾ نظم ''چارہ گر'' کا موضوع کیا ہے؟ یہ کس قسم کی نظم ہے؟

07.07 مخدوم محی الدّین کی نظم ''چارہ گر'' تجزیہ

مخدوم ایک انقلابی شاعر ہیں تاہم ان کے یہاں رومانی اثرات کی بھی کوئی کمی نہیں ہے۔اسپینا پر ان کی شاعری کو رومان وانقلاب کا حسین امتزاج کہا گیا ہے۔مخدوم کی نظم ''چارہ گر'' ایک رومانی نظم ہے لیکن اس میں ایک باغیانہ کیفیت بھی ہمیں ملتی ہے۔

مخدوم کے یہاں ہمیں محبت کا وہ روایتی وفرسودہ انداز نہیں ملتا، جہاں شاعر رقیب کی شکایت کرتا ہے یا ہجر کا رونا روتا ہے یا پھر شیخ یا واعظ کی غیبت کرتا ہے۔ بلکہ اُنہوں نے محبت کا ایک نیا اور واضح تصوّر دیا ہے۔اُنہوں نے محبت اور اس کے انجام کو موضوع بنایا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ زمانے نے محبت کی کبھی قدر نہیں کی ہے۔زمانہ اور سماج صدیوں سے محبت کرنے والوں کے دشمن رہے ہیں۔چاہے مذہبی رہنما ہوں یا سماج کے ٹھیکے دار جو عیش وعشرت کے نشے میں چور ہیں وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ دو پیار کرنے والے افراد کس قدر ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہیں اُنہیں ملنے نہیں دیتے اور اس طرح محبت کا انجام دو محبت کرنے والوں کی ایثار وقربانی کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔یہاں مخدوم نے مندروں کی کواڑوں،مسجد کے میناروں اور میکدے کی دراڑوں کو بطور علامت استعمال کیا ہے۔یہ وہ علامتیں ہیں جن سے ہمارا سماج یا معاشرتی نظام متاثر ہے۔یعنی ان کے نزدیک چاہے مذہبی رہنما ہو یا اعلیٰ طبقہ جو دولت کے نشے میں ڈوبا ہوا ہے، سب ہی محبت کرنے والوں کے ہمیشہ دشمن رہے ہیں اور انہیں کے آگے محبت نے دَم توڑا ہے۔

یہ نظم محبت کے اس المناک انجام کو پیش کرتی ہے جو اَزل سے ابد تک سماج کا پیچیدہ مسئلہ رہا ہے۔محبت کو کبھی اس کی منزل نہیں ملی اور نہ ہی محبت کرنے والوں کا کوئی پُرسانِ حال رہا ہے۔یہی وجہ ہے کہ سماج کے لئے محبت ہمیشہ سے ایک چیلنج بنی رہی ہے اور ہر محبت کرنے والا

اس چیلنج کا بخوبی مقابلہ کرتا ہے۔ عالم خوندمیری نے بھی یہی بات بتائی کہ یا تو محبت سماج کے لئے چیلنج رہی یا پھر سماج اس کے لئے ایک چیلنج رہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہ وہ محبت ہے جو زندگی کو جہنم بنادیتی ہے اور جس کا انجام ''موت'' ہے۔ یہ انسان کی خود تخریبی (Self Destructuon) میلانات کی آفریدہ ہے اور اسی لئے یہ محبت ہر سماج کے لئے ایک چیلنج ہے یا ہر سماجی تنظیم، ایسی محبت کے لئے چیلنج بن جاتی ہے۔''

(صبا، مخدوم نمبر اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۶۶ء ص ۸۷)

محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو پیار کرنے والوں کے لئے پھول بن جاتا ہے تو کبھی انگارہ۔ یہی وجہ ہے کہ شعرا نے اکثر اس کو آگ سے تشبیہ دی ہے مثلاً جگر مرادآبادی نے کہا ہے:

یہ عشق نہیں آساں اتنا ہی سمجھ لیجیے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

یا پھر غالبؔ کا یہ شعر:

عشق پر زور نہیں ، ہے وہ یہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

مخدوم کے یہاں بھی ہمیں محبت کا وہ روپ ملتا ہے جہاں عاشق و معشوق پیار کی آگ میں جل رہے ہیں۔ ان کی محبت کی یہ ہمہ گیری موت کو بھی اپنی آغوش میں لینے کی متمنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر ان محبت کے طلب گاروں کے لئے کہتا ہے کہ محبت ہی ان کا سب کچھ ہے۔ ان کا ایمان، ان کی وفا اور ان کی چتا یعنی محبت کرنے والوں کے نزدیک سوائے محبت کے ہر چیز بے معنی ہے۔ اس قدر محبت میں سرشار دونوں کو کبھی ان کی منزل نہیں ملتی اور ان کی محبت کا انجام سوز، تڑپ، جلن اور بے چینی و اضطراب کی صورت میں اُنہیں ملتا ہے۔ اسی لئے شاعر سوال کرتا ہے اور ''چارہ گر'' یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات سے سوال کرتا ہے کہ کیا اس غمِ محبت کا کوئی علاج نہیں؟ کیا کوئی ایسا مسیحا نہیں ہے جو اس درد کی دوا بتائے، جیسا کہ غالبؔ نے بھی کہا ہے:

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

چنانچہ مخدوم بھی سوال کرتے ہیں۔

یہ بتا چارہ گر!
تیری زنبیل میں
نسخۂ کیمیائے محبت بھی ہے؟
کچھ علاج و مداوائے الفت بھی ہے؟

اس طرح نظم کا اختتام سوالیہ انداز میں ہوتا ہے جہاں شاعر محبت کی اس نازک اور پیچیدہ گتھی کو سُلجھانا چاہتا ہے، جو حیات کیکش مکش میں ازل سے ابد تک ہمیشہ برقرار رہی ہے اور رہے گی۔

نظم ''چارہ گر'' ان کی رومانی نظموں میں بلاشبہ فنی اعتبار سے ایک کامیاب نظم ہے۔ کیوں کہ اُنہوں نے یہ نظم اس وقت لکھی جب ان کے شعور کی پختگی کا دَور تھا۔ یہی وجہ ہے کہ معاصرین اور ناقدین نے اس نظم کو ان کے ذہنی پختگی کے دَور کی نظم قرار دیا ہے۔ بلاشبہ مخدوم کی نظم ''چارہ گر'' ان کی رومانی نظموں میں ایک اہم نظم ہے، جس سے ان کے ذہنی ارتقا اور پختگی کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور محبت کا ایک نیا اور واضح تصوّر اُبھر کر سامنے آتا ہے جس میں محبت کے خوش گوار انجام کی آرزو، خوش آئند مستقبل کی جستجو نظر آتی ہے۔

07.08 خلاصہ

مخدوم محی الدین ۴ر فروری ۱۹۰۸ء کو ضلع میدک، آندھرا پردیش میں پیدا ہوئے۔ نماز کی پابندی سے لے کر فرش کی صفائی، نمازیوں کے لئے وضو کے پانی کا انتظام، معزز بزرگوں کے احکام کی تکمیل، غرض ایک فرماں بردار فرزند کی حیثیت سے مخدوم کا بچپن گزرا۔ ۱۹۳۹ء میں مخدوم کا تقرر بحیثیت لکچرار سٹی کالج حیدرآباد میں ہوگیا مگر جلدی ہی وہ مستعفی ہوگئے۔ مخدوم کے ادبی سفر کا آغاز طالب علمی کے زمانے ہی میں ہوگیا تھا۔ شاعری کے علاوہ مخدوم نے ڈرامے بھی لکھے۔ مخدوم نے ۲۵ر اگست ۱۹۶۹ء میں ۶۱ ر برس کی عمر میں اس دار فانی سے کوچ کیا۔

مخدوم کی شخصیت میں خودداری، خوش مزاجی، ملنساری، سادگی اور اخلاص و ہم دَردی کے اوصاف ہیں۔ مجموعی حیثیت سے مخدوم کی شخصیت بڑی جاذب نظر تھی۔ جو بھی ان سے ایک بار مل لیتا وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ خلوص و ہم دَردی ان کی شخصیت کا جزوِ خاص تھی۔

مخدوم محی الدین کا شمار اردو کے معتبر ترقی پسند شاعروں میں ہوتا ہے۔ ۱۹۴۰ء میں جب حیدرآباد میں کمیونسٹ پارٹی کا قیام عمل میں آیا تو مخدوم اس کے ممبر ہوگئے اُنہیں اپنی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے کئی مرتبہ جیل جانا پڑا اور روپوشی کی زندگی بھی گزارنی پڑی۔ مخدوم نے نظمیں بھی کہی ہیں اور غزلیں بھی لیکن ان کی شہرت نظم نگار کی حیثیت سے زیادہ ہے۔ مخدوم کی تین شعری مجموعے ہیں۔ پہلا مجموعۂ کلام ''سرخ سویرا'' ۱۹۴۴ء، دوسرا مجموعۂ کلام ''گل تر'' ۱۹۶۱ء اور تیسرا مجموعہ کلام ''بساطِ رقص'' ۱۹۶۶ء میں ہوا۔

ترقی پسند شاعروں میں مخدوم نے اپنی ایک الگ راہ نکالی ہے۔ ان کے یہاں آزاد پابند نظم کے تجربوں کے علاوہ زبان و بیان کی سادگی و پرکاری، جمالیاتی رچاؤ، تشبیہوں و استعاروں اور علامتوں کا عمدہ استعمال، نغمگی و ترنم کی کیفیت اور انتہائی غم میں بھی مایوسی و دل شکنی کی بجائے زندگی کو بہتر طریقے پر برتنے کا حوصلہ ملتا ہے اور یہی وہ خصوصیات ہیں جو مخدوم محی الدین کو بلاشبہ اردو کے ترقی پسند شعرا میں ممتاز مقام عطا کرتی ہیں۔

نظم ''چارہ گر'' مخدوم محی الدین کی بے حد مقبول نظم ہے۔ یہ ایک آزاد نظم ہے جو ان کے دوسرے مجموعۂ کلام ''گل تر'' میں شامل ہے۔ اس نظم میں شاعر نے اپنے جذبات و احساسات کا اظہار اس فن کارانہ انداز میں کیا ہے کہ وہ قارئین کے دلوں پر اپنا ایک خاص اثر قائم کرتی ہے۔ اس نظم کا موضوع محبت ہے جو صرف دو پیار کرنے والوں کی محبت اور اس کے الم ناک انجام کو پیش کرتی ہے۔

07.09 فرہنگ

اشتراکی	: کمیونسٹ نظریے کا حامی	سیمابی کیفیت	: بیتابی کی کیفیت
اضطراب	: بے تابی، بیقراری، گھبراہٹ	عزم	: ارادہ
المناک	: دردناک	عنفوان شباب	: جوانی کا آغاز
پختگی	: مضبوطی، پکاپن	غنائی کیفیت	: نغمگی کی کیفیت
تخیل	: خیال	فرسودہ	: گھِسا ہوا، پرانا، گیا گزار، بوسیدہ
جلا بخشنا	: روشنی دینا، چمک دینا، رونق دینا	قارئین	: پڑھنے والے
چارہ گر	: طبیب، معالج، علاج کرنے والا	قلبی واردات	: دلی کیفیات
دل شکنی	: دل توڑنا	مشفقانہ	: دردمندانہ، محبانہ، دوستانہ
رمزیت	: اشاریت، آنکھوں یا بھوؤں کا اشارہ	معتدل	: اعتدال والا، اوسط درجہ کا، متوسط

07.10 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درجِ ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : مخدوم محی الدین کے مختصر حالاتِ زندگی لکھئے؟

سوال نمبر۲ : مخدوم محی الدین کی نظمیہ شاعری کا جائزہ لیجیے۔

سوال نمبر۳ : مخدوم کی نظموں میں ''رومان وانقلاب کا حسین امتزاج ہے'' وضاحت کیجیے۔

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : مخدوم محی الدین کی نظم ''چارہ گر'' کی تشریح کیجیے۔

سوال نمبر۲ : مخدوم محی الدین کی نظم نگاری پر اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔

سوال نمبر۳ : مخدوم کی رومانی وانقلابی شاعری کے تعلق سے ان کی شاعرانہ خصوصیات لکھئے۔

07.11 حوالہ جاتی کتب

۱۔ بساط رقص	از	مخدوم محی الدین
۲۔ سرخ سویرا	از	مخدوم محی الدین
۳۔ گل تر	از	مخدوم محی الدین
۴۔ مخدوم ایک مطالعہ	از	داؤد اشرف
۵۔ مخدوم محی الدین حیات اور کارنامے	از	شاذ تمکنت

07.12 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ مخدوم محی الدین کی پیدائش ۴؍فروری ۱۹۰۸ء کو ضلع میدک، آندھرا پردیش میں ہوئی۔

﴿۲﴾ مخدوم کی شخصیت میں بڑی جاذبیت تھی۔ وہ صداقت پسندی اور خلوص کے پیکر تھے۔

﴿۳﴾ شاعری کے علاوہ مخدوم نے ڈرامے لکھے۔

﴿۴﴾ ۱۹۴۰ء میں

﴿۵﴾ ہاں، مخدوم کی سیاسی زندگی نے ان کی ادبی زندگی کو نقصان پہنچایا۔

﴿۶﴾ حلقہ حیدرآباد سے

﴿۷﴾ حویلی

﴿۸﴾ پیلا دوشالہ، آتش کدہ، ساگر کے کنارے، چارہ گر، باغی

﴿۹﴾ مخدوم کے تین شعری مجموعے ہوئے جن کے نام سرخ سویرا، گل تر اور بساط رقص ہیں۔

﴿۱۰﴾ نظم

﴿۱۱﴾ نظم ''چارہ گر'' مخدوم محی الدین کے دوسرے مجموعۂ کلام ''گل تر'' میں شامل ہے۔

﴿۱۲﴾ اس کا موضوع محبت ہے اور یہ ایک رومانی نظم ہے۔

اکائی 08 : فیض احمد فیضؔ (صُبحِ آزادی)

ساخت

08.01 : اغراض ومقاصد

08.02 : تمہید

08.03 : فیض احمد فیضؔ کے حالاتِ زندگی

08.04 : فیض احمد فیضؔ کی نظم نگاری

08.05 : فیض احمد فیضؔ کی نظم ''صُبحِ آزادی''، متن

08.06 : فیض احمد فیضؔ کی نظم ''صُبحِ آزادی'' تشریح

08.07 : فیض احمد فیضؔ کی نظم ''صُبحِ آزادی'' تجزیہ

08.08 : خلاصہ

08.09 : فرہنگ

08.10 : نمونہ امتحانی سوالات

08.11 : حوالہ جاتی کتب

08.12 : اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

08.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ فیضؔ کی نظم ''صُبحِ آزادی''، فیضؔ کی شاعرانہ خصوصیات اوراردو نظم کے بارے میں مطالعہ کریں گے۔ اردو ادب میں غزل کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے لیکن دَورِ جدید میں نظم ایک اہم صنفِ سخن کی شکل میں اُبھر کر سامنے آئی ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں رونما ہونے والے حالات وحادثات کو یہ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔

08.02 تمہید

اُردو نظم کی داغ بیل دکن میں پڑی۔ قدیم اردو شاعری میں نظم کا لفظ غزل کے علاوہ تمام صنفِ شاعری کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ اس لئے نظم کو اس کی ہیئت (Form) کے لحاظ سے پہچانا جاتا تھا۔ نظم کے قدیم وجدید سرمایے پر نظر ڈالنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس کا دامن رنگارنگ اور متنوّع مضامین سے مالا مال ہے۔ اس میں فکر وفلسفہ، مناظرِ قدرت کا بیان، موسموں، تہواروں، پرندوں اور عمارتوں کا ذکر، سیاسی، سماجی، معاشرتی خیالات کی ترجمانی، تاریخی واقعات کا ذکر، غرض حیات وکائنات کے تمام گوشے خوش اُسلوبی سے نظم ہوتے ہیں۔

۱۸۵۷ء کے بعد سے نظم کا دامن وسیع ہو رہا تھا لیکن ترقّی پسند ادبی تحریک کی داغ بیل پڑنے کے بعد نظم میں سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی خیالات بھی جگہ پانے لگے۔ فیضؔ چوں کہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے اس لئے فیضؔ کے یہاں بھی سارے مضامین نظم میں جگہ پاتے ہیں۔ نظم ''صبح آزادی'' دراصل آزادی کا مرثیہ ہے۔ کیوں کہ آزادی کا وہ خواب جو فیضؔ نے دیکھا تھا۔ آزادی کے بعد پورا نہ ہو سکا۔ اس کے خواب کا شیرازہ بکھر گیا۔ یہ نظم اس وقت کے تلخ حقائق سے آگاہ کرتی ہے۔

08.03 فیض احمد فیضؔ کے حالاتِ زندگی

علاّمہ اقبال کے بعد سیالکوٹ کی سرزمین پر پیدا ہونے والے شاعر فیضؔ ایک ایسے شاعر ہیں جنہوں نے عالمی شہرت حاصل کی۔ فیضؔ کی پیدائش سیالکوٹ کے ایک گاؤں کالا قدار میں ۱۳/فروری ۱۹۱۱ء کو ہوئی تھی۔ ان کے والد سلطان محمد اپنے وقت کے مشہور بیرسٹر انجمن اسلامیہ سیالکوٹ کے صدر اور علاّمہ اقبال کے دوستوں میں سے تھے۔ فیضؔ کا بچپن بہت عیش وعشرت میں گزرا لیکن والد کے انتقال کے بعد معاشی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔

فیضؔ کی پرورش مذہبی ماحول میں ہوئی۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق فیضؔ کی ابتدائی تعلیم درسِ قرآن سے شروع ہوئی۔ اسکولوں کی تعلیم کے دَوران ابتدائی درجات امتیازات سے پاس کیے۔ میٹرک کے بعد تمام امتحانات فرسٹ ڈویژن میں پاس کیے۔ ۱۹۱۹ء میں مرے کالج آف سیالکوٹ سے انٹر، ۱۹۳۱ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی.اے اور پھر عربی میں بی.اے. آنرز کیا۔ ۱۹۳۳ء میں انگریزی سے ایم.اے اور ۱۹۳۴ء میں اورینٹل کالج لاہور سے عربی میں ایم.اے فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ مولوی میر حسن سے فارسی اور عربی میں مہارت حاصل کی۔ پطرس بخاری، پروفیسر لینگ ہارن اور صوفی غلام مصطفےٰ فیضؔ کے استاد تھے۔ فیضؔ نے اپنے اساتذہ کی محفلوں میں بیٹھ کر بہت کچھ سیکھا۔ فیضؔ نے کلاس کی تعلیم کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

فیضؔ کے مطابق:

> ''اُنہوں نے کلاس سے زیادہ پطرس بخاری اور صوفی تبسّم کی محفلوں سے استفادہ کیا اور علم حاصل کیا۔''
>
> (عمر گذشتہ کی کتاب۔ ص ۳۷/۳۸)

فیضؔ اپنی قابلیت، نرم مزاجی اور شیریں گفتاری کی وجہ سے اپنے دوستوں میں بہت مشہور تھے۔ ان کی قابلیت کی وجہ بچپن سے گہرا مطالعہ ہے۔ شخصیت، مزاج اور کردار کو تابناک بنانے میں ان کے گھر والوں کا ہاتھ تھا۔

فیضؔ نے ایک انگریز خاتون ایلس جارج سے شریعتِ اسلامی کے مطابق شادی کی۔ ایلس ایک حوصلہ مند خاتون تھیں۔ فیضؔ کے دَورانِ اسیری جس ہمّت سے اُنہوں نے مشکلات کا سامنا کیا، فیضؔ اور بچّوں سے اپنی بے پناہ محبت اور مادرانہ شفقت کا ثبوت دیا، یقیناً ایک قابلِ ستائش عمل ہے۔ ایلس نے یہ ثابت کر دیا کہ ایثار و وفا اور قربانی کا جذبہ نہ صرف مشرقی روایات ہیں بلکہ عورت کی سیرت کا حصّہ ہیں۔

فیضؔ کی عملی زندگی کا آغاز تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ۱۹۳۵ء سے ہوتا ہے، جب مسلم اینگلو اورینٹل کالج میں ان کا تقرّر بحیثیت انگریزی لیکچرر ہوا۔ سیاسی نقطۂ نظر سے یہ زمانہ کساد بازاری اور کش مکش سے بھرا ہوا زمانہ تھا۔ ایسے ہی وقت میں فیضؔ کی ملاقات ڈاکٹر خورشید

جہاں اوران کے شوہر محمود الظّفر سے ہوئی، مارکس کے منشور کے مطابق اور اردگرد کے ماحول اور حالات نے فیضؔ کی دنیا میں ایک نمایاں تبدیلی پیدا کردی۔اس کے بعد ۱۹۳۶ء میں ترقّی پسند تحریک سے وابستگی نے ان کی شاعری کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔فیضؔ ترقّی پسند تحریک کی کانفرنس میں شریک ہوتے تھے۔

دوسری جنگِ عظیم میں جب فسطائی طاقتوں نے یورپ کے ممالک پر قبضہ جمانے کا ارادہ کیا اور اس ارادے کے تحت اُنہوں نے روس اور انگلینڈ کو نشانہ بنایا تو لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ اگر روس اور انگلینڈ کی اس لڑائی میں شکست ہوتی ہے تو اس سے ہندوستان کی آزادی بھی خطرے میں پڑسکتی ہے۔لہٰذا بہت سے امن وانسانیت پسند ادیب اور شاعر اس جنگ میں عملی طور پر حصّہ لینے لے لئے انگریزوں کے ساتھ ہو گئے۔فیضؔ بھی اس جنگ میں عملی طور پر حصّہ لینے لے لئے تیّار ہو گئے اور اُنہوں نے کالج کی پرسکون زندگی کو خیر باد کہہ دیا۔فوج میں بھرتی ہو کر استاد فیضؔ کیپٹن فیضؔ بن گئے اور فسطائی طاقتوں سے لڑنے لے لئے سرگرمِ عمل ہو گئے۔فوج میں بہترین کارگردگی لے لئے ۱۹۴۶ء میں حکومتِ برطانیہ نے اُنہیں ایم. بی.ای کے خطاب سے نوازا۔آزادی کے بعد فوج کی نوکری سے استعفیٰ دے دیا اور انگریزی روزنامہ ''Pakistan Times'' کے چیف ایڈیٹر ہو کر دہلی سے لاہور واپس چلے گئے۔اس کے بعد ''امروز'' اردو اور ہفت روزہ ''لیل ونہار'' کے چیف ایڈیٹر کی خدمات انجام دیں۔

فیضؔ جنہوں نے ملک کی آزادی اور امن وآشتی لے لئے اپنی لیکچرار کی پرسکون زندگی پر فوج کی زندگی ترجیح دی تھی، ملک کی آزادی سے خوش اور تقسیم سے بے حد متفکّر اور متاثر ہوئے۔ان کے فوج میں جانے کا مقصد ہی فوت ہو گیا۔تقسیم لے لئے اپنی ناخوشی کا اظہار اُنہوں نے اپنی نظم ''صبح آزادی'' میں کیا۔

فیضؔ کی زندگی میں راولپنڈی سازش کیس کی غیر معمولی اہمیت ہے۔۹/ مارچ ۱۹۵۱ء کو جنرل ایوب خاں کی سرکار کا تختہ اُلٹنے کی سازش میں فیضؔ کو سجّاد ظہیر اور دوسرے سیاسی لیڈروں اور فوجی افسروں کے ساتھ گرفتار کرلیا۔فیضؔ کو سرگودھا اور لائل پور کی جیلوں میں رکھا گیا۔ اُنہیں قیدِ تنہائی کے دن بھی گزارنے پڑے،فیضؔ کی بہت سی خوب صورت اور معرکہ کی نظمیں قید کے زمانے کی یادگار ہیں۔ان کے یہ اشعار جن میں تلخیِ حیات اور تلخیِ کلام کا احساس ہوتا ہے اسی زمانے کی یادگار ہیں۔

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبولی ہیں اُنگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

۲۰/اپریل ۱۹۵۵ء کو فیضؔ جیل سے رہا ہوئے۔اس کے بعد اُنہوں نے مختلف ممالک کے دَورے بھی کیے۔افریقہ اور ایشیا میں ادیبوں کی ہونے والی کانفرنسوں میں فیضؔ نے ترقّی پسند تحریک کے لیڈر کی حیثیت سے شرکت کی۔دسمبر ۱۹۵۸ء میں پاکستان میں ایوب خاں کا مارشل لاء نافذ ہو چکا تھا اور فیضؔ کو ایک بار پھر سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کرلیا گیا۔یکم/ اپریل ۱۹۵۹ء کو فیضؔ جیل سے رہا ہوئے۔فیضؔ پہلے ایشیائی شاعر ہیں جنہیں لینن اَمن پرائز ۱۹۶۱ء میں ماسکو میں دیا گیا۔۱۹۷۳ء میں سجّاد ظہیر کے انتقال سے فیضؔ کو گہرا صدمہ پہنچا۔فیضؔ قیام بیروت کے دَوران وہاں سے نکلنے والے میگزین ''لوٹس'' کے مدیر بھی رہے۔

فیضؔ ان خوش نصیب شاعروں میں سے ہیں جنہیں ان کی زندگی میں ہی عالم گیر پیمانے پر شہرت مل چکی تھی۔ان کی زندگی میں ہی نہ صرف ہندوستان کے لکھنؤ، بھوپال، الٰہ آباد، ممبئی وغیرہ شہروں میں ان پر سیمنار وغیرہ ہوئے بلکہ لندن یونیورسٹی میں بھی ان پر سیمنار ہوا۔اس سیمنار میں فیض نے بذاتِ خود شرکت کی۔فیض کی تقریباً ۱۵ شعری ونثری تخلیقات شائع ہوکر منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔

فیضؔ نہ صرف شاعر بلکہ وہ ایک کامیاب ڈرامہ نگار اور نثر نگار بھی تھے۔اُنہوں نے دو فلموں میں مکالمے اور گانے بھی لکھے۔اس انسان دوست اور محبّ وطن شاعر کی شمع حیات ۲۰ نومبر ۱۹۸۴ء کو لاہور کے میڈیکل کالج میں گُل ہوگئی اور ان کی بے چین روح کو ابدی سکون مل گیا۔لاہور کے ماڈل ٹاؤن کے قبرستان میں حفیظ جالندھری کے مزار کے قریب ان کے جسد خاکی کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔

فیضؔ کی شخصیت کی تعمیر میں ان کے گرد و پیش کے ماحول کا بڑا ہاتھ ہے۔سب سے پہلے وہ اپنے اساتذہ کے کلام سے متاثر ہوئے۔ پھر انقلابِ روس نے ان کے دل و دماغ پر اپنے اثرات مرتسم کیے۔اس کے علاوہ جوش، چکبست، ساغر، حفیظ، سیماب وغیرہ کی شاعری اور ملک وقوم کی خدمات سے متاثر ہوئے۔۱۹۳۳ء میں جرمن میں ہٹلر نے تباہ و بربادی کی اور تہذیب وتمدن پر گہرا حملہ کیا۔اس کے نتیجے میں لوگوں کے اندر سیاسی بیداری پیدا ہونے لگی اور دوسری جنگ عظیم کے آثار بھی نمایاں ہونے لگے۔لوگوں میں فاشزم کے خلاف غم وغصّے کی لہر دَوڑ گئی۔اس کا اثر فیضؔ پر بھی پڑا۔

اسی زمانے میں علی گڑھ میں زیر تعلیم طلبا کا ایک گروہ جس میں سردار جعفری، جاں نثار اختر، حیات اللہ انصاری، مجاز لکھنوی، اختر رائے پوری، خواجہ احمد عبّاس، شاہد لطیف اور سبطِ حسن وغیرہ تھے، اشتراکیت کی طرف مائل ہوئے۔کالج کی ملازمت کے زمانے میں پروفیسر محمود الظّفر اور رشید جہاں سے ملاقات اور اس کے ساتھ ہی کارل مارکس کے منشور کے عمیق مطالعے نے ان کی دنیائے شاعری میں نمایاں تبدیلی پیدا کر دی۔اس کے ساتھ ہی فیضؔ اس وقت کے حالات اور ماحول سے بھی بہت متاثر ہوئے۔یہی وہ حالات تھے جنہوں نے فیضؔ کی شخصیت کی تعمیر میں اہم رول ادا کیا۔اس سے ان کی شاعری متاثر ہوئی۔ایسی شاعری جس نے رفتہ رفتہ اشتراکیت کی راہ اپنا کر اسے اپنی شاعری کا بنیادی فلسفہ بنالیا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۱﴾ اردو نظم کی داغ بیل کہاں پڑی؟

﴿۲﴾ فیضؔ کو لینن امن پرائز کب اور کہاں ملا؟

﴿۳﴾ فیضؔ کی شخصیت کی تعمیر میں کس کا اہم رول رہا؟

08.04 فیض احمد فیضؔ کی نظم نگاری

اُردو شاعری میں فیض کی شخصیت ایک رومانی شاعر کی حیثیت سے اُبھر کر سامنے آتی ہے لیکن جیسے جیسے شاعری کا سفر آگے بڑھتا ہے رومانی عناصر کم ہونے لگتے ہیں اور اس کی جگہ اشتراکیت، سیاسی وسماجی شعور، انقلابیت اور حُبُّ الوطنی جیسے خیالات جگہ پانے لگتے ہیں اور کلام میں پختگی آتی جاتی ہے۔پہلا مجموعہ ''نقش فریادی'' جو ۱۹۴۱ء میں منظرِ عام پر آیا دو حصّوں پر مشتمل ہے۔پہلے حصّے میں رومانی اور دوسرے حصّے میں رومانی اور نیم اشتراکی نظمیں شامل ہیں۔''نقش فریادی'' کے پہلے حصّے کی نظمیں اساتذہ کے کلام سے متاثر ہوکر تخلیق ہوئی ہیں۔

۳۵-۱۹۳۴ء میں عالمی سطح پر تیزی سے بدلتے ہوئے سیاسی ماحول نے ان کی فکر کو ایک نیا رُخ دے دیا۔نظم ''یاس'' اور ''میرے ندیم'' اس کی بہترین مثالیں ہیں۔رومان سے اشتراک کی طرف جاتے ہوئے بھی ان کی شاعری پر تذبذب اور کش مکش کی فضا چھائی رہتی ہے اور یادِ محبوب باقی رہتی ہے۔ترقّی پسند تحریک سے وابستگی ،کارل مارکس کے مینی فسٹو کا گہرائی سے مطالعہ، سجّاد ظہیر اور رشید جہاں کی انقلابی صحبتوں نے فیضؔ کے شعری رجحان کو متاثر کیا اور فیضؔ پکار اُٹھے۔

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

....

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

یوں شاعری کے ایک نئے دَور کا آغاز ہوتا ہے جہاں فیضؔ کا تخلیقی سفر بے پناہ انقلابی تبدیلیوں سے ہم کنار ہو کر وقت اور عہد کے تقاضے پورے کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔نقشِ فریادی کے دوسرے حصّے کی شاعری اس کا ثبوت ہے۔فیضؔ کی شاعری کا یہی وہ تاریخی موڑ ہے جب اُنہوں نے اپنی معرکہ آرا غزل ''دونوں جہاں تیری محبّت میں ہار کے'' تخلیق کی۔''رقیب سے''، ''تنہائی''، ''کتے'' اور ''بول'' وغیرہ نظمیں ان کے بدلتے ہوئے موڈ کی عکّاسی کرتی ہیں۔نظم ''سوچ'' میں بدلتے ہوئے رجحان کا برملا اظہار ملتا ہے۔دوسرے انقلابی شعرا کی مانند فیضؔ کی شاعری میں انقلاب کی گھن گرج نہیں ہے۔اس کی مثال نظم ''بول'' ہے جس میں اشاروں کے ذریعے بات کی گئی ہے۔

فیضؔ کی اس دَور کی شاعری میں رومان سے حقیقت اور پھر حقیقت سے رومان کی طرف قدم بڑھانے کا کامل صاف طور سے دیکھا جا سکتا ہے۔فیضؔ کی اشتراکیت کے سلسلے میں محمّد علی صدّیقی لکھتے ہیں:

''فیضؔ کے یہاں اشتراکیت ایک فکر دل پسند ہے جو ان کی نظموں اور غزلوں کا خمیر اُٹھاتی ہے۔''

''دستِ صبا'' تک پہنچتے پہنچتے فیضؔ کے سیاسی شعور میں پختگی آجاتی ہے۔یہ زمانہ تاریخی اعتبار سے تبدیلیوں کا ہے۔فیضؔ پر بھی ان تبدیلیوں کے اثرات مرتّب ہوتے رہتے ہیں اور پھر ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی آزادی، ملک کا بٹوارہ اور قتل و غارت گری نے فیضؔ کو بے پناہ متاثر کیا۔آزادی کا یہ متوالا آزادی کی صبح کو داغ داغ کہنے پر مجبور ہو گیا۔

یہ داغ داغ اجالا ، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا ، یہ وہ سحر تو نہیں

''دستِ صبا'' کا زیادہ تر کلام قید کے زمانے میں لکھا گیا۔اسی لئے شاعری پر زنداں کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔وہ قطعہ جو فیضؔ نے زمانۂ قید میں لکھا ہے ان کے بلند حوصلے کا غمّاز ہے۔جہاں ماتم نہیں بلکہ لوگوں کو بیدار کرنے کا جذبہ ہے۔

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں اُنگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

اس عہد کی غزلیں بھی انسانی ہم دَردی، آزادی، سماج اور ملک میں ایک عمدہ نظامِ حکومت قائم کرنے اور انقلاب پیدا کر دینے کے جذبے سے بھری ہوئی ہیں۔ اسی طرح ''دستِ صبا'' کا شعری سرمایہ ان کے پختہ سیاسی شعور، فکر و خیال کی بلندی، عوام سے قربت، مضبوط نظریۂ اشتراکیت اور فکر کی عالمگیریت کا واضح ثبوت فراہم کرتا ہے۔ فیضؔ پوری دنیا کے عوام کے ہر دل عزیز شاعر بن کر اُبھرتے ہیں اور ایک راہ پا کر اپنی منزل کی طرف بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

فیضؔ کی شاعری کا یہ سفر آگے بڑھتے ہوئے ''زنداں نامہ'' اور ''دستِ تہِ سنگ'' کی منزلوں تک پہنچتا ہے۔ اس عہد کی شاعری میں رومانی، سیاسی اور اشتراکی نقطۂ نظر کی حامل ہے۔ کہیں کہیں اشتراکیت اور رومان کا ملا جلا ماحول بھی پایا جاتا ہے۔ شاعری کی اس منزل پر پہنچتے پہنچتے فیضؔ کی فکریں مختلف شکلیں اختیار کرتی ہیں۔ شاعری کا سیاسی و سماجی شعور پختہ ہو کر اور بھی نکھر کر سامنے آتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی زنداں کے آلام و مصائب نے اُنہیں غریبوں کے دکھ درد سے اور بھی قریب کر دیا ہے لیکن شاعری کی اس منزل کو پہنچ کر بھی وہ رومانیت سے اپنا دامن نہیں چھڑا سکے۔ حالاں کہ وہ رومانیت جو نقشِ فریادی اور دستِ صبا کا خاصہ تھی ان مجموعوں میں نہیں ملتی۔ فیضؔ نے اپنی شاعری کے ذریعے پوری قوم لے لئے حکمرانوں کے خلاف جو جنگ لڑی ہے وہ قابلِ غور ہے۔ اس عہد کی غزلیں بڑی عمدہ اور معیاری ہیں۔ روایتی علامتیں اور استعارے نئے معانی و مفاہیم میں استعمال ہوئے ہیں۔ غزلیں اس وقت کے حالات و واقعات اور مسائل و ماحول کی طرف اشارہ کرتی ہیں جس سے اس وقت کا معاشرہ دوچار تھا۔ غزلوں کا مواد سیاسی ہے تو کچھ میں تلخیِ حیات اور تلخیِ روزگار کو موضوع بنایا گیا ہے۔

لب پر ہے تلخیِ مئے ایّام ورنہ فیض
ہم تلخیِ کلام پر مائل ذرا نہ تھے

غرض کہ فیضؔ کی نظمیں اور غزلیں سیاسی ہوں یا نیم سیاسی، رومانی ہوں اشتراکی ہوں یا نیم اشتراکی، ان کا اشتراکی نقطۂ نظر بڑی کامیابی سے نظم ہوا ہے۔ آخری عہد کی شاعری بھی اپنے اردگرد کے ماحول اور بین الاقوامی سطح پر رونما ہونے والے حالات سے متاثر ہو کر وجود میں آتی ہیں۔ انسانیت پر کامل یقین فیضؔ کی آخری دَور کی شاعری میں بھی موجود ہے۔ فیضؔ کی نظریں بین الاقوامی مسائل پر بھی تھیں۔ اس لئے دنیا بھر کے دُکھی عوام ان کی شاعری میں جگہ پاتے ہیں۔ اپنے اس جذبے کے تحت فیضؔ بین الاقوامی سطح پر شہرت سے ہم کنار ہوئے۔

فیضؔ کی بین الاقوامی سطح پر اشتراکی نظریے کی وسعت و ہمہ گیری کی دلیل ان کی وہ نظمیں ہیں جن میں اُنہوں نے قومی سطح سے اوپر اُٹھ کر عالمی سطح کے مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ ان میں فلسطین، ایرانی طلبا اور بنگلہ دیش، بیروت وغیرہ پر نظمیں شامل ہیں۔ اس دَور کی غزلوں کا اندازِ بیان کلاسیکی ضرور ہے لیکن اس میں خاصہ نیا پن موجود ہے۔ ان کی غزلوں کی فضا نظموں کی فضا سے مناسبت رکھتی ہے۔ جو افسردگی اور درماندگی ان کی نظموں میں ملتی ہے وہی ان کی غزلوں کا بھی خاصہ ہے لیکن اس کے باجود فیضؔ محبوب کے دامِ محبّت میں گرفتار نظر آتے ہیں لیکن اشعار میں کہیں کہیں غمِ حیات اور غمِ زمانہ کے درد کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔

فیضؔ نے ملک و ملّت، رنگ و نسل کے تعصّبات سے اوپر اُٹھ کر شاعری کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شہرت نہ صرف ملک گیر ہے بلکہ عالم گیر ہے۔ ان کے یہاں ساری انسانیت کا دکھ درد اپنی بلند سطح پر ملتا ہے۔ درد کا رشتہ وہ رشتہ ہے جو ان کی شاعری کے ہر دَور میں جلوہ فگن رہتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جہاں بھی بے قصور عوام کو نشانہ بنایا گیا فیضؔ خاموش نہیں رہے بلکہ پر اثر نظمیں کہنے میں کامیاب ہو گئے۔ فیضؔ میں سیاست اور انسانیت شیر و شکر ہو کر کچھ اس طرح اشتراکیت کی شکل اختیار کرتی ہیں کہ پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ انسانیت اور انسانیت سے سچّی محبت فیضؔ کو بین الاقوامی شاعر بناتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دَور کے شعرا میں فیضؔ کو جو شہرت و مقبولت ملی وہ کسی اور شاعر کا حصّہ نہیں۔ ہم فیضؔ کی شاعری کی خصوصیات کو مندرجہ ذیل حصّوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱)۔ رومانی شاعری (۲)۔ انقلابی شاعری (۳)۔ اشتراکی شاعری
(۴)۔ رومانی اشتراکی شاعری (۵)۔ سیاسی شاعری (۶)۔ نیم سیاسی شاعری
(۷)۔ بین الاقوامی سطح کی شاعری

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۴﴾ فیضؔ کی فکر کو نیا رُخ کب ملتا ہے؟
﴿۵﴾ فیضؔ کی انقلابی شاعری میں گھن گرج ہے یا نہیں؟
﴿۶﴾ فیضؔ کا کوئی ایک شعر لکھیں، جس میں تلخیِ حیات اور تلخیِ زمانہ کا ذکر ہو!

08.05 فیض احمد فیضؔ کی نظم ''صُبحِ آزادی'' متن

یہ داغ داغ اُجالا ، یہ شب گزیدہ سحر — وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں، جس کی آرزو لے کر — چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل — کہیں تو ہوگا شبِ سُست موج کا ساحل
کہیں تو جاکے رُکے گا سفینۂ غمِ دل — جواں لہو کی پر اسرار شاہراہوں سے
چلے جو یار تو دامن پہ کتنے ہاتھ پڑے — دیارِ حُسن کی بے صبر خواب گاہوں سے
جگر کی آگ ، نظر کی اُمنگ ، دل کی جلن — کسی پہ چارۂ ہجراں کا کچھ اثر ہی نہیں
کہاں سے آئی نگارِ صبا کدھر کو گئی — ابھی چراغِ سرِ رَہ کو کچھ خبر ہی نہیں
ابھی گرانیِ شب میں کمی نہیں آئی — نجاتِ دیدۂ و دل کی گھڑی نہیں آئی

چلے چلو ! کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

08.06 فیض احمد فیضؔ کی نظم ''صُبحِ آزادی'' تشریح

فیضؔ اور دوسرے ہندوستانی رہنماؤں نے آزادی کا خواب دیکھا تھا۔ ان کا یہ خواب ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو مکمّل تو ہوا لیکن ہندوستان کو دو حصّوں میں تقسیم ہونے کی شکل میں۔ سالہا سال کی غلامی کے بعد ملک کو آزادی نصیب ہوئی لیکن جس آزادی کا انتظار تھا یہ وہ آزادی نہیں تھی۔ ہندوستان میں آزادی کا اُجالا پھیلا لیکن داغ داغ تھا۔ یہ اُجالا رات کی سیاہی کا ڈسا ہوا تھا۔ آزادی صبحِ کاذب کی مانند آئی۔ یہ سحر، وہ

آزادی کی صبح نہیں تھی جس کی ہم نے (یا کم از کم فیضؔ نے) آرزو کی تھی، جس لے لئے اتنی جدّ وجہد کی تھی۔ یہ وہ سحر نہیں تھی جس کی خواہش میں لوگوں نے اپنی جان کی بازیاں لگا دی تھیں، جام شہادت پیا اور جیلوں کی سنگلاخ سلاخوں کے پیچھے اپنی زندگی کے قیمتی دن گنوا دیئے۔ آزادی کی آرزو میں ایک لمبا سفر طے کیا تھا۔ اس اُمید پر کہ صبحِ کاذب کے بعد صبح صادق ہوگی اور جو نیا سورج طلوع ہوگا وہ ہمارے لئے ایک نئے نظام کی خوشخبری لے کر آئے گا۔ ہم نے سرمایہ داروں، انگریزوں اور حکمرانوں کے ظلم و جبر اسی لئے برداشت کیے تھے کہ کہیں تو اس ظلم و جبر کا خاتمہ ہوگا۔ تاروں کی آخری منزل میں کبھی تو سست رفتار سے چلنے والی رات ساحل سے جا لگے گی۔ یعنی کبھی تو اس سیاہ رات کا خاتمہ ہوگا۔ غموں کا سفینہ کنارے لگے گا اور لوگوں کو غموں سے نجات ملے گی۔

شاعر کو وہ وقت بھی یاد ہے جب وہ آزادی کی لڑائی میں شریک ہونے لے لئے سر سے کفن باندھ کر گھر سے نکل پڑا تھا۔ آگے اسی کا ذِکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جب ہم اس معرکہ میں قدم رکھنے لے لئے آگے بڑھے تو ہمارے دامن پہ نہ جانے کتنے ہاتھ پڑے۔ کیوں کہ ہم اس شاہراہ سے ہو کر گزر رہے تھے جہاں بے صبر خواب گاہوں میں حُسن کی دیویاں بلاتی ہیں لیکن ہم آزادی کے متوالے تھے ہم پر ان سب باتوں کا اثر کہاں ہوتا ہے۔ ہم ان سب چیزوں سے بے خبر اپنی منزل کی طرف بڑھتے رہے۔ کیوں کہ ہمیں تو آزادی عزیز تھی ہمیں تو اس سحر کا انتظار تھا جب آزادی کا سورج طلوع ہوگا اور جگر کی آگ، نظر کی اُمنگ اور دل کی جلن کو راحت ملے گی۔ میں نے آزادی لے لئے ان تمنّاؤں کا خون کیا اور بدن کے بلانے اور بانہوں کے پکارنے پر دھیان نہیں دیا۔ ہجر کے درد کو سہا اور راستوں میں آنے والی ان تمام رکاوٹوں کو پار کیا جو آگے جانے سے ہمارے قدم روک رہی تھیں۔ کیوں کہ ہم اس سحر کے، اس صبح کے دیکھنے کے تمنّائی تھے جس میں سبھی انسانوں کو مساوات کا درجہ ملے گا، طبقاتی تفریق سے معاشرہ آزاد ہوگا، کوئی غریبوں کی محنت کا مذاق نہ اڑا سکے گا لیکن آزادی ملنے کے بعد یہ سب کچھ تو نہیں ہوا۔ ہاں لوگوں کے اندر وحشیانہ جذبے نے ضرور جنم لے لیا۔ لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے اور آزادی ملنے پر خون کی ہولی کھیلی گئی۔

فیضؔ کہتے ہیں کہ آزادی کس انداز سے آئی، ہم آزادی کے متوالوں کو اس کی کچھ خبر بھی نہیں، جگر کی آگ، نظر کی اُمنگ اور دل کی جلن ان سب چیزوں پر ہمیں ابھی تک قابو نہیں ہو سکا۔ یعنی معاشرے میں ابھی آزادی سے پہلے والا ماحول موجود ہے۔ ابھی شب کی گرانی میں کمی نہیں آئی، ابھی وہ گھڑی نہیں آئی ہے جس میں ہمیں معاشرے کی تمام برائیوں سے نجات مل جائے۔ اسی لئے شاعر ایسی آزادی کی خاطر جس کی وہ تمنّا کرتا ہے اس منزل کی طرف آگے بڑھنے کو کہتا ہے۔ تاکہ آگے جا کر کہیں نہ کہیں اس کو وہ منزل مل جائے جس کی اس نے تمنّا کی تھی۔

فیضؔ کی یہ نظم اپنے عہد کا وہ منظر نامہ پیش کرتی ہے جو اس وقت کے نظام میں موجود تھا اور وقت کے تلخ حقائق سے بھی ہمیں آگاہ کرتی ہے۔ یہ نظم فیضؔ کے سیاسی و طبقاتی شعور کی آئینہ دار ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۷﴾ آزادی کی خاص بات کیا تھی؟

﴿۸﴾ کیا فیضؔ کی نظم اپنے عہد کا منظر نامہ ہے؟

﴿۹﴾ فیضؔ کی نظم ان کے کس رجحان کا پتہ دیتی ہے؟

08.07 فیض احمد فیضؔ کی نظم ''صُبحِ آزادی'' تجزیہ

ایک لمبی لڑائی اور بہت سی جانوں کی قیمت چکانے کے بعد ہندوستان ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو آزاد تو ہوا لیکن دو حصّوں میں تقسیم ہو کر۔ فیضؔ جنہوں نے ملک کی آزادی لے لئے فوج کی نوکری کی اور آزادی کا جو خوب صورت خواب دیکھا تھا ان کے خوابوں کا شیرازہ بکھر گیا۔ ہر طرف قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو گیا، خون کی ہولی کھیلی گئی۔ ظلم کی اس ننگی تصویر سے فیضؔ بہت متاثر ہوئے اُنہوں نے اپنے اُنہیں احساسات کی ترجمانی اس نظم ''صبحِ آزادی'' میں کی ہے، جو ان کے مجموعۂ کلام ''دستِ صبا'' میں شامل ہے۔

ہندوستان میں آزادی کا اجالا داغ دار بن کر پھیلا۔ جس خوش نما صبح کی توقّع آزادی سے متوقّع تھی یہ وہ صبح نہیں تھی، جس کی خواہش میں لوگوں نے دار و رَسن کی تکلیفیں برداشت کی تھیں۔ آزادی کے بعد ملک میں نفرتوں کا چراغ گُل ہو جانا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ کچھ شرپسندوں نے فرقہ واریت کی آگ میں ملک کے عوام کو جلا ڈالا۔ ابھی معاشرے میں آزادی سے پہلے والا ماحول موجود تھا۔ اس لئے فیض یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ:

چلے چلو! کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

یعنی ہم نے جس منزل کی خواہش کی تھی وہ منزل ابھی بھی نہیں آئی، ابھی ہمیں مزید جد و جہد کرنی ہے۔

08.08 خلاصہ

نظم کے قدیم و جدید سرمایے پر نظر ڈالنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس کا دامن رنگا رنگ اور متنوّع مضامین سے مالا مال ہے۔ ترقّی پسند ادبی تحریک کی داغ بیل پڑنے کے بعد نظم میں سیاسی، سماجی اور معاشرتی خیالات بھی جگہ پانے لگتے ہیں۔ فیض احمد فیضؔ ترقّی پسند تحریک سے وابستہ تھے۔ اس لئے فیضؔ کے یہاں بھی سارے مضامین نظم میں جگہ پاتے ہیں۔

فیضؔ کی پیدائش سیالکوٹ کے ایک گاؤں کالا قدار میں ۱۳/فروری ۱۹۱۱ء کو ہوئی تھی۔ ان کے والد سلطان محمد اپنے وقت کے مشہور بیرسٹر اور علّامہ اقبال کے دوستوں میں سے تھے۔ فیضؔ کا بچپن بہت عیش میں گزرا لیکن والد کے انتقال کے بعد معاشی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کی پرورش مذہبی ماحول میں ہوئی۔ فیضؔ نے ایک انگریز خاتون ایلس جارج سے شریعتِ اسلامی کے مطابق شادی کی۔ فیضؔ کی عملی زندگی کا آغاز تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ۱۹۳۵ء سے ہوتا ہے جب مسلم اینگلو اورینٹل کالج میں ان کا تقرر بحیثیت انگریزی لکچرار ہوا لیکن وہ فوج میں بھرتی ہو گئے اور ہندوستان کی آزادی کے بعد وہ فوج سے مستعفی ہوئے۔ صحافت کے میدان میں قدم رکھا اور خوب نام کمایا۔ ترقّی پسند تحریک سے ان کی شروع سے وابستگی رہی اور اپنی سیاسی دل چسپیوں کے باعث کئی مرتبہ جیل بھی گئے۔

اردو شاعری میں فیضؔ کی شخصیت ایک رومانی شاعر کی حیثیت سے اُبھر کر سامنے آئی ہے لیکن جیسے جیسے شاعری کا سفر آگے بڑھتا ہے، رومانی عناصر کم ہونے لگتے ہیں اور اس کی جگہ اشتراکیت، سماجی و سیاسی شعور، انقلابیت اور حُبُّ الوطنی جیسے خیالات جگہ پانے لگتے ہیں۔ پہلا مجموعہ ''نقشِ فریادی'' ۱۹۴۱ء میں منظرِ عام پر آیا۔ ان کے دوسرے مجموعوں کے نام ''دستِ صبا''، ''زنداں نامہ'' اور ''دستِ تہِ سنگ'' ہیں۔

فیضؔ کی شاعری میں سیاست اور انسانیت شیر و شکر ہو جاتے ہیں۔ انسان اور انسانیت سے سچّی محبت فیضؔ کو بین الاقوامی شاعر بناتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فیضؔ اپنے عہد کے مقبول شاعر قرار دیے جاتے ہیں۔ فیضؔ کی شاعری کو متعدّد حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً رومانی شاعری، انقلابی شاعری، اشتراکی شاعری، رومانی اشتراکی شاعری، سیاسی شاعری، نیم سیاسی شاعری اور بین الاقوامی سطح کی شاعری وغیرہ۔

نظم ''صبحِ آزادی'' فیضؔ کی مقبول ترین نظموں میں سے ایک ہے جو ان کے مجموعۂ کلام ''دستِ صبا'' میں شامل ہے۔ یہ نظم دراصل آزادی کا مرثیہ ہے۔ کیوں کہ آزادی کا وہ خواب جو فیضؔ نے دیکھا تھا، آزادی کے بعد بھی پورا نہ ہوسکا۔ ان کے خواب کا شیرازہ بکھر گیا۔ یہ نظم اس وقت کے تلخ حقائق سے آگاہ کرتی ہے۔

08.09 فرہنگ

آلام : رنج وغم

استفادہ : فائدہ حاصل کرنا

افسردگی : کمہلاہٹ، مرجھانا

بیدار : جگانا

پراسرار : بھید سے بھرا

تابناک : روشن، چمکیلا

جذبہ : ولولہ، جوش

جسدخاکی : مٹّی کا جسم

حادثہ : صدمہ، سانحہ، واقعہ

حلقہ : دائرہ، گولائی

خاصہ : اچّھائی

خواب گاہ : آرام کرنے کی جگہ

دشت : جنگل، صحرا، میدان

دست گاہ : طاقت، قدرت، مہارت

دوچار : جوجھنا

دیارِ حسن : محبوب کے شہر کا علاقہ

دیدہ : آنکھ کا دیکھا ہوا

صبح صادق : (سچّی صبح) نور کا تڑکا، پو پھٹے

صبح کاذب : جھوٹی صبح (صبح کی وہ روشنی جس کے بعد پھر اندھیرا ہوجاتا ہے)

سرمایہ : پونجی، دولت

سفینہ : کشتی یا جہاز

شاہ راہ : سڑک

طلوع : نکلنا

قدیم : پرانی

گرانی : بھاری پن

گزیدہ : ڈسا ہوا

گُل : بجھنا (ختم ہونا، مرجانا) پھول کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے

لوح : تختی

متاع : پونجی

متنوّع : طرح طرح کے

نگار : بات، محبوب

ننگ : ننگا

وسیع : پھیلنا، پھیلاؤ

ہجراں : ہجر کی جمع (جدائی)

ہیئت : شکل

08.10 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درجِ ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : دستِ صبا کی شاعری کا مختصراً جائزہ لیجیے۔

سوال نمبر۲ : فیضؔ کے حالاتِ زندگی پر مختصر روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر۳ : فیضؔ کی نظم ''صبحِ آزادی'' کا تجزیہ قلم بند کیجیے۔

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : فیض احمد فیضؔ کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ بتائیے۔

سوال نمبر۲ : کیا فیضؔ کی نظم ''صبحِ آزادی'' اپنے عہد کا منظر نامہ ہے؟ اپنا موقف پیش کیجیے۔

سوال نمبر۳ : فیضؔ کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے دستِ صبا کی شاعری کا جائزہ لیجیے۔

08.11 حوالہ جاتی کتب

۱۔	تخلیق وتنقید	از	امیر اللہ خاں شاہین
۲۔	فیض احمد فیض	از	مرتبہ ضیا ساجد
۳۔	فیض احمد فیض تنقیدی جائزہ	از	مرتبہ خلیق انجم
۴۔	فیض احمد فیض شخص اور شاعر	از	مرتبہ اظہر نبی
۵۔	فیضانِ فیض	از	ابوسعید قریشی

08.12 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ اردو نظم کی داغ بیل دکن میں پڑی۔

﴿۲﴾ فیض کو لینن امن پرائز ۱۹۶۱ء میں ماسکو میں ملا۔

﴿۳﴾ اس وقت کے حالات اور کارل مارکس کے منشور کے مطالعہ نے اہم رول ادا کیا۔

﴿۴﴾ ۱۹۳۴-۳۵ء میں ان کی فکر کو ایک رخ ملتا ہے۔

﴿۵﴾ فیض کی انقلابی شاعری میں گھن گرج نہیں ہے۔

﴿۶﴾ متاعِ لوح وقلم چھن گئی تو کیا غم ہے ☆ کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

﴿۷﴾ آزادی کی خاص بات یہ تھی کہ ملک دو حصّوں ''ہندو پاکستان'' میں تقسیم ہو گیا۔

﴿۸﴾ فیض کی نظم ''صبحِ آزادی'' اپنے عہد کا منظر نامہ پیش کرتی ہے اور اس وقت کے تلخ حقائق سے بھی آگاہ کرتی ہے۔

﴿۹﴾ فیض کی یہ نظم ان کے پختہ سیاسی، سماجی وطبقاتی رجحان کی آئینہ دار ہے۔

اکائی 09 : اسرارالحق مجاز (آوارہ)

ساخت

09.01 : اغراض ومقاصد

09.02 : تمہید

09.03 : اسرارالحق مجاز کے حالاتِ زندگی

09.04 : اسرارالحق مجاز کی نظم نگاری

09.05 : اسرارالحق مجاز کی نظم ''آوارہ''، متن

09.06 : اسرارالحق مجاز کی نظم ''آوارہ'' تشریح

09.07 : اسرارالحق مجاز کی نظم ''آوارہ'' تجزیہ

09.08 : خلاصہ

09.09 : فرہنگ

09.10 : نمونہ امتحانی سوالات

09.11 : حوالہ جاتی کتب

09.12 : اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

09.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی کا مقصد طلبا کو ترقّی پسند شاعر مجاز کے حالاتِ زندگی اور شاعری سے واقف کروانا ہے۔اس اکائی کے مطالعہ کے بعد طلبا سے یہ اُمید کی جاتی ہے کہ وہ مجاز کے حالات سے واقف ہوسکیں گے، نظم ''آوارہ'' کے مرکزی خیال سے واقفیت حاصل کرسکیں گے اور اس کی تشریح بھی کرسکیں گے۔

09.02 تمہید

ترقّی پسند شعرا میں مجاز اپنی ایک خاص شناخت رکھتے ہیں۔وہ فطرتاً انقلابی ہیں۔ان کی شاعری میں خیال عمل کے سانچے میں ڈھلتا ہوا نظر آتا ہے۔جذبے، فکر، احساس اور شعور کی ہم آہنگی ان کی شاعری خصوصیت ہے۔نظم ''آوارہ'' اس کی اچھّی مثال ہے۔اس اکائی میں ہم مجاز کے حالاتِ زندگی اور شاعری کے ساتھ ساتھ ان کی انقلابی نظم ''آوارہ'' کا مطالعہ کریں گے۔

09.03 اسرارالحق مجاؔز کے حالاتِ زندگی

اسرارالحق مجاؔز لکھنوی ۱۹/اکتوبر ۱۹۱۱ء کو بارہ بنکی کے قصبہ ردولی میں پیدا ہوئے۔ان کے والد کا نام چودھری سراج الحق تھا، جو لکھنؤ میں محکمۂ رجسٹریشن میں ہیڈ کلرک تھے۔دادا کا نام چودھری احمد حُسین تھا جو متوسّط درجے کے زمین دار تھے۔ترقّی پسند شاعر جاں نثار اخؔتر کی رفیقۂ حیات مجاؔز کی ہمشیرہ تھیں۔روایتی تعلیم کے بعد مجاؔز نے امین آباد اسکول سے میٹرک کا میاب کیا۔

۱۹۲۹ء میں سینٹ جانسن کالج آگرہ میں ایف.ایس.سی میں داخلہ لیا۔آگرہ کا ماحول ان کی شعری وادبی زندگی کے لئے سازگار تھا۔ فانؔی بدایونی ان کے پڑوسی تھے۔کالج کے ساتھیوں میں معین احسن جذبی ان کے خاص دوست تھے۔آل احمد سرؔور بھی اس زمانے میں اسی کالج میں زیرِ تعلیم تھے اور مجاؔز اور جذؔبی سے ایک سال سینئر تھے۔آگرہ میں میکشؔ اکبرآبادی سے بھی مجاؔز کے دوستانہ مراسم تھے، جس کی وجہ سے مجاؔز کے روابط فانؔی بدایونی سے قائم ہوئے اور مجاؔز نے ان سے اپنی کچھ غزلوں پر اصلاح لی۔حامد حسین قادری نے آگرہ میں انجمن ترقّی اردو کی شاخ قائم کی۔اس ادبی ماحول نے مجاؔز کو متاثر کیا اور یہ ماحول ان کی فکر کو اُجاگر کر کے ان کی صلاحیتوں کو چمکانے اور ان کے اچھوتے جذبات کے اظہار کے لئے مواقع فراہم کرنے میں معاون ثابت ہوا۔

۱۹۳۰ء میں مجاؔز کے گھر والے آگرہ سے علی گڑھ آ گئے اور ۱۹۳۱ء میں اُنہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔دسمبر ۱۹۳۳ء میں انجمن حدیقۃ الشعرا کے سالانہ مشاعرے میں جس کی صدارت سر راس مسعود وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے کی تھی، جس میں حسرؔت موہانی، اصغؔر گونڈوی اور حفیؔظ جالندھری نے شرکت کی تھی، مجاؔز نے ''صبحِ بہار'' کے موضوع پر ایک پُر اثر اور پُر سوز نظم سنا کر داد و تحسین حاصل کی۔علی گڑھ کی خوشگوار ادبی فضا سے مجاؔز کا یہ پہلا تعارف تھا۔۱۹۳۵ء میں مجاؔز نے بی.اے کی ڈگری لی اور ایم.اے اردو میں داخلہ لیا۔

شاعر کی حیثیت سے وہ اس قدر مقبول تھے کہ پرانی روایتوں کو نظر انداز کر کے اُنہیں سالِ اوّل کے طالبِ علم ہونے کے باوجود میگزین کا ایڈیٹر بنایا گیا۔وہ مسلم یونیورسٹی میں تقریباً پانچ سال تک رہے۔ان کی زندگی کے یہی پانچ سال ان کے ذہنی سکون کے ہیں۔اُنہیں یہاں مسرّت افزا ماحول، پُر کشش فضا اور زندگی کے رعنائیوں سے ہم کنار ہونے کا موقع ملا۔علی گڑھ کے پانچ سال ان کی زندگی میں ایک نئے انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔یہاں اُنہوں نے ترقّی پسند تحریک سے خود کو وابستہ کیا۔انقلاب کے نعرے لگائے اور خوش حال زندگی کے خواب دیکھے۔۱۹۳۵ء میں آل انڈیا ریڈیو کے رسالے ''آواز'' کے سب ایڈیٹر بھی تھے۔ریڈیو میں ملازمت ترک کرنے کے کچھ دن بعد مجاؔز دہلی میں رہے۔کچھ وقت دوسرے شہروں میں بھی گزارا۔پھر اُنہوں نے اپنے والدین کے ساتھ لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی۔

اس زمانے میں لکھنؤ ترقّی پسند تحریک کا ایک بڑا مرکز تھا۔یہاں ترقّی پسند ادیبوں کے ترجمان ''پرچم'' کے معاونین میں شامل ہو گئے جس کے نگراں سبطِ حسن تھے۔جذؔبی اور مجاؔز معاونین تھے۔۱۹۳۵ء میں سبطِ حسن، علی سردار جعفری اور مجاؔز نے ''نیا ادب'' کے نام سے ایک ادبی رسالہ نکالا۔۱۹۴۰ء میں مجاؔز پر جنون کا پہلا دَورہ پڑا اور ۱۹۵۲ء میں تیسرا دَورہ پڑا۔اُنہیں رانچی مینٹل ہاسپٹل میں داخل کروایا گیا وہاں تقریباً چھ ماہ رہے۔صحت یاب ہونے کے بعد گھر لوٹے تو ان کی بہن صفیہ اخؔتر کا انتقال ہو چکا تھا۔اس صدمے کے بعد مجاؔز نے شراب چھوڑ دی اور صفیہ اخؔتر کے بچّوں کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے لگے۔ان کے احباب نے ان کو شراب پینے پر مجبور کر دیا۔۵/دسمبر ۱۹۵۵ء کو بلرام پور اسپتال میں ان کا انتقال ہوا۔نشاط گنج، لکھنؤ کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۱﴾ مجازؔ کا پورا نام کیا تھا؟

﴿۲﴾ مجازؔ کب اور کہاں پیدا ہوئے تھے؟

﴿۳﴾ مجازؔ کے بعض ہم عصر شعرا کے نام بتایئے۔

﴿۴﴾ ''صبحِ بہار'' کس کی نظم ہے؟

﴿۵﴾ مجازؔ کن کن شہروں میں مقیم رہے؟

09.04 اسرارالحق مجازؔ کی نظم نگاری

مجازؔ نے اپنی شاعری کا آغاز ایسے زمانے میں کیا جب ہندوستان نئی روشنی کی تلاش میں سرگرمِ عمل تھا۔ آزادؔ اور حالیؔ کی حقیقت نگاری کی تحریک نے مجازؔ کے عہد تک پہنچتے پہنچتے مختلف رنگ بدلے تھے۔ کہیں اس نے مشرق روایات پرستی اور حُبُّ الوطنی کا روپ اختیار کیا تو کہیں سرمایہ دارانہ نظام کے ظلم و جبر کے ردِّ عمل میں انقلاب کی نقیب بن گئی۔ مجازؔ کا دَور صنعتی انقلاب کا دَور تھا۔ پرانے جاگیردارانہ نظام کی جگہ نئے سرمایہ دارانہ نظام نے لے لی تھی، جس کا اثر سماجی اور تہذیبی زندگی پر پڑ رہا تھا۔ نوجوان طبقے میں ناآسودگیوں، معاشی مسائل اور سیاسی بحران کی وجہ سے ایک بے زاری کی سی کیفیت پائی جاتی تھی۔

دوسری طرف آزادی کا خوش آئند تصوّر اور نئی زندگی کا حسین خواب ہر نوجوان کو دعوتِ عمل دے رہا تھا لیکن جلد ہی وہ دَور بھی آ گیا جب خواب ٹوٹنے لگے، بے روزگاری اور بے اطمینانی بڑھنے لگی۔ اس شدید بے چینی کے دَور میں نئی نسل کی نفرت اپنے عروج پر تھی۔ مجازؔ کی شاعری میں اپنے دَور کی جھلکیاں جگہ جگہ نظر آتی ہیں، جن میں معاشی، معاشرتی، سیاسی اور تہذیبی محرکات اور اس دَور کی ذہنی حالت کے بتدریج ارتقا کا شعور ملتا ہے۔ اُنہوں نے اردو شاعری کو انقلاب کا صحت مند موڑ دیا۔ ان کے انقلابی رنگ میں جمالیاتی شعور بھی ہے۔

اسرارالحق مجازؔ نے اپنی شاعری میں عورت کو اسی دنیا کے آب و گل کی عورت کی شکل میں پیش کیا ہے اور اسے اس کارزارِ ہستی میں مرد کے دوش بدوش دعوتِ عمل دیتے ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ اسے انقلاب میں حصّہ لینے کی بھی تلقین کرتے ہیں۔ اردو شاعری میں یہ تصوّر بالکل نیا تھا اور اس تحریکِ آزادی کی دین تھا جس نے جھانسی کی رانی، بیگم حضرت محل وغیرہ سے لے کر سروجنی نائیڈو جیسی بے شمار ہندوستانی خواتین کو جنم دیا تھا۔

اسرارالحق مجازؔ کی شاعری ان کے دل کی آواز ہے۔ وہ بنیادی طور پر ایک رومانی شاعر ہیں۔ اُنہوں نے اپنی شاعری کی ابتدا رومانوی انداز سے کی، جس پر خالص غنائی، جذباتی اور نشاطیہ رنگ غالب ہے لیکن ان کے یہاں زندگی کی حقیقتوں کا بھی شدید احساس ہے۔ اس لئے رومان اور حقیقت کی ہم آہنگی ان کی نظموں میں ایک نئی فضا پیدا کر دیتی ہے۔ اُنہوں نے محبت کے نغمے بھی گائے اور ساتھ ہی انقلاب کا ساز بھی چھیڑا۔ وہ گہرا تاریخی اور سماجی شعور رکھتے تھے۔ ان کے یہاں اجتماعی زندگی کے بنیادی معاملات و مسائل کی ترجمانی کا رجحان بھی اپنے شباب پر نظر آتا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۶﴾ مجاز کی شاعرانہ خصوصیات کیا ہیں؟

﴿۷﴾ مجاز کی شاعری میں عورتوں کو کیا مقام حاصل ہے؟

﴿۸﴾ کیا یہ درست ہے کہ مجاز گہرا تاریخی اور سماجی شعور رکھتے تھے؟

09.05 اسرارالحق مجاز کی نظم ''آوارہ'' متن

﴿۱﴾

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارہ پھروں
جگمگاتی، جاگتی سڑکوں پہ آوارہ پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک دَر بدر مارا پھروں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

﴿۲﴾

جھلملاتے قمقموں کی راہ میں زنجیر سی
رات کے ہاتھوں میں دن کی موہنی تصویر سی
میرے سینے پر مگر دہکی ہوئی شمشیر سی
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

﴿۳﴾

یہ رُوپہلی چھاؤں، یہ آکاش پر تاروں کا جال
جیسے صوفی کا تصوّر، جیسے عاشق کا خیال
آہ! لیکن کون جانے، کون سمجھے جی کا حال
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

﴿۴﴾

پھر وہ ٹوٹا اک ستارہ، پھر وہ چھوٹی پھلجھڑی
جانے کس کی گود میں آئی یہ موتی کی لڑی
ہوک سی سینے میں اُٹھّی، چوٹ سی دل پر پڑی
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

﴿۵﴾

رات ہنس ہنس کر یہ کہتی ہے کہ میخانے میں چل
پھر کسی شہناز لالہ رُخ کے کاشانے میں چل
یہ نہیں ممکن تو پھر اے دوست ویرانے میں چل

اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

﴿۶﴾

ہر طرف بکھری ہوئی رنگینیاں، رعنائیاں
ہر قدم پہ عشرتیں لیتی ہوئی انگڑائیاں
بڑھ رہی ہیں گود پھیلائے ہوئے رُسوائیاں

اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

﴿۷﴾

راستے میں رُک کے دَم لے لوں مری عادت نہیں
لوٹ کر واپس چلا جاؤں مری فطرت نہیں
اور کوئی ہم نَوا مل جائے یہ قسمت نہیں

اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

﴿۸﴾

منتظر ہے ایک طوفانِ بَلا میرے لئے
اب بھی جانے کتنے دروازے ہیں وَا میرے لئے
پر مصیبت ہے مرا عہدِ وفا میرے لئے

اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

﴿۹﴾

جی میں آتا ہے کہ اب عہدِ وفا بھی توڑ دُوں
ان کو پا سکتا ہوں میں یہ آسرا بھی توڑ دُوں
ہاں مناسب ہے یہ زنجیر ہوا بھی توڑ دُوں

اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

﴿۱۰﴾

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے مُلّا کا عمامہ، جیسے بنیے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی، جیسے بیوہ کا شباب

اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

﴿۱۱﴾

دل میں اک شعلہ بھڑک اُٹھّا ہے آخر کیا کروں
میرا پیمانہ چھلک اُٹھّا ہے آخر کیا کروں
زخم سینے کا مہک اُٹھّا ہے آخر کیا کروں

اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

﴿۱۲﴾

جی میں آتا ہے یہ مردہ چاند تارے نوچ لوں
اِس کنارے نوچ لوں اور اُس کنارے نوچ لوں
ایک دو کا ذِکر کیا، سارے کے سارے نوچ لوں

اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

﴿۱۳﴾

مفلسی اور یہ مظاہر ہیں نظر کے سامنے
سیکڑوں سلطان جابر ہیں نظر کے سامنے
سیکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے

اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

﴿۱۴﴾

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اس کے دمکتا ہے جو پتّھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں

اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

﴿۱۵﴾

بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونک دُوں
اس کا گلشن پھونک دوں اُس کا شبستاں پھونک دُوں
تختِ سلطاں کیا میں سارا قصرِ سلطاں پھونک دُوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

09.06 اسرارالحق مجاز کی نظم ''آوارہ'' تشریح

''آوارہ'' اردو شاعری کی شاہ کار نظم ہے۔ مجاز نے پہلی بار لفظ ''آوارہ'' کو اس کے عام مفہوم سے ہٹ کر ایک سرکش اور باغی کے معنوں میں استعمال کیا۔ یہ نظم انقلاب اور رومان کا حسین امتزاج ہے اور اپنے دَور کے ہر اس نوجوان کے ذہن کی آئینہ دار ہے جو نظامِ پارینہ کی ستم کاریوں کو مٹا کر نئے نظام کے خواب دیکھ رہا ہے۔

(۱/تا۴/بند)

اس نظم میں شاعر کی ذہنی کش مکش اور نفسیات کی بھرپور عکّاسی ملتی ہے۔ غمِ جاناں اور غمِ دَوراں میں ٹھوکر کھایا ہوا نوجوان شاعر کس درجہ ذہنی کرب میں مبتلا ہے، یہ نوجوان (شاعر) جب اپنے محسوسات کو دنیا میں اتنے سارے کرب، اتنی ناکامیوں و محرومیوں کے ساتھ شہر کی جیتی جاگتی سڑکوں پر عالمِ وحشت میں نکل پڑتا ہے تو اس کی نظر متضاد اور مختلف تصویریں دیکھتی ہے۔ وہ حالات کے ہاتھوں تنگ ہوتا ہے، نظامِ کہنہ اور آئینِ فرسودہ اس کی فطری آزادی کو سلب کر کے اس کی اَنا کو تازیانے لگاتے ہیں تو اپنا خود کا شہر اور اس کی شاہراہیں جن پر دَر بدر آوارہ پھرنے پر اپنے کو مجبور پاتا ہے، غیر کی بستی محسوس ہونے لگتی ہے۔ تمام خوش آئند خوابوں کے تانے بانے ٹوٹنے لگتے ہیں۔ اس کی سینہ فگاری جھلملاتے قمقموں کے درمیان زنجیرِ دِکھتی ہے، اس کے قلب و جگر کے زخم اندھیری رات میں اسے دن کی روشنی سے لطف اندوز ہونے نہیں دیتے۔ آسمان پر تاروں کا بچھا ہوا جال اور ان کی رُوپہلی چھاؤں اسے صوفی کا تصوّر یا عاشق کا خیال معلوم ہوتی ہیں۔ اس منظر کو دیکھ کر اسے یہ خیال آتا ہے کہ اس کے دل کا حال کوئی نہیں جانتا اور دل میں غم کے جو دریا موجزن ہیں ان پر کسی کی نظر نہیں پڑتی۔ وہ مضطرب ہو کے کہہ اُٹھتا ہے:

اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

(۵/تا۸/بند)

رات رنگین ہے اور اس کی رنگینی ہنس ہنس کر اسے میخانے کی طرف لے جانے کی ترغیب دیتی ہے لیکن نوجوان (شاعر) کی اُمنگیں حرماں نصیبی اور غم و اندوہ کا شکار ہیں۔ تمام عیش و عشرت سے محروم ہے اور اس کا احساس اسے چوٹ پر چوٹ پہنچاتا ہے۔ اب اس حرماں نصیب نوجوان کے سامنے چارہ کار ہی کیا رہ جاتا ہے؟ سکون کی تلاش میں اس کا مضطرب دل کبھی میخانہ، کبھی کاشانۂ شہناز کا سہارا ڈھونڈنے پر اور کبھی گھبرا کر مجنوں کی پیروی کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ اس نوجوان کو عشق کی ذاتی ناکامی و نامرادی کا بھی سامنا ہے۔ اس کی وجہ اہلِ ثروت اور ان کا نظام ہے۔ دولت کی دیوار حائل ہونے کی وجہ سے وہ اپنے کو عشق میں ناکام پاتا ہے۔ رسوائیاں اسے سراسیمہ کیے ہوئے ہیں لیکن وہ عشق کی منزل کا ایسا راہی ہے جو راستے میں رُک کر دَم لینے کا عادی نہیں۔ اسے اپنی تنہائی کا بھی شدید احساس ہے مگر پاسِ وفا اسے کسی اور دَر کی طرف جانے نہیں دیتا۔

(۹/تا۱۲/بند)

یہ نوجوان عاشق ایک مرتبہ جھنجھلا کر عہدِ وفا کو توڑ دینے پر بھی آمادہ ہو جاتا ہے لیکن معاً اسے اپنے عہد کے ان حالات کا خیال آتا ہے جس کی وجہ سے اس کی یہ حالت ہوئی ہے۔ اس کا یہ غم اجتماعی ہو جاتا ہے۔ نظم کے بندوں میں انفرادیت بھی ہے، شدّتِ احساس بھی اور یہاں کی نوجوان نسل کی ترجمانی بھی۔ مجاز نے ایک نسل کے ترجمان کی حیثیت سے محسوس کیا ہے۔ چاند کو کریہہ صورت کہنا، اس کو مُلّا کا عمامہ، بنیے کی کتاب، مفلس کی جوانی اور بیوہ کا شباب کہنا، بذاتِ خود استحصال شدہ لوگوں اور مظلوموں کی علامتیں ہیں اور ادبی روایات سے بغاوتیں ہیں، اب تک یہ مسرور ہونے کی شے سمجھی جاتی تھیں۔ انسان کی عام زَبوں حالی کا احساس کر کے شاعر کے سینے کے زخم مہک اُٹھتے ہیں۔ اس کی جھنجھلاہٹ شدید ہو جاتی ہے۔ عزائم خطرناک نظر آتے ہیں۔ چاند تاروں میں اسے کوئی کشش نظر نہیں آتی۔ وہ اُنہیں مردہ قرار دیتا ہے اور نوچ کر پھینک دینا چاہتا ہے۔

(۱۳/تا۱۵/بند)

شاعر ان سامانِ عیش و عشرت کو نوچ دینے کی بات سوچ رہا تھا کہ اس کی ذہنی کش مکش کے رَدِّعمل میں اس کے اندر جاں فشانی اور جاں بازی کا جذبہ عود کر آتا ہے۔ اس میں ایک احساسِ برتری جاگنے لگتا ہے اور اس میں ان تمام سماجی حالات کو جو اس کی راہ کی رُکاوٹ تھے ان کو بدل ڈالنے کی خواہش اور سب کچھ کر گزرنے کا عزم پیدا ہو جاتا ہے۔ قوم کی مفلسی اور ناداری کے مناظر اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتے ہیں۔ اور اس عہد کے ذمّہ داروں، جابر حکمرانوں کے خلاف اس کا جوشِ انتقام انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔

سیکڑوں چنگیز و نادر اس کی نظروں کے سامنے آجاتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں کے خنجر اور ان کے تاج کے بیش بہا پتّھر توڑ دینے کی خواہش اس کے دل میں انگڑائیاں لیتی ہے۔ اس کا پیمانۂ صبر لبریز ہو جاتا ہے اور وہ اندر سبھا کے سارے ساز و سامان قصرِ سلطان کی ہر چیز کو پھونک دینا چاہتا ہے۔

نظم کے ان بندوں میں ناشاد و ناکارہ پھرنے، آوارہ گردی میں مصروف رہنے، مردہ چاند تاروں کو نوچنے، چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر لے کر توڑنے، گلشن، شبستان، تختِ سلطان اور قصرِ سلطان کو پھونک دینے کا جو تصوّر ہے وہ شاعر کے انقلابی میلان کو ظاہر و عیاں کرتا ہے۔

یہ نظم ایک انقلابی نظم ہے۔ اس میں ایک ایسے نوجون کی ذہنی کیفیت کی عکّاسی کی گئی ہے جو حالات کو سنوارنے ماحول کو نکھارنے اور فضا کو سازگار بنانے لے لئے زندگی کو بدلنا چاہتا ہے۔ یہ تبدیلی انقلاب کے بغیر ممکن نہیں۔ اس نظم میں اسرار الحق مجاز لکھنوی نے اسی انقلاب کا خواب دیکھا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۹﴾ ''آوارہ'' کیسی نظم ہے؟

﴿۱۰﴾ وہ کیسا ماحول تھا جس سے متاثّر ہو کر مجاز نے نظم ''آوارہ'' تحریر کی؟

09.07 اسرارالحق مجاؔز کی نظم ''آوارہ'' تجزیہ

''آوارہ'' اس سرپھرے باغی نوجوان کی ترجمان ہے جو مفلسی و بے روزگاری سے تنگ آ کر اپنے ہی شہر کی سڑکوں پر آوارہ وسرگرداں پھرنے پر مجبور ہے۔ اس کے پس منظر میں مجاؔز کے دَور کے معاشی وسماجی حالات ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام کا شکار ہو کر مجاؔز خود بھی بے کار اور آوارہ پھرتے رہے۔ ایک سرکش باغی کی ساری سرکشی و آوارگی پورے شباب پر پہنچ جاتی ہے اور اس کے ذہن میں پورے نظام کو درہم برہم کرنے کا خیال موجزن ہوتا ہے، جس میں آرزوؤں اور خوشیوں کا خون ہوا ہے، جس میں مفلسی و بے کاری، بے روزگاری اور ناکامی اس کا نصیب بن گئی۔ یہ نظم صرف مجاؔز کی ہی نہیں بلکہ اس دَور کے تمام باغی، حسّاس اور مضطرب نوجوانوں کے تصوّرات وجذبات کی آئینہ دار ہے۔

شاعر ان حالات میں جھنجھلایا ہوا جیتی جاگتی سڑکوں پر آوارہ گھومتا ہے اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا ہے وہ اس نظام کو جس کی بنیاد ظلم وستم پر ہے کس طرح بدل ڈالے۔ اس عالمِ وحشت میں وہ اپنے دل کو بہلانے کی کوشش کرتا ہے لیکن دل میں کچلی ہوئی خواہشات کا شعلہ بھڑک رہا ہے۔ صبر کا پیمانہ چھلکنے کو ہے، وہ زخم جو بظاہر دَب گئے تھے مہک اُٹھتے ہیں اور شاعر کا جذبۂ انتقام جاگ اُٹھتا ہے۔ اس کی اجتماعی سوچ اُبھرنے لگتی ہے۔ مفلسی کے مارے بھوکے، ننگے عوام اس کی نظروں کے سامنے آتے ہیں اور چنگیز کے مظالم اسے یاد آتے ہیں جس کے ردِّعمل میں وہ اپنی ساری قوّت وہمّت مجتمع کر کے چنگیز کے ہاتھوں کا خنجر توڑنے اور اندر سبھا کے ساز وسامان پھونک دینے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ جن کی گردنوں پر کروڑوں غریب انسانوں کا خونِ ناحق ہے۔ وہ ظالموں کا گلشن اور ان کے قصر یعنی محل کو نیست ونابود کر دینا چاہتا ہے۔ اس کے دل میں جذبات کا ایک طوفان ہے لیکن خیالات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے وسائل نہیں اس لئے وہ گھبرا کر کہتا ہے:

اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

09.08 خلاصہ

اسرارالحق مجاؔز ۱۹۱۱ء میں بارہ بنکی کے قصبہ ردولی میں پیدا ہوئے۔ ادبی اور علمی ماحول میں پرورش پائی۔ مجاؔز نے علی گڑھ یونیورسٹی سے بی.اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد آل انڈیا ریڈیو دہلی اور ہارڈنگ لائبریری میں ملازم رہے۔ بعد میں لکھنؤ چلے گئے اور حلقۂ ادب کے سرگرم رکن بنے۔ ادارہ نیا ادب سے بھی منسلک رہے۔ مجاز ایک حسّاس اور حقیقت پسند انسان اور شاعر تھے۔ متوسط طبقے کی بے روزگاری ابتری اور بدلتے ہوئے سماجی واخلاقی معیار سے وہ متفکر تھے۔ ان کی شاعری میں سماج کی ابتری اور فرسودہ نظام سے بغاوت کا پیغام ملتا ہے۔

''آوارہ'' اس بے کار نوجوان کی تصویر ہے جو اپنی نہ جانے کتنی آرزوئیں، اُمنگیں، حسرتیں اور تمنّائیں لے کر اپنی ہی بستی میں تنہا مارا مارا پھر رہا ہے مگر جینے اور کچھ کر گزرنے کا حوصلہ پھر بھی اس کے ساتھ ہے۔ مختلف خیالات کی لہریں اُس کے دل میں اُٹھتی ہیں۔ اس کی عملی شکل اس کے یہاں موجود نہیں ہے کیوں کہ حالات اجازت ہی نہیں دیتے۔ نظم میں اس نوجوان کی صحیح تصویر موجود ہے۔

09.09 فرہنگ

آئین	: قاعدہ، قانون، ضابطہ، رواج	فرسودہ	: گھسا ہوا، پرانا
اندوہ	: رنج، غم، فکر وتردّد	قصرِ سلطان	: بادشاہ کا محل، ایوان
حرماں نصیبی	: بدقسمتی، قسمت سے محروم ہونا	کاشانہ	: چھوٹا گھر

ستم گاری	: تشدّد، زیادتی، ظلم	کریہہ صورت	: قابلِ نفرت، بدصورت
سدراہ	: راستے کی رکاوٹ	متضاد	: برعکس، خلاف
سراسیمہ	: حیران، پریشان	نظام کہنہ	: پرانا طریقہ، پرانی روش
شبستان	: حرم سرا	نیست ونابود	: بالکل فنا کر دینا
عزائم	: عزم کی جمع، ارادہ		

09.10 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درجِ ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : اسرارالحق مجازؔ رُدَولوی کے حالاتِ زندگی لکھئے؟

سوال نمبر۲ : اسرارالحق مجازؔ رُدَولوی کے رومانی انداز کی ترجمانی کیجیے؟

سوال نمبر۳ : اسرارالحق مجازؔ رُدَولوی کی شاعری کا مختصر تعارف پیش کیجیے۔

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : اسرارالحق مجازؔ رُدَولوی کی شاعرانہ خصوصیات پر روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر۲ : اسرارالحق مجازؔ رُدَولوی کی نظم ''آوارہ'' کا مجموعی تاثر بیان کیجیے۔

سوال نمبر۳ : اسرارالحق مجازؔ رُدَولوی کی نظم گوئی پر ایک مضمون قلم بند کیجیے۔

09.11 حوالہ جاتی کتب

۱۔ بیسویں صدی کی اردو شاعری	از	اوصاف احمد (انتخاب وترتیب)
۲۔ جدید شاعری	از	ڈاکٹر عبادت بریلوی
۳۔ مجازؔ، حیات اور شاعری	از	منظر سلیم
۴۔ مجازؔ، شخص اور شاعر	از	ڈاکٹر معیز عثمانی

09.12 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ اسرارالحق

﴿۲﴾ ۱۹/اکتوبر ۱۹۱۱ء کو ضلع بارہ بنکی (یوپی) کے قصبہ ردولی میں پیدا ہوئے۔

﴿۳﴾ فانیؔ بدایونی، معین احسن جذبیؔ، حسرتؔ موہانی، میکشؔ اکبرآبادی، اصغرؔ گونڈوی

﴿۴﴾ مجازؔ کی

﴿۵﴾ آگرہ، علی گڑھ، دہلی، لکھنؤ

﴿۶﴾ مجاز بنیادی طور پر ایک رومانی شاعر ہیں۔ اُنہوں نے اردو شاعری کو انقلاب کا صحت مند موڑ دیا۔
ان کے انقلابی رنگ میں جمالیاتی شعور بھی موجود ہے۔

﴿۷﴾ مجاز عورتوں کو اسی دنیا کی عورت کی طرح پیش کرتے تھے اور اُنہیں مردوں کے دوش بدوش دعوتِ عمل دیتے تھے۔

﴿۸﴾ ہاں یہ درست ہے

﴿۹﴾ ''آوارہ'' ایک انقلابی نظم ہے جس میں ایک حسّاس نوجوان کی ذہنی کیفیت کی عکّاسی کی گئی ہے۔

﴿۱۰﴾ ظلم و زیادتی، ناانصافی و حق تلفی کا دَور تھا۔ چاروں طرف مفلسی اور بے روزگاری تھی۔
ایسا نظام قائم تھا جس کی بنیاد ظلم و ستم پر تھی۔

بلاک نمبر 04

اکائی 10	علی سردار جعفری (ہاتھوں کا ترانہ)	پروفیسر علی احمد فاطمی
اکائی 11	اختر الایمان (ایک لڑکا)	ڈاکٹر محمد آصف مظہری
اکائی 12	اطہر حُسین کیفی اعظمی (مکان)	پروفیسر علی احمد فاطمی
اکائی 13	عبدالحئی ساحر لدھیانوی (خون پھر خون ہے)	ڈاکٹر نغمہ پروین

اکائی 10 : علی سردار جعفری (ہاتھوں کا ترانہ)

ساخت

10.01 : اغراض ومقاصد

10.02 : تمہید

10.03 : علی سردار جعفری کے حالاتِ زندگی

10.04 : علی سردار جعفری کی نظم نگاری

10.05 : علی سردار جعفری کی نظم ''ہاتھوں کا ترانہ'' متن

10.06 : علی سردار جعفری کی نظم ''ہاتھوں کا ترانہ'' تشریح

10.07 : علی سردار جعفری کی نظم ''ہاتھوں کا ترانہ'' تجزیہ

10.08 : خلاصہ

10.09 : فرہنگ

10.10 : نمونہ امتحانی سوالات

10.11 : حوالہ جاتی کتب

10.12 : اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

10.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ علی سردار جعفری کی نظم ''ہاتھوں کا ترانہ'' اوران کی شاعری کی خصوصیات مزید اردو نظم کے بارے میں مطالعہ کریں گے۔ نظم قدیم صنفِ سخن ہے۔ یہ کسی نہ کسی شکل میں ادب میں ہمیشہ موجود رہی ہے ترقی پسند تحریک نے نظم کی ترویج واشاعت میں ایک اہم رول ادا کیا اور نظم کے دامن کو مختلف النّوع مضامین سے مالا مال کیا۔ زیرِ نظر اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اردو کی نظمیہ شاعری کے موضوعات سے واقف ہوجائیں گے۔ جس سے آپ کو عام زندگی میں بھی نظم کے موضوعات اور اظہار کی کیفیات کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

10.02 تمہید

نظم اپنے ابتدائی دَور سے خارجی وداخلی دونوں ہی قسم کے تاثّرات کو پیش کرنے میں کامیاب رہی ہے۔ وقت اور حالات کے بدلاؤ کے ساتھ نظم کا دامن وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا اور اس میں مختلف قسم کے موضوعات جگہ پانے لگے جس میں فکر وفلسفہ، مناظرِ قدرت وغیرہ اہم ہیں۔ نظیر اکبر آبادی نے نظم کے موضوعات کو اور وسعت دی اور اس میں میلے ٹھیلے، تاریخ کی اہم شخصیات اور تاریخی مقامات جیسے موضوعات کو سمو دیا۔ زندگی کی بے اعتباری پر بھی اُنہوں نے نظمیں لکھیں۔

۱۸۵۷ء کے بعد جب نظم کا سفر آگے بڑھتا ہے تو اس کو حالؔی، اکبؔر کے بعد اقبالؔ جیسا چاہیے اور فلسفی ملتا ہے جس نے اردو نظم کی سرپرستی کی اور پھر اردو نظم کو ترقّی پسند تحریک کی سرپرستی ملتی ہے اور اس کا دامن مزید وسعتوں سے ہم کنار ہوتا ہے اور اب اس میں سماجی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی خیالات بھی جگہ پانے لگتے ہیں۔ سردار جعفری ترقّی پسند شاعر تھے۔ ترقّی پسندی ان کے رگ و پے میں سمائی ہوئی تھی۔ اس لئے سردار جعفری کے یہاں بھی سارے مضامین جگہ پاتے ہیں۔ نظم ''ہاتھوں کا ترانہ'' دراصل ان مزدوروں اور فن کاروں کا قصیدہ ہے جن کی محنت پر تمدّن کا چراغ جلتا ہے۔ اس نظم کے ذریعے اُنہوں نے مزدوروں اور محنت کش طبقہ کی عظمت کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

10.03 علی سردار جعفری کے حالاتِ زندگی

سردار جعفری کا شمار بیسویں صدی کے اہم شاعروں میں ہوتا ہے۔ سردار جعفری کی پیدائش یوپی کے ایک قصبہ بلرام پور میں ۲۹ رنومبر ۱۹۱۳ء کو ایک زمین دار گھرانے میں ہوئی تھی۔ سردار جعفری کا خاندان کئی پشت پہلے بھرت پور میں آباد تھا لیکن حصولِ تعلیم اور ملازمت کے سلسلے میں یہ لوگ رفتہ رفتہ آگرہ بلرام پور سے آکر بس گئے۔ والد کا نام سیّد جعفر تھا، جن کا تعلّق ایک زمین دار گھرانے سے تھا۔ وہ ریاست بلرام پور کے اہم عہدوں پر فائز رہے تھے۔ والدہ کا نام زاہدہ خاتون جعفری تھا۔ سردار جعفری نے آنکھ کھولتے ہی اپنے اردگرد ایسے ماحول کو دیکھا جو اس عہد میں ایسے گھرانوں کی وجہ سے ہوتا تھا۔ شان وشوکت، کرّ وفر اور جاہ وجلال لیکن ایک شیعہ گھرانے کی وجہ سے علم اور تہذیب کے معاملے میں اس وقت کے دیگر زمین دار گھرانوں سے تھوڑا مختلف تھے۔ سردار جعفری اس وقت کے حالات پر ''لکھنؤ کی پانچ راتیں'' میں ان الفاظ میں روشنی ڈالتے ہیں:

> ''خاندان میں بڑا اطمینان تھا۔ بلرام پور سے باہر کی دنیا ہمارے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ یہیں بچّے پیدا ہوتے تھے، جوان ہوتے تھے۔ بلرام پور کے بعد علی گڑھ کی تعلیم حاصل کرتے تھے اور پھر شادی ہو جاتی تھی اور ریاست میں ملازمت مل جاتی تھی۔ دن ہنسی خوشی گزر جاتا تھا اور رات کو سب بھائی بہن بستروں پر لیٹ جاتے تھے۔ کوئی ایک بہن شرلاک ہومز کی کہانیاں، راشد الخیری کے ناول یا عظیم بیگ چغتائی کی کوئی کتاب پڑھ کر سناتی۔ اس سے تھک جانے کے بعد جنّاتوں کے قصّے شروع ہو جاتے جو انتہائی دل چسپ ہونے کے بعد بھی دل میں دہشت پیدا کر دیتے تھے۔''

معاشی اعتبار سے سردار جعفری کا بچپن بہت آرام وسکون اور بے فکری میں گزرا۔

سردار کی پرورش مذہبی ماحول میں ہوئی۔ گھر میں محرم ومجلس کا ماحول تھا اور انیسؔ کے مرثیے فضا میں گونجا کرتے تھے۔ بقول جعفری:

''کلمہ اور تکبیر کے بعد میرے کانوں نے پہلی آواز انیسؔ کے مرثیوں کی سنی۔ چوں کہ والدین کا ارادہ انہیں مولوی بنانے کا تھا اس لئے ان کا داخلہ سلطان المدارس لکھنؤ میں کرا دیا گیا لیکن ۱۹۲۵ء میں سردار نے سلطان المدارس چھوڑ دیا اور بلرام پور ہائی اسکول میں انگریزی کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ محض سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں ۱۹۳۰ء میں وہ بلرام پور کے مخصوص ومحدود ماحول سے نکل کر لکھنؤ پہنچے۔ اسی درمیان اُنہوں نے نوکری کا امتحان دیا، پاس ہوئے اور جہاز رانی (ممبئی) میں ان کا تقرّر ہو گیا لیکن والدین نے اُنہیں واپس بلا لیا۔ ۱۹۳۳ء میں علی گڑھ یونیورسٹی میں سردار جعفری کا داخلہ بی.اے سال اوّل میں ہوا لیکن کالج کی سیاست میں سرگرمِ عمل ہونے اور ۱۹۳۶ء میں طلبا کے ایک ایجی ٹیشن میں نمایاں حصّہ لینے کی وجہ سے اُنہیں یونیورسٹی سے نکال دیا گیا۔

اس کے بعد سردار نے اینگلو عربک کالج دلی میں داخلہ لے لیا اور وہیں سے بے.اے کرنے کے بعد لکھنؤ چلے گئے۔ اسی زمانے میں ان کا افسانوی مجموعہ ''منزل'' ۱۹۳۸ء میں لکھنؤ سے شائع ہوا۔

لکھنؤ میں قیام کے دَوران ۱۹۳۹ء میں لکھنؤ یونورسٹی میں ایم.اے میں داخلہ لیا اور پہلا سال ہی پاس کر سکے۔ ۱۹۳۷ء میں جب آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی بنیاد پڑی تو سردار جعفری ابتدا سے ہی اس میں شریک تھے۔ بعد میں وہ لکھنؤ یونیورسٹی اسٹوڈینٹ یونین کے سیکریٹری ہو گئے تھے۔ طالب علموں کی سرگرمیوں میں حصّہ لیتے تھے اور طلبا کے لیڈر کی حیثیت سے ان کی خاصی شہرت ہو چکی تھی۔ ۱۹۳۶ء ترقّی پسند تحریک کی بنیاد پڑ چکی تھی اور لکھنؤ میں اس کی شاخیں قائم ہو چکی تھیں۔ سردار اس تحریک میں ایک ممتاز کارکن کی حیثیت سے اُبھرے۔ شاعری کے ساتھ ساتھ ان کے خطابات کے جوہر بھی کانفرنسوں اور جلسوں میں دیکھے جاتے تھے۔

۱۹۴۰ء میں جنگ مخالف پروپیگنڈہ کرنے پر حکومت کے عتاب کا نشانہ بننا پڑا۔ لکھنؤ اور بنارس کی جیلوں میں رہنا پڑا۔ رہائی کے بعد بھی گھر میں نظر بند رکھا گیا۔ ادبی و سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے ایم.اے بھی مکمّل نہ کر سکے اور ۱۹۴۲ء میں کمیونسٹ پارٹی کے کل وقتی کارکن کی حیثیت سے ممبئی چلے گئے۔

سردار جعفری ایک پرکشش شخصیت کے مالک تھے۔ سلطانہ منہاج، جن کی شادی ہو چکی تھی، سردار جعفری کی جاذبیت اور پرکشش شخصیت پر کچھ اس طرح فریفتہ ہوئیں کہ اپنے پہلے شوہر سے علاحدگی اختیار کر لی اور بعد میں ۳۰ رجنوری ۱۹۴۸ء کو سردار جعفری کی شریکِ سفر بن کر ان کے ساتھ ممبئی چلی گئیں اور سردار کی آخری سانس تک ان کی ہم سفر اور شریکِ سفر رہیں۔ سردار جعفری نے اپنی مشہور نظم ''میرا سفر'' میں ان کو یوں خراج تحسین پیش کیا ہے:

''ہر عاشق ہے سردار یہاں
ہر معشوقہ سلطانہ ہے''

سردار جعفری کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۵ رسال کی عمر میں ہوا جب اُنہوں نے اپنا پہلا مرثیہ لکھا۔

آتا ہے کون شمعِ امامت لیے ہوئے
اپنی جلو میں فوجِ صداقت لیے ہوئے

۱۷ رسال کی عمر میں افسانہ نگاری شروع کی اور ڈرامے بھی لکھے۔ سب سے پہلا ڈرامہ ''دو دیوانے'' رشید احمد صدیقی کے رسالے ''سہیل'' میں شائع ہوا۔ مرثیہ کے ساتھ ساتھ غزلیں بھی کہتے تھے اور حزیں تخلّص اختیار کیا۔ اردو ادب میں سردار جعفری بیک وقت کئی حیثیتوں سے اپنی پہچان بنانے میں کامیاب ہوئے۔ ان میں ایک حیثیت شاعری تو ہے ہی، اس کے ساتھ وہ افسانہ نگار، ڈرامہ نویس، نقّاد، مترجم، صحافی اور مقرر بھی بہت اچّھے تھے۔ اُنہوں نے سرکاری ملازمت نہیں کی۔ سردار جعفری بیک وقت اردو، فارسی اور انگریزی زبانوں پر قدرت رکھتے تھے۔ ۹ رشعری مجموعوں کے علاوہ افسانوں کا مجموعہ ''منزل''، ڈرامہ ''یہ کس کا خون ہے''، ترقّی پسند ادب اور اقبال شناسی پر تنقیدی کتب کے علاوہ سوانحی تنقید اور نثر کی کتابوں کے علاوہ بہت سی دوسری تخلیقات مثلاً ترجمے وغیرہ شائع ہو چکی ہیں۔

سردار جعفری رسالہ ''نیا ادب'' اور اخبار ''پرچم'' کے ایڈیٹر بھی رہے۔ کمیونسٹ پارٹی کے اخبار ''قومی جنگ'' اور ''نیا زمانہ'' کے ادارتی بورڈ کے رکنِ اعلیٰ تھے۔ ترقّی پسند ادب کا ترجمان رسالہ ''گفتگو'' شایع کیا۔ ہندوستانی بک ٹرسٹ کے مدیر اور کتاب نما کے مہمان مدیر رہے۔ فلمی اور ٹی.وی کی دنیا بھی ان سے اچھوتی نہ تھی۔ غیر ممالک کے سفر بھی کیے۔

مجموعی خدمات کے سلسلے میں ملک کے اہم ترین اور باوقار اعزاز ''گیان پیٹھ'' سے سرفراز کیے گئے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے اعزازات سے نوازے گئے۔ نہ صرف ہندوستان بلکہ پاکستان سے بھی اُنہیں ۱۹۷۸ء میں گولڈ میڈل دیا گیا۔ ۱۹۸۶ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے اُنہیں ڈی.لٹ کی اعزازی ڈگری دی۔ علی گڑھ اور جمّوں یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر بھی رہے۔ ان کی نظموں کا کئی غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

عرصۂ دراز تک علیل رہنے کے بعد یکم اگست ۲۰۰۰ء کو صبح ۸ بجے برین ٹیومر کے سبب ممبئی اسپتال میں ان کی روح عالمِ فانی سے عالمِ باقی کی طرف پرواز کر گئی۔ جو ہو قبرستان ممبئی میں اُنہیں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

سردار جعفری کی شخصیت کی تعمیر میں بلاشبہ ان کے گھر کے مذہبی ماحول اور حضرت حسینؑ کی دلیرانہ وحق پرستانہ کردار نے اہم رول ادا کیا اور ان کے اندر یہ احساس جگا دیا کہ حق وصداقت لے لئے جان کی بازی لگا دینا انسانیت کی معراج ہے۔ انیسؔ، اقبالؔ، میرؔ، غالبؔ، گاندھی، نہرو، لینن، گوئٹے، ورڈز ورتھ کو پڑھ کر اور پھر کارل مارکس کے منشور کے مطالعے نے ان کے سامنے جہانِ معانی کے دروازے کھول دیے۔ علی گڑھ کی علمی وفکری وسیاسی اور انقلابی فضا نے بھی سردار جعفری کی شاعرانہ فکر ونظر پر گہرے اثرات مرتّب کیے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۱﴾ آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی بنیاد کب پڑی؟

﴿۲﴾ سردار جعفری کو جیل کب جانا پڑا؟

﴿۳﴾ سردار جعفری کی ادبی زندگی کا آغاز کب ہوا؟

10.04 علی سردار جعفری کی نظم نگاری

یہ سچ ہے کہ سردار جعفری کو پہلا صوبائی انعام ۱۹۳۸ء میں ان کے کسی نظم کے مجموعے پر نہیں بلکہ افسانوی مجموعہ ''منزل'' پر ملا تھا لیکن از اوّل تا آخر وہ ایک شاعر تھے۔ ترقّی پسندی سے وابستگی نے ان کے ذہن کی گرہیں کھول دی تھیں اور فن کو جلا بخشی تھی۔ چوں کہ ان کا تعلّق سرمایہ دارانہ طبقے سے تھا اس لئے اُنہوں نے اس ظلم وجبر کا مشاہدہ کیا جس کا اس عہد میں چلن تھا، جسے غریبوں، محنت کشوں اور مظلوموں کی تقدیر اور مشیتِ ایزدی سمجھا جاتا تھا۔ اُنہوں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا تھا اور تلخ حقائق کا مطالعہ ومشاہدہ کیا تھا۔ ان پر وہ تمام راز کھلتے چلے گئے جن کی بنا پر معاشرے میں ظالم ومظلوم، حاکمیت اور جبر واستبداد جیسے واقعات رونما ہوتے ہیں۔ چوں کہ سردار جعفری امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بے مثال قربانی سے بے حد متاثر تھے اس لئے اُنہوں نے جبر واستبداد، ظلم اور ناانصافی کے خلاف بغاوت کا علم بلند کر دیا بقول فیض:

اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے وہ گزری
تنہا پسِ زنداں کبھی رسوا سرِ بازار

سردار جعفری عتاب کا نشانہ بھی بنے اور نتیجتاً قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔انگریز سپاہیوں کے ڈنڈے کھائے، گالیاں سنیں۔چوں کہ ان کا دل پختہ اور دماغ روشن تھا اس لئے وہ ان سب باتوں سے بہت زیادہ متاثر نہ ہوئے اور اپنی منزل کی طرف ثابت قدمی سے چلتے رہے۔شاعری کی مروّجہ روایات سے انحراف کرتے ہوئے شاعری میں زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کی ترجمانی کی۔نظم میں تو ہر قسم کے خیالات باندھے جاتے ہیں لیکن غزل کے لئے ایسا کہا جاتا ہے کہ وہ صرف گل و بلبل کے افسانے ،محبوب کی کج ادائیوں اور لب و رُخسار کی باتوں تک محدود ہے۔سردار نے نظم و غزل میں یکساں طور پر زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کی ترجمانی کی۔غزل کے مروّجہ طلسم کو توڑ کر اس کے دامن کو محبّت کی حقیقی شکل، غربت و افلاس، بھوک، ظلم، نا انصافی کے خلاف بغاوت، آزادی کی تمنّا، غلامی کا کرب اور اس کا خواب جیسے موضوعات سے مالا مال کیا:

نگاہیں منتظر ہیں ایک خورشیدِ تمنّا کی
ابھی تک جتنے مہر و ماہ آئے نا تمام آئے

سردار کا پہلا مجموعہ ''پرواز'' ۱۹۴۳ء میں منظرِ عام پر آیا۔اس میں شامل نظمیں سماج، بغاوت، انگڑائی، مزدور لڑکیاں، اشتراکی، زمانہ، تاریخ، آثارِ سحر، ارتقا و انقلاب، جنگ اور انقلاب وغیرہ ان کے انقلابی تیور کی نشان دہی کرتی ہیں۔ایسا نہیں ہے کہ اس میں رومانی رنگ کی نظمیں نہیں ہیں۔''جوانی'' ان کی رومانی نظموں میں سے ایک ہے لیکن اس میں بھی رومانیت کم اور انقلابیت زیادہ ہے۔

حقیقت سے مِری کیوں بے خبر دنیائے فانی ہے
بغاوت میرا مذہب ، میرا مسلک نوجوانی ہے

نظم بغاوت میں صرف ایک شعر ان کے جذبات و احساسات اور افکار کے اندازے لے لئے کافی ہے۔

بغاوت میرا مذہب ہے ، بغاوت دیوتا میرا
بغاوت میرا پیغمبر ، بغاوت ہے خدا میرا

چوں کہ اس مجموعے میں ۱۹۴۶ء سے قبل کی شاعری ہے۔لہٰذا یہ فطری ہے کہ اس عہد کی شاعری میں آزادی، انقلاب اور غلامی سے نجات کا ولولہ اور دَور دَورہ ہے لیکن شاعری میں صرف خطابت اور کھوکھلا پن نہیں ہے بلکہ اس میں بدلے ہوئے عہد اور سردار کے مزاج و فکر کی بھی نمائندگی ہوتی ہیں۔نئے معاشرے کی تلاش، نئے خواب دیکھنے کی خواہش پھر اس کی تعبیر کی تلاش وغیرہ۔ایسا صرف ملکی سطح پر ہی نہیں بلکہ عالمی سطح پر بھی ہو رہا تھا۔اس لئے اس میں عالمیت کی گونج سنائی دیتی ہے۔یہ رنگ صرف وقتی آزادی کا نہیں بلکہ نئے سماج کے نئے تصوّرات کا رنگ ہے جو بہر حال قدیم رنگ سے مختلف ہے۔

اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شاعری کے ابتدائی دور سے ہی ان کے کلام میں رومان و انقلاب کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے۔رومان و انقلاب کی یہی ملی جلی کیفیت ان کے اس عہد کی شاعری کا خلاصہ ہے۔

سردار جعفری کی شاعری کی ایک اہم خصوصیت عورتوں کے حوالے سے ان کا دردمندانہ اظہار ہے۔یہ اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ جوانی کی عمر میں بھی جعفری ملک و معاشرے اور عام انسانوں کے دکھ درد سے کس قدر گہری واقفیت اور وابستگی رکھتے تھے۔جہاں

عورتوں کے حوالے بات ہوتی ہے وہاں ان کی آواز ،ان کا دردمندانہ اظہار بڑی شدّت سے اُبھرتا ہے۔عورتوں کے ذریعے دنیا کے نظام بدلنے کا تصوّر پہلی بار سردار جعفری کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہ ان کی شاعری اور فکر ونظر کی انفرادیت ہے۔

سردار جعفری کا دوسرا مجموعۂ کلام ''نئی دنیا کو سلام'' ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا۔اس مجموعے میں ان کی طویل نظم ''نئی دنیا کو سلام'' شامل ہے، جو نظام نَو کی خوشخبری دیتی ہے۔اس نظم کا سب سے خوب صورت حصّہ محبت ہے جو مریم کی شکل میں مختلف روپ میں دکھائی دیتی ہے۔مریم صرف ایک بیوی، محبوبہ نہیں ہے بلکہ ماں بھی ہے اور اس سے زیادہ ایک باغی عورت بھی جسے سردار جعفری اس روپ میں بھی دیکھتے ہیں۔

تبسّم نہیں صرف ،تلوار بھی ہے وہ نغمہ نہیں صرف ، جھنکار بھی ہے
وہ شمعِ شبستاں ہے نورِ سحر ہے وہ ہر گام پر مرد کی ہم سفر ہے

جوشؔ اور اخترؔ شیرانی نے عورت کی روایتی امیج کو توڑنے کا جو کام کیا تھا اسے مجازؔ نے آگے بڑھایا اور

''ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھّا تھا''

کہہ کر پوری ترقّی پسند شاعری میں عورت کے کردار کو ہی بدل دیا۔فیضؔ کی محبوبہ ہو یا کیفیؔ کی عورت، مجروح یا ساحرؔ کی ہم سفر سبھی نے باغیانہ ہم سفری وہم نظری کے منظر پیش کیے لیکن سردار کی مریم صرف جاوید کی بیوی یا ہندوستان کی عورت نہیں بلکہ پوری دنیا کی بہادر عورتوں کی علامت بن جاتی ہے اور سردار کہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

ہے انسان کی کائنات اس کے دَم سے فروزاں ہے شمع حیات اس کے دَم سے
اس آنچل میں ہے زندگی کا شرارہ وہ آغوشِ تہذیب کا گہوارہ

ترقّی پسند ادب میں سردار جعفری خود لکھتے ہیں:

''اب یہ نئی عورت ہمارے ادب میں قدم رکھ رہی ہے.....جب تک عورت کو معاشی آزادی نہیں ملے گی اور وہ وسیع سماجی آزادی میں اپنا حصّہ نہیں کرے گی تب تک عشق وحُسن دونوں بیمار رہیں گے۔اب عورت کے تصوّر میں گہرائی پیدا ہو رہی ہے جو بہترین قسم کی حقیقت نگاری ہے۔''

(ترقّی پسند ادب،ص:۲۴۱)

عورت کے بارے میں سردار جعفری کے اس روشن اور ارتقائی نظریے کی وجہ سے ''پرواز'' کی ''مزدور لڑکیاں، نئی دنیا کو سلام'' تک پہنچتے پہنچتے ذہین باغی عورتوں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔''مزدور لڑکیاں'' میں سردار خود بولتے ہیں اور ''نئی دنیا کو سلام'' میں عورت خود بولنے لگتی ہے۔۱۹۴۶ء میں ہندوستان کی سیاسی فضا نے کروٹ بدلی اور ایک بار پھر حالات خراب ہونے لگتے ہیں۔امن کا یہ سپاہی ان حالت سے دل برداشتہ ہو جاتا ہے اور اپنی سیاسی مثنوی ''جمہور'' میں طنزیہ انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔آزادی آئی اور اپنے جلو میں فرقہ وارانہ فسادات، قتل وغارت گری، مذہب وملّت کی تفریق کی سوغات لے کر آئی، جس نے اہلِ علم ودانش کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔سردار جعفری بھی اس طرح کی آزادی سے متاثر ہوئے۔آزادی کے فوراً بعد شاعری میں ایک نئے سردار کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔شاعری میں انقلاب اور احتجاج کا لہجہ اُبھر کر سامنے آیا۔

حکومت کے خلاف شاعری کرنے کے نتیجے میں اُنہیں گرفتار کرلیا گیا اور قید و بند کی صعوبتیں جھیلنی پڑیں۔ یہ زمانہ ان کی شاعری لے لئے بہت سازگار تھا۔ ''خون کی لکیر'' ۱۹۴۹ء میں اور ''پتّھر کی دیوار'' ۱۹۵۳ء میں شامل نظمیں اس عہد کی بہترین نظموں میں شمار ہوتی ہیں۔ ان مجموعوں میں شامل کم وبیش سبھی نظمیں ہنگامی موضوعات پر مشتمل ہیں۔ لہجے میں گھن گرج اور خطیبانہ آہنگ ہے۔ انقلابی آہنگ کی واضح مثال نظم ''ایشیا جاگ اٹھا'' بھی جیل میں لکھی گئی تھی۔ ناسک جیل میں لکھی جانے والی نظمیں ان کی شاعری میں نئے جہات اور نئی سمتوں کا پتہ دیتی ہیں۔ ''جیل کی رات'' (خون کی لکیر)، ''نیند اور تمہاری آنکھیں'' (پتّھر کی دیوار) میں سردار کا رنگ ولہجہ اور فکر و آہنگ ان کے اپنے مخصوص اُسلوب میں بدل جاتا ہے۔ یہ نظمیں علامتوں اور استعاروں کے فطری استعمال اور پیکر تراشی کی خوب صورت مثال پیش کرتی ہیں۔

قید و بند کی صعوبتوں نے ان کے شعری سفر کو نئی جہت اور نیا زاویہ عطا کیا۔ اس عہد کی متعدّد نظموں میں ذاتی واردات اور احساسات کی ترجمانی بھی بڑے ہی موثّر انداز میں ملتی ہے۔ اس کی اہم مثال نظم ''میرا سفر'' ہے۔ یہ نظم زندگی کی قوّتِ نمو، تسلسلِ حیات اور وقت کے تصوّرات کو پیش کرتی ہے۔ نظم کا آغاز موت کے تصوّر سے ہوتا ہے لیکن حیاتِ نَو کی بشارت دیتے ہوئے سردار اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

لیکن میں یہاں پھر آؤں گا
بچّوں کے دہن سے بولوں گا
چڑیوں کی زباں سے گاؤں گا
میں رنگِ حنا ، آہنگِ غزل
اَندازِ سخن بن جاؤں گا

سردار جعفری کی باغیانہ شاعری، ان کا غم وغصّہ، ان کی نفرت اور ان کا انقلاب ان کا ذاتی نہیں بلکہ اس کی بنیاد انسان اور زندگی سے شدید محبت پر رکھی ہوئی ہے۔ سردار جعفری کی شاعری کا آخری عہد ۱۹۵۳ء تا ۱۹۶۸ء ان کی شاعری کی سنجیدگی، گہرائی اور گیرائی کا دَور ہے۔ اس دَور کی نظموں میں رومان، حقیقت، اشتراکیت، سماجیت سبھی کچھ نئے پیرایۂ اظہار و افکار و آثار میں نظر آتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی نظمیں، مختلف و متفرّق اشعار میں بلا کی رومانیت اور کیفیت تو ہے ہی سنجیدگی اور بالیدگی بھی نظر آتی ہے۔ ان میں زندگی کا ٹھوس نظریہ اور فلسفیانہ گہرائی نظر آتی ہے۔ نظمیں زندگی کی جہد مسلسل اور اس کے اسرار و رُموز پر فلسفیانہ روشنی ڈالتی ہیں۔ ان کی نظموں میں صرف فلسفہ ہی نہیں ہے، سنجیدہ رومان، تحیّر و تجسس آمیز حقیقتوں کے مرقع بھی نظر آتے ہیں۔ ان کی نظموں میں سیاسی و سماجی عوامل کارفرما ضرور ہیں لیکن ان میں روح کا کرب اور دل کی تپش بھی دکھائی دیتی ہے۔ سردار بنیادی طور پر حق پرستی اور انسان دوستی کے شاعر ہیں جو فی زمانہ ترقّی یافتہ شکل میں مارکسزم اور پروگیسوازم میں بدل جاتے ہیں لیکن ان کا ذہن و شعور تاریخ و تہذیب کے انہی معاملات میں رَچا بسا ہے۔ نظم ''یہ لہو'' کا یہ بند اس کی مثال ہے۔

یہ لہو کافر نہیں، مرتد نہیں، مسلم نہیں
کلمۂ حق کا اُجالا ، یہ تجلّی ، یہ ظہور
یہ لہو ، میرا لہو ، تیرا لہو ، سب کا لہو

اور سردار جعفری کی شاعری، ترقّی پسند شاعری میں ایک الگ ڈکشن اور پہچان بناتی ہوئی نظر آتی ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۴﴾ سردار جعفری کو پہلا صوبائی انعام کب ملا؟

﴿۵﴾ قید و بند کے زمانے کی نظمیں کس مجموعے میں شامل ہیں؟

﴿۶﴾ سردار کی کسی ایسی نظم کا نام لکھیے جس میں عورت کے مختلف رنگوں کا ذِکر ہو۔

10.05 علی سردار جعفری کی نظم ''ہاتھوں کا ترانہ'' متن

ان ہاتھوں کی تعظیم کرو

ان ہاتھوں کی تکریم کرو

دنیا کے چلانے والے ہیں

ان ہاتھوں کو تسلیم کرو

تاریخ کے اور مشینوں کے پہیوں کی روانی ان سے ہے

تہذیب کی اور تمدّن کی بھرپور جوانی ان سے ہے

دنیا کا فسانہ ان سے ہے، انساں کی کہانی ان سے ہے

ان ہاتھوں کی تعظیم کرو

یہ ہاتھ نہ ہوں تو مہمل سب، تحریریں اور تقریریں ہیں

یہ ہاتھ نہ ہوں تو بے معنی انسانوں کی تقدیریں ہیں

یہ حکمت و دانش، علم و ہنر ان ہاتھوں کی تفسیریں ہیں

ان ہاتھوں کی تعظیم کرو

10.06 علی سردار جعفری کی نظم ''ہاتھوں کا ترانہ'' تشریح

''ان ہاتھوں کی.....تسلیم کرو''

انسان حیات و کائنات کا مرکز و محور ہے۔ انسان کے بنا کائنات کے وجود کا تصوّر ممکن نہیں لیکن اپنے مفاد کی خاطر انسان بھی انسان کا دشمن بن جاتا ہے۔ یہ دنیا مجبوروں، محکوموں، سرمایہ داروں، فن کاروں، کسانوں، مزدوروں اور اہلِ دانش کا گہوارہ ہے اور ان سب کے درمیان ہاتھوں کی اپنی الگ اہمیت ہے۔ اپنی نظم ''ہاتھوں کا ترانہ'' میں اُنہوں نے فن کاروں کے ہاتھوں کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے لوگوں کو بھی اس کی تعظیم کرنے پر زور دیا ہے۔

''تاریخ کے اور مشینوں..... تعظیم کرو''

سردار جعفری فن کاروں کے ہاتھوں کی اہمیت تسلیم کرتے ہیں۔ وہ فن کاروں کے درد سے واقف تھے۔ اُنہیں اس بات کا احساس تھا کہ یہ فن کار جو دنیا کو چلانے کی طاقت رکھتے ہیں۔ جن سے تہذیب وتمدّن کا چراغ روشن ہوتا ہے۔ وہی لوگ کبھی کبھی بے آسرا و مجبور ہو جاتے ہیں۔ ان کو ان کی محنت کا صلہ نہیں ملتا نہ ہی ان کے فن کی ستائش ہوتی ہے۔ ایسے لوگ جن کے ہاتھوں میں دنیا کو چلانے کی طاقت ہے، ہمیں ان ہاتھوں کی قوّت کو تسلیم کرنا چاہیے اور ان کی تعظیم کرنی چاہیے۔

''یہ ہاتھ نہ ہوں..... تعظیم کرو''

فن کاروں کے ہاتھ، تاریخ دانوں کے ہاتھ، مزدوروں کے ہاتھ، اہلِ دانش کے ہاتھ، غرض یہ ہاتھ وہ ہاتھ ہیں جن سے کارخانۂ حیات میں رنگینیاں، رعنائیاں اور خوشیاں ہیں۔ یہ وہ ہاتھ ہیں جو پتّھر کو بت بنا دیتے ہیں۔ جو تاج محل، مصر کے اہرام وغیرہ بنا کر ایک تاریخ مرتب کر دیتے ہیں۔ یہ وہ ہاتھ ہیں جو کارخانوں میں مشینوں کو چلا کر انسانی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔ یہ وہ ہاتھ ہیں جو زمین کے اندر سے معدنیات نکال کر زرخیز زمینوں میں غلّہ پیدا کر کے تہذیبوں کو پھلنے پھولنے کا موقع دیتے ہیں۔ یہ وہ ہاتھ ہیں جو طرزِ معاشرت کو بدل کر رکھ دینے کی قوّت رکھتے ہیں۔ یہ وہ ہاتھ ہیں جو دنیا اور دنیا میں رہنے والوں کی کہانی لکھ کر ایک تاریخ مرتّب کر دیتے ہیں کہ آنے والی نسلیں ان سے مستفید ہو سکیں۔ ہمیں ایسے عہد ساز ہاتھوں کی عزّت کرنی چاہیے۔ شاعر ان ہاتھوں کی مخفی قوّت سے واقف ہے اور اصل خوبی مادّۂ تعمیر سے آگاہ۔ اس لئے وہ اُنہیں ایک نئی دنیا کی تعمیر کے لئے پکارتے ہیں۔

اس بند میں شاعر ان ہاتھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ ہاتھ یعنی فن کاروں، صنّاعوں اور کاریگروں کے ہاتھ نہ ہوں تو تحریریں اور تقریریں سب بے کار ہیں۔ یہ وہ ہاتھ ہیں جو اگر نہ ہوں تو انسانوں کی تقریریں بے معنی ہیں۔ کیوں کہ ان ہاتھوں میں تقدیروں کو بدل دینے کی طاقت پنہاں ہے، اہلِ علم و دانش کی ساری دانائی و حکمت دھری کی دھری رہ جائیں اگر یہ ان کی وضاحت نہ کریں۔ اس لئے ہمیں ان ہاتھوں کی تعظیم کرنی چاہیے اور ان کی عزّت کرنی چاہیے۔ ترقّی پسند شاعری میں یہ نظم اپنی طرح کی ایک الگ شناخت رکھتی ہے، جس میں سردار نے فن کاروں کے ہاتھوں کی تعظیم کی بات کی ہے۔

10.07 علی سردار جعفری کی نظم ''ہاتھوں کا ترانہ'' تجزیہ

سردار جعفری فن کاروں کے ہاتھوں میں مخفی قوّت سے آگاہ ہیں۔ اپنی نظم ''ہاتھوں کا ترانہ'' میں وہ فن کاروں کے ہاتھوں کی عظمت کو تسلیم کرتے ہوئے دوسروں کو بھی اس کی تعظیم کرنے پر زور دیتے ہیں۔ صنّاعوں اور کاریگروں کے ہاتھ وہ ہاتھ ہیں جو فطرت کے شاہ کار تخلیق کرتے ہیں۔ اس لئے ہمیں چاہیے کہ ہم ان ہاتھوں کی عظمت کو تسلیم کریں۔ اُنہیں کے دَم سے کاروبارِ حیات آگے بڑھتا ہے۔ اس لئے ہمیں ان کی عظمت تسلیم کرنی چاہیے۔ تاریخ کے صفحات اور مشینوں کے پہیے ان کے دَم سے آگے بڑھتے ہیں۔ یہ وہ ہاتھ ہیں جو تہذیب وتمدّن کو پروان چڑھاتے ہیں۔ یہی وہ ہاتھ ہیں جو دنیا اور دنیا میں رہنے والے لوگوں کی کہانی لکھتے ہیں اس لئے ہمیں ان ہاتھوں کی عزّت کرنی چاہیے۔ یہ وہ ہاتھ ہیں جن کے بنا تحریریں اور تقریریں بے معنی ہیں، یہ وہ ہاتھ ہیں جو علم و ہنر اور عقل مند، دانش وروں کی تفسیریں پیش کرتے ہیں۔ اس لئے ہمیں ان ہاتھوں کی تعظیم کرنی چاہیے۔

10.08 خلاصہ

سردار جعفری ترقّی پسند شاعر تھے۔ان کا شمار بیسویں صدی کے اہم شاعروں میں ہوتا ہے۔سردار جعفری کی پیدائش یو پی کے ایک قصبہ بلرام پور میں ۲۹ رنومبر ۱۹۱۳ء کو ایک زمین دار گھرانے میں ہوئی۔سردار کی پرورش مذہبی ماحول میں ہوئی۔گھر میں محرّم ومجلس کا ماحول تھا اور انیس کے مرثیے فضا میں گونجا کرتے تھے۔بقول جعفری کلمہ اور تکبیر کے بعد میرے کانوں نے پہلی آواز انیسؔ کے مرثیوں کی سنی۔سردار جعفری اپنے علاقے کے اسکولوں کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم رہے اور ہر جگہ اسٹوڈنٹس یونین میں سرگرمی سے حصّہ لیتے رہے۔ ۱۹۳۶ء میں ترقّی پسند تحریک کی بنیاد پڑ چکی تھی۔سردار اس تحریک میں ایک ممتاز کارکن کی حیثیت سے اُبھرے۔اُنہیں حکومت کے عتاب کا نشانہ بننا پڑا۔لکھنؤ اور بنارس کی جیلوں میں رہنا پڑا۔رہائی کے بعد اُنہیں گھر میں نظر بند رکھا گیا۔سردار جعفری کی شادی سلطانہ منہاج سے ۳۰ر جنوری ۱۹۴۸ء کو ہوئی۔وہ سردار کی آخری سانس تک ان کی ہم سفر اور شریکِ زندگی رہیں۔

سردار نے ۱۵ر سال کی عمر میں شاعری اور ۱۷ر سال کی عمر میں افسانہ نگاری شروع کی۔اگر چہ وہ بنیادی طور پر شاعر تھے لیکن اس کے ساتھ وہ افسانہ نگار، ڈرامہ نویس، نقّاد، مترجم، صحافی اور مقرر بھی بہت اچھّے تھے۔اُنہوں نے کبھی سرکاری ملازمت نہیں کی۔ان کی علمی وادبی خدمات کے اعتراف میں اُنہیں مختلف سرکاری وغیر سرکاری اداروں کی جانب سے انعامات واعزازت سے سرفراز کیا گیا، جس میں گیان پیٹھ بھی شامل ہے۔۱۹۸۶ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے اُنہیں ڈی.لٹ کی اعزازی ڈگری دی۔یکم اگست ۲۰۰۰ء کو برین ٹیومر کے سبب ممبئی اسپتال میں ان کا انتقال ہوگیا۔

سردار جعفری کا پہلا مجموعہ ''پرواز'' ۱۹۴۳ء میں منظرِ عام پر آیا۔اس میں شامل نظمیں سماج، بغاوت، انگڑائی، مزدور لڑکیاں، اشتراکی، زمانہ، تاریخ، آثارِ سحر، ارتقا وانقلاب، جنگ اور انقلاب وغیرہ ان کے انقلابی تیور کی نشان دہی کرتی ہیں۔ان کا دوسرا مجموعہ ''نئی دنیا کو سلام'' ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا۔اس مجموعہ میں ان کی طویل نظم ''نئی دنیا کو سلام'' شامل ہے۔سردار بنیادی طور پر حق پرستی اور انسان دوستی کے شاعر ہیں۔

نظم ''ہاتھوں کا ترانہ'' سردار جعفری کی معروف نظموں میں سے ایک ہے جو دراصل ان مزدوروں اور فن کاروں کا قصیدہ ہے جن کی محنت پر تمدّن کا چراغ جلتا ہے۔اس نظم کے ذریعے اُنہوں نے مزدوروں اور محنت کش طبقہ کی عظمت کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۷﴾ سردار جعفری کو ڈی.لٹ کی اعزازی ڈگری کب ملی؟

﴿۸﴾ سردار جعفری کا انتقال کب ہوا؟

﴿۹﴾ سردار جعفری کا پہلا مجموعہ کب منظرِ عام پر آیا اور اس کا کیا نام تھا؟

10.09 فرہنگ

انحراف	: انکار	دانش	: علم وعقل
تاثرات	: تاثر کی جمع	صعوبتوں	: پریشانیوں
تفسیر	: وضاحت	طلسم	: جادو

تکریم	: عزّت کرنا	مشیت ایزدی	: قدرت کی طرف سے
تمدّن	: طرزِ معاشرت	مخفی	: چھپی ہوئی، پوشیدہ
تہذیب	: شائستگی، خوش اخلاقی	مروّجہ	: رائج، چلن میں
حکمت	: دانائی، عقل مندی	مستفید	: فائدہ اٹھانا
خارجی	: باہری	مہمل	: بے کار، بے ہودہ
داخلی	: اندرونی	وسعت	: پھیلاؤ

10.10 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درجِ ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : علی سردار جعفری کی حیات پر مختصر روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر۲ : علی سردار جعفری کی شاعری میں عورت کے تصوّر کی ترجمانی کیجیے؟

سوال نمبر۳ : علی سردار جعفری کی ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : علی سردار جعفری کی حیات وخدمات پر ایک مضمون قلم بند کیجیے۔

سوال نمبر۲ : علی سردار جعفری کی شاعرانہ خصوصیات پر روشنی ڈالیے اور مثال میں اشعار پیش کیجیے۔

سوال نمبر۳ : علی سردار جعفری کی کی نظم ''ہاتھوں کا ترانہ'' کا خلاصہ قلم بند کیجیے۔

10.11 حوالہ جاتی کتب

۱۔ ترقّی پسند تحریک اور اردو شاعری	از	ڈاکٹر یعقوب یاور
۲۔ تین ترقّی پسند شاعر	از	پروفیسر علی احمد فاطمی
۳۔ سردار جعفری (فن اور شخصیت)	از	منظر سلیم
۴۔ مجاز، شخص اور شاعر	از	اصغر عبّاس

10.12 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ ۱۹۳۷ء میں

﴿۲﴾ ۱۹۴۰ء میں

﴿۳﴾ علی سردار جعفری کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۵ سال کی عمر میں ہوا۔

﴿۴﴾ ۱۹۳۸ء میں

﴿۵﴾ ''خون کی لکیر'' ۱۹۴۹ء اور ''پتھّر کی دیوار'' ۱۹۵۳ء

﴿۶﴾ نظم ''نئی دنیا کو سلام''

﴿۷﴾ ۱۹۸۶ء میں

﴿۸﴾ یکم اگست ۲۰۰۰ء

﴿۹﴾ ۱۹۴۳ء، پرواز

اکائی 11 : اختر الایمان (ایک لڑکا)

ساخت

11.01 : اغراض ومقاصد

11.02 : تمہید

11.03 : اختر الایمان کے حالاتِ زندگی

11.04 : اختر الایمان کی نظم نگاری

11.05 : اختر الایمان کی نظم ''ایک لڑکا'' متن

11.06 : اختر الایمان کی نظم ''ایک لڑکا'' تشریح

11.07 : اختر الایمان کی نظم ''ایک لڑکا'' تجزیہ

11.08 : خلاصہ

11.09 : فرہنگ

11.10 : نمونہ امتحانی سوالات

11.11 : حوالہ جاتی کتب

11.12 : اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

11.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں ہم اُردو کے اہم نظم نگار شاعر اختر الایمان کے تعلق سے معلومات حاصل کریں گے اور اُن کی معروف نظم ''ایک لڑکا'' کا بھی مطالعہ کریں گے۔ اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس لائق ہو جائیں گے کہ اختر الایمان کی حیات اور اُن کی شعری خدمات کے بارے میں بات چیت کر سکیں۔ بہتر ہوگا کہ آپ اس نظم کو مکمل یا اس کا کچھ حصہ زبانی یاد کر لیں تا کہ کبھی کسی محفل میں اسے سنا سکیں۔

11.02 تمہید

بیسوی صدی کی چھٹی دہائی میں مغربی ادب کے زیرِ اثر اردو شعر وادب میں جدیدیت کو کافی فروغ ملا، جس کے پس منظر میں صنعتی ترقی اور صنعتی شہروں کے مسائل تھے۔ اس رجحان کے تحت نظم لکھنے والوں میں اختر الایمان، مجید امجد، افتخار جالب اور ناصر کاظمی وغیرہ اہم ہیں۔ نیز آج کل کے اہم نظم نگار شعرا مخمور سعیدی، عزیز قیسی، قاضی سلیم، منیر نیازی، بلراج کومل، عمیق حنفی، شہریار، کمار پاشی، ساقی فاروقی اور شکیل اعظمی وغیرہ ہیں۔ اور آج جدید اُردو نظم اردو ادب کی ایک توانا صنفِ سخن کی حیثیت سے ترقی کر رہی ہے۔ اس اکائی میں آپ جدیدیت کے رجحان کے تحت لکھنے والے ایک اہم شاعر اختر الایمان کے بارے میں تفصیل سے مطالعہ کریں گے۔

11.03 اختر الایمان کے حالاتِ زندگی

اختر الایمان ۱۲؍نومبر ۱۹۱۵ء کو اتر پردیش کے ضلع بجنور کے قصبہ نجیب آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کا بچپن بہت ہی عسرت اور تنگ دستی میں گزرا۔ انہوں نے ۱۹۳۷ء میں میٹرک، طرح طرح کے درپیش مسائلِ زندگی کے باوجود، تہذیبی اور سیاسی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیتے ہوئے ۱۹۴۲ء میں اینگلو عربک کالج (موجودہ ذاکر حسین کالج، دہلی) سے گریجویشن اور ۱۹۴۴ء علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم.اے (اردو) کا سالِ اوّل مکمل کیا۔ اسی دَوران انہوں نے کبھی کلرکی اختیار کی، کبھی آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ رہے اور مختصر عرصے لے لئے ماہ نامہ ''ایشیا'' (میرٹھ) کی ادارت بھی کی۔ بالآخر فلم کے شعبۂ قلم کار سے وابستہ ہوگئے۔ انہیں ''فلم فیئر ایوارڈ'' سے بھی نوازا گیا۔

فلموں لے لئے منظر نامے اور مکالمے لکھنے کے علاوہ انہوں نے ایک فلم کی ہدایت کاری بھی کی لیکن اپنی نظموں کو مادی ترقی اور حصولِ آسائش کا ذریعہ نہیں بنایا۔ فلموں سے دیگر مادی فوائد کے علاوہ، بقول اختر الایمان انہیں ''بصیرت'' ملی اور انسان کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کے مواقع ملے۔ اس ''بصیرت'' کو ہندوستان کے تقریباً تمام بڑے شہروں اور دُور دراز کے ملکوں کی سیاحت نے مزید جلا بخشی۔ انہوں نے مشاعروں، سمیناروں، کانفرنسوں اور فلموں کے سلسلے میں بیروت، دمشق، لندن، پیرس، قاہرہ، جرمنی، نیویارک، لاس اینجلس، سان فرانسسکو، شکاگو، کینیا، یوگینڈا، تنزانیہ، نیروبی، فرینک فرڈ، دوبئی، کراچی الغرض دنیا کے بے شمار ممالک کی سیاحت کی۔ ۱۹۹۵ء میں اُن کا انتقال ہوگیا۔

اختر الایمان تاحیات کسی خاص سیاسی، معاشرتی اور ادبی نظریے، گروہ یا تنظیم سے وابستہ نہیں رہے۔ اگرچہ ان کے عہد میں وابستگی کامیابی کی ضمانت تصوّر کی جاتی تھی۔ غیر وابستگی کے باوجود، محض اپنی تخلیقات کے بل پر، دیر سے سہی، ادبی حلقوں میں انہیں پذیرائی نصیب ہوئی۔ نظریاتی غیر وابستگی اور ادب و نظریے کو وسیلۂ ظفریابی نہ تصوّر کرنے کے باوجود انہیں یوپی اردو اکادمی، دہلی اردو اکادمی، مدھیہ پردیش اُردو اکادمی، غالب انسٹی ٹیوٹ، میر اکادمی نے انعامات اور حکومتِ مدھیہ پردیش نے ''اقبال سمان'' سے نوازا اور تین بار ''گیان پیٹھ ایوارڈ'' لے لئے بھی ان کا نام تجویز کیا گیا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۱﴾ اختر الایمان کی تاریخی پیدائش اور سن وفات لکھئے۔

﴿۲﴾ اختر الایمان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں کن کن انعامات و ایوارڈ سے نوازا گیا؟

﴿۳﴾ اختر الایمان کو فلم کا کون سا بڑا ایوارڈ ملا؟

اختر الایمان کی تصانیف کی مندرجہ ذیل ہیں:

(۱)	گرداب	مطبوعہ ۱۹۴۳ء	(۲)	سب رنگ	مطبوعہ ۱۹۴۶ء
(۳)	تاریک سیارہ	مطبوعہ ۱۹۵۲ء	(۴)	آبِ جو	مطبوعہ ۱۹۵۹ء
(۵)	یادیں	مطبوعہ ۱۹۶۰ء	(۶)	بنت لمحات	مطبوعہ ۱۹۶۹ء
(۷)	نیا آہنگ	مطبوعہ ۱۹۷۷ء	(۸)	سروساماں	مطبوعہ ۱۹۸۳ء
(۹)	زمین زمین	مطبوعہ ۱۹۹۰ء	(۱۰)	زمستاں سرد مہری کا	مطبوعہ ۱۹۹۶ء پسِ مرگ
(۱۱)	نثری خودنوشت ''اس آباد خرابے میں''	مطبوعہ ۱۹۹۶ء			

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۴﴾ اختر الایمان کا کون سا مجموعہ کلام ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا؟

﴿۵﴾ اختر الایمان کی وفات کے بعد شائع ہونے والے ان کے مجموعہ کلام کا نام بتائیے۔

﴿۶﴾ اختر الایمان کی خودنوشت کب اور کس عنوان کے تحت شائع ہوئی؟

11.04 اختر الایمان کی نظم نگاری

اختر الایمان کی زیادہ تر نظمیں زندگی کے اہم اور سنجیدہ مسائل سے فلسفیانہ انداز میں رشتہ استوار کرتی ہیں۔ مثلاً فراموش گاری، مسئلہ وجود و عدم، جہد للبقاء، جہد للصلح، ضمیرِ انسانی، زوالِ آدم خاکی، انحطاطِ انسانیت، نیکی اور بدی کی کش مکش، خارج و باطن کی آویزش، حقیقت و خواب کی جدوجہد، آزادی اور غلامی کا تفاوت وغیرہ۔ انہوں نے وقت اور اس کی ناگزیریت جیسے خالص فلسفیانہ موضوع کو شعری قالب عطا کرنے کے علاوہ معاشرتی مسائل: قدروں کی زبوں حالی، سیاست کی ایذا رسانی، دَم توڑتی دنیا کی کراہیں، حُبِّ انسانی، نئے نظامِ زندگی کی تلاش، ان کے غور و فکر کے خاص نکات ہیں۔ کائنات کے اسرار و رُموز سے نقاب کشائی کرتی ہوئی بعض نظموں میں تلاش و جستجو کا انداز بھی ملتا ہے۔

اختر الایمان کی بیش تر نظمیں انسان دوستی پر مبنی ہیں۔ یہاں تک کہ ابتدائی دَور کی نظمیں تاریک سیارہ اور خاک و خون نئی اور اعلیٰ انسانیت کا مژدہ سناتی ہیں۔ محبت، جذبۂ محبت کی جاودانی اور اس کی ہمہ جہتی کی تائید کرتی ہیں۔ ''ایک لڑکا'' ضمیرِ انسانی کی بیداری کا استعارہ ہے۔ شاہ کار نظم ''مفاہمت'' انسان کی دو بنیادی کیفیت، خوشی اور غم کے اسباب کی تحقیق اور حل پیش کرتی ہے۔ حمام بادگرد، میں ایک سیارہ اور میرا دوست ابوالہول گولہ بارود، میزائل اور بین الاقوامی دہشت گردی پر اظہارِ افسوس ہے۔ انسان کی بداعمالی کے سبب ''ارضِ ناکس'' میں زمین کا کرب موضوع بنتا ہے۔ ''راہِ فرار'' اور ''رام راج بجنور میں'' انسان کی حیوانیت، وحشت اور فسادات کی نفی کرتی ہے۔ ''یادیں'' عہد حاضر کی آفاقی داستانِ غم ہے۔ ''شیشہ کا آدمی'' صبح کی چائے کے ساتھ قتل و غارت گری کی خبریں ہضم کرنے والے انسان کی کہانی ہے۔ ''عروس البلاد'' اور ''نیا شہر'' آج کے شہروں کے کرب کو احاطۂ فکر میں لاتی ہیں۔

''اپاہج گاڑی کا آدمی'' عہد حاضر کے کئی خانوں میں بٹے ہوئے انسان، جو ایک اعتبار سے ''سیزوفرینیا'' کا مریض بن چکا ہے، کے فکری انتشار کو ظاہر کرنے والی شاہ کار تخلیق ہے۔ سحر، وقت کی کہانی اور عہدِ وفا میں وقت کی چیرہ دستیوں کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ''زمستاں سرد مہری کا'' اور ''کالے سفید پروں والا پرندہ اور میری ایک شام'' وقت کے فلسفیانہ فکر کا شعری اظہار ہے۔ ''مسجد'' اور ''پرانی فصیل'' قدروں کی شکست و ریخت کا نوحہ ہیں۔ ''بنتِ لمحات'' لوٹ کر واپس نہ آنے والے لمحوں اور یادوں کی شگفتہ پیش کش ہے۔ مختصراً اختر الایمان کی نظمیں ایک عام انسان کی حیثیت سے دنیا بسر کرنے میں پیش آئے تلخ تجربات، تکلیف دہ مشاہدات اور کربناک تاثرات پر منحصر ہیں۔ ان تکلیف دہ احساسات اور اس سے پیدا ہونے والے انتشار کے سبب ان کی اکثر نظمیں نغمگی اور طمانیت سے کنارہ کشی کر کے کھردرے اور ناہموار اظہار اور منتشر ہیئت، مگر متوازن انداز اور پرسکون، فکری لب و لہجے کو اپنا وسیلہ بناتی ہیں۔

اختر الایمان ادب میں نظریاتی وابستگی، روایتی رومانیت، چہار صد سالہ غزلیہ فضا اور برسوں پرانے شعری لوازمات کے مخالف تھے۔ تاہم ان کی ابتدائی نظموں میں رومانیت کی گھٹتی بڑھتی پرچھائیاں، تغزّل، کلاسیکی انداز، نیز ماقبل کے معروف ومقبول شعرا کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں جو بتدریج کم ہوتے ہوتے مفقود ہوگئے۔ اس ارتقائی مراحل سے گزر کر بالآخر اختر الایمان اپنی نئی شعریات اور اپنا منفرد اُسلوب وضع کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ ان کا یہ مخصوص اُسلوب ان کی نظموں کے تلخ وترش موضوعات کے مانند کھردرا اور ناہم وَار مگر بامعنی ہے۔

اختر الایمان نے اپنی ابتدائی نظموں میں علامتی انداز اختیار کیا اور نظم کے کردار و مناظر کو وسیع تر حقیقتوں کا استعارہ بنادیا لیکن بعد میں علامتی طریق کار کو نظر انداز کر کے براہِ راست مکالماتی اور عوامی زبان سے اپنی نظموں کو فکری گہرائی اور جدید اردو نظم کے فن کو ایک نئی جہت عطا کردی۔ اختر الایمان نے اپنی نظموں میں غزل سے مختلف ایک ایسی شعری زبان تخلیق کرنے کی باقاعدہ کوشش کی ہے، جو عصرِ حاضر کے پیچیدہ مسائل کی ترسیل کے لئے موزوں اور مناسب ہو۔ یوں انہوں نے میراجی کی تخلیقی زبان کی شعوری کوشش کو ایک نئی سمت ورفتار دینے کی کاوش کی ہے۔ واضح رہے کہ میراجی نے ایسی زبان کو رواج دینا چاہا تھا، جو نہ صرف غزل سے مختلف ہو، بلکہ جو ہندوستانی مزاج اور احساس کی بہتر طور پر ترسیل کر سکے۔ چنانچہ اختر الایمان کی چند ابتدائی، کلاسیکی لمس والی نظموں سے قطعِ نظر، ان کی بیش تَر نظمیں، غزل کی فضا سے بہت مختلف، مکالماتی اور عوامی زبان میں ہیں۔ اختر الایمان کی یہ زبان اپنی سہل پسندی کے باوجود قابلِ ذکر معنوی گہرائی کی حامل ہے۔ چند نظموں کی زبان سہل نگاری سے ایک قدم مزید آگے کھردری، ناہم وَار بلکہ بسا اوقات غیر شاعرانہ ہے۔ لیکن زبان کی یہ ناہم وَاری بالعموم ان کی نظموں کو بد ہیئت اور بدصورت بنانے کے بجائے جدید اردو نظم کو ایک نئی شعری جہت سے روشناس کرتی ہیں۔ بطور مجموعی انہوں نے عام ڈگر سے ہٹ کر ''جدید اردو نظم'' کو فکری عناصر، فلسفیانہ فکر اور احساس کا ترجمان بنادیا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۷﴾ اختر الایمان کی پانچ نظموں کے نام بتائیے۔

﴿۸﴾ اختر الایمان کی بیش تَر نظموں کے موضوعات کیا ہوتے ہیں؟

11.05 اختر الایمان کی نظم ''ایک لڑکا'' متن

دیارِ شرق کی آبادیوں کے اُونچے ٹیلوں پر
کبھی آموں کے باغوں میں، کبھی کھیتوں کی مینڈوں پر
کبھی جھیلوں کے پانی میں، کبھی بستی کی گلیوں میں
کبھی کچھ نیم عریاں کم سِنوں کی رنگ رلیوں میں
سحر دم، جھٹپٹے کے وقت، راتوں کے اندھیرے میں
کبھی میلوں میں، ناٹک ٹولیوں میں، ان کے ڈیرے میں
تعاقب میں کبھی گُم، تتلیوں کے، سونی راہوں میں
کبھی ننھے پرندوں کی نہفتہ خواب گاہوں میں

برہنہ پاؤں ، جلتی ریت ، یخ بستہ ہواؤں میں
گریزاں بستیوں سے ، مدرسوں سے ، خانقاہوں میں
کبھی ہم سِن حسینوں میں بہت خوش کام و دل رفتہ
کبھی پیچاں بگولہ ساں ، کبھی جیوں چشمِ خوں بستہ
ہوا میں تیرتا، خوابوں میں بادل کی طرح اُڑتا
پرندوں کی طرح شاخوں میں چھپ کر جھولتا، مُڑتا
مجھے اک لڑکا، آوارہ منش، آزاد سیلانی
مجھے اک لڑکا، جیسے تُند چشموں کا، رَواں پانی
نظر آتا ہے، یوں لگتا ہے، جیسے یہ بلائے جاں
مرا ہم زاد ہے، ہر گام پر، ہر موڑ پر جولاں
اسے ہم راہ پاتا ہوں، یہ سائے کی طرح میرا
تعاقب کر رہا ہے، جیسے میں مفرور ملزم ہوں
یہ مجھ سے پوچھتا ہے اخترالایمان تم ہی ہو؟

11.06 اخترالایمان کی نظم ''ایک لڑکا'' تشریح

دیارِ شرق کی آبادیوں کے اُونچے ٹیلوں پر.....یہ مجھ سے پوچھتا ہے اخترالایمان تم ہی ہو؟

نظم ''ایک لڑکا'' اخترالایمان کے تخلیقی سفر میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ نظم ان کے مجموعۂ کلام ''یادیں'' میں شامل ہے۔ یہ نظم اپنی فنی و تکنیکی تکمیل کے علاوہ اس لئے بھی قابلِ ذکر ہے کہ یہ نظم اخترالایمان کی شناخت کا ذریعہ بن گئی۔ اپنی گوناگوں خصوصیات کی بناء پر زاہدہ زیدی نے اسے اخترالایمان کی ایک تخلیقی جست، فضیل جعفری نے کامیاب ترین اور موثر ترین نظموں میں سے ایک اور باقر مہدی نے سب سے اچھی نظم قرار دیا ہے۔

لفظ ''لڑکا'' اور اس کی معصومیت سے واضح ہے کہ اس نظم کا عنوان ضمیر یا ضمیرِ انسانیت ہے لیکن موضوع پر بحث کرنے سے قبل بہتر یہ ہے کہ اس نظم کے محرک اور اس کے متعلق اخترالایمان کے بیانات پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔

اخترالایمان اپنے مجموعۂ کلام ''یادیں'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''نظم ''ایک لڑکا'' پہلی بار میں نے موضوع کے طور پر محسوس نہیں کی تھی تصویر کی شکل میں دیکھی تھی۔ مجھے اپنے بچپن کا ایک واقعہ ہمیشہ یاد رہا ہے اور یہ واقعہ ہی اس نظم کا محرک ہے۔ ہم ایک گاؤں سے منتقل ہو کر دوسرے گاؤں جا رہے تھے۔ اس وقت میری عمر تین چار سال کی ہوگی۔ ہمارا سامان ایک بیل گاڑی پر لادا جا رہا تھا اور میں اس گاڑی کے پاس کھڑا اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ میرے چہرے پر کرب اور بے بسی تھی، اس

لئے کہ میں گاؤں کو چھوڑ نا نہیں چاہتا تھا۔ کیوں؟ یہ بات میں اس وقت نہیں سمجھتا تھا۔ اب سمجھتا ہوں۔ وہاں بڑے بڑے باغ تھے۔ باغوں میں کھلیان پڑتے تھے۔ کوئلیں کوکتی تھیں، پپیہے بولتے تھے۔ وہاں جوہڑ تھے۔ جوہڑ میں کنول اور نیلوفر کھلتے تھے۔ وہاں کھیتوں میں ہرنوں کی ڈاریں کلیلیں کرتی نظر آتی تھیں۔ وہاں وہ سب تھا جو ذہنی طور پر مجھے پسند ہے۔ مگر وہ معصوم لڑکا اس گاڑی کو نہیں روک سکا۔ میں اس گاڑی میں بیٹھ کر آگے چلا گیا مگر وہ لڑکا وہیں کھڑا رہ گیا۔ پھر اس لڑکے کو میں نے اکثر اپنے گردو پیش پایا۔ یہ لڑکا جس کے اختیار میں کچھ نہیں تھا مگر جو آزاد تھا یا آزاد رہنا چاہتا تھا، جس کی فطرت اور نیچر دونوں ایک دوسرے سے قریب تھیں۔ جو معصومیت اور ستھرے پن کا علامیہ تھا۔ جو ملوث نہیں تھا کسی کدورت سے بھی۔

وقت کے ساتھ اس لڑکے کی تصویر میرے ذہن سے محو ہوگئی۔ میں دنیا کی کش مکش میں کھو گیا اور شاعر ہوگیا۔ پھر ایک بار میرے ذہن میں خیال آیا، میں ایک نظم کہوں جس میں اپنے نام کا استعمال کروں..... چوں کہ میں نے اپنے آپ کو اس لڑکے سے الگ کرلیا تھا اس لئے میری شخصیت دَب گئی۔ اس لڑکے کی شخصیت اُبھر آئی..... میں نے اس لڑکے کی شخصیت کو روشن کرنا چاہا اور ''ایک لڑکا''، ضمیرِ انسانیت کا اعلامیہ بن گیا۔..... پھر ایک دن رات کے ایک بجے کے قریب میری آنکھ کھل گئی۔ ذہن میں ایک مصرعہ گونج رہا تھا: یہ لڑکا پوچھتا ہے اختر الایمان تم ہی ہو؟

مجھے معلوم تھا کہ یہ لڑکا کون ہے۔ مگر یہ مجھ سے اس قسم کی باز پرس کیوں کر رہا ہے؟ مجھ سے میرے اعمال کا حساب کیوں مانگ رہا ہے؟ اب ذہن کا شعوری عمل شروع ہوا۔ معاشرے کی اخلاقی قدروں میں تضاد، معیشت لے لئے جدوجہد اور قدم قدم پر برائیوں کے ساتھ تعاون، مذہب کی اندرونی اور بیرونی شکل۔ ذہن اپنے اعمال کا حساب دینے لگا اور محتسب یہ لڑکا تھا۔ یہ لڑکا جسے میں برسوں سے جانتا تھا۔ اختر الایمان کی شخصیت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی تھی۔ ایک یہ لڑکا جو معصوم تھا اور دوسرا وہ جس نے دنیا کے ساتھ سمجھوتہ کرلیا تھا۔''

(پیش لفظ: یادیں: اختر الایمان ص ۳)

اختر الایمان کے مذکورہ بالا اقتباس کو ذہن میں رکھ کر نظم کو پڑھیے تو واضح طور پر یہ احساس ہوتا ہے کہ ''یاد کا سا رنگ لیے ہوئے'' اس نظم کی ابتدا سوانحی فضا میں ہوتی ہے۔ پہلے بند کے ابتدائی حصے میں ہم نہ صرف نظم کے مرکزی کردار سے متعارف ہو جاتے ہیں بلکہ اس کے خدوخال کے ساتھ اس کی معصومیت اور فطرت بھی ہم پر واضح ہو جاتی ہے۔ اس حصے میں بچپن کی تصویر کشی، مناظر سے متعلّق تفصیل اور پیش کش میں شاعر نے ایسی فن کاری دکھائی ہے کہ لڑکا ایک متحرک وجود کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور آم کے باغوں میں، کھیتوں کی مینڈوں پر، گلیوں اور میلوں میں گھومتا ہوا، تتلیوں کے تعاقب میں بھاگتا ہوا اور ادھر ادھر بھٹکتا ہوا نظر آتا ہے۔

11.07 اختر الایمان کی نظم ''ایک لڑکا'' تجزیہ

''ایک لڑکا'' اختر الایمان کی اہم ترین ہی نہیں بلکہ مقبول ترین نظم بھی ہے۔ہم یہ جان چکے ہیں کہ اختر الایمان کی شاعری میں یادوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے بلکہ کہنا یہ چاہیے کہ ان کی شاعری یادوں کی شاعری ہے۔خاص طور پر ان کے بچپن،لڑکپن اور کسی حد تک نوجوانی کی یادیں.....یہ نظم بھی بچپن کی یادوں سے مہک رہی ہے۔

مشرقی علاقوں کی آبادیوں کے اونچے ٹیلوں پر،کبھی آموں کے باغوں میں کبھی کھیتوں کے مینڈوں پر،کبھی جھیلوں کے پانی میں،کبھی بستی کی گلیوں میں،کبھی چندادھ ننگے چھوٹی عمر کے بچوں کے ساتھ کھیل کود میں مصروف،کبھی صبح سویرے تو کبھی اس وقت جب دن اور رات آپس میں گلے ملتے ہیں تو کبھی راتوں کے اندھیرے میں،کبھی میلوں میں تو کبھی ناٹک کی ٹولیوں اور ان کے ڈیرے میں،کبھی سنسان راستوں پر تتلیوں کے تعاقب میں مصروف،کبھی ننھے پرندوں کے چھپے ہوئے گھونسلوں کی تلاش میں،کبھی ننگے پیر جلتی ہوئی ریت پر تو کبھی بہت زیادہ ٹھنڈی ہواؤں میں،بستیوں،مدرسوں اور خانقاہوں سے دوری اختیار کرنے ولا،کبھی ہم عمر خوب صورت بچوں کے درمیان بہت خوش،کبھی ہوا کے بگولوں کے مانند بل کھاتا ہوا تو کبھی اس طرح جیسے اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا ہو،کبھی ہوا میں تیرتا ہوا تو کبھی خوابوں میں بادل کی طرح اُڑتا ہوا،کبھی پرندوں کی طرح شاخوں میں چھپ کر جھولتا اور بل کھاتا ہوا،ایک لڑکا نظر آتا ہے۔ایسا لگتا ہے کہ یہ میری جان کی مصیبت ہے،جو مرا ہم زاد ہے جو ہر راستے اور ہر موڑ پر میرے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔یہ لڑکا سائے کی طرح میرا پیچھا کر رہا ہے۔یہ لڑکا اس طرح سے میرا تعاقب کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے جیسے میں کوئی بھاگا ہوا ملزم ہوں اور مجھ سے یہ سوال کرتا ہے کہ اختر الایمان تم ہی ہو؟

مختصراً ایک معصوم سا بچہ اپنی تمام تر حرکتوں،حالتوں اور اندازِ فکر کے ساتھ میرے ساتھ بلکہ میرے اندر رہتا اور مجھ سے بار بار سوال کرتا ہے کہ اختر الایمان تم ہی ہو؟

11.08 خلاصہ

اختر الایمان جدیدیت کے رجحان کے تحت لکھنے والے ایک اہم شاعر ہیں۔انہوں نے نظم کی ہیئت اور موضوع میں طرح طرح کے تجربے کیے۔موضوعی نقطۂ نظر سے ان کی نظمیں آج کے مسائل کا بھرپور تجزیہ کرتی ہیں اور اُسلوبیاتی لحاظ سے ان کی نظموں کی خاص شناخت ان کا مخصوص اُسلوب مکالماتی اور عوامی لب ولہجہ ہے۔ان کا یہ اُسلوب بسا اوقات کھردرا اور ناہموار محسوس ہوتا ہے تاہم اپنے اندر ایک جہانِ معانی رکھتا ہے۔

اختر الایمان کے دَس مجموعہِ کلام ہیں۔اُن کا پہلا مجموعہ کلام ''گرداب'' ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا جب کہ دَسواں مجموعۂ کلام ''زمستاں سرد مہری کا'' اُن کے انتقال کے بعد ۱۹۹۷ء میں منظرِ عام پر آیا۔اُن کی نظم ''ایک لڑکا'' اُن کے مقبول عام شعری مجموعے ''یادیں'' میں شامل ہے،جو اختر الایمان کے تخلیقی سفر میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔یہ نظم اپنی فنی و تکنیکی تکمیل کے علاوہ اس لئے بھی قابل ذکر ہے کہ یہ نظم اختر الایمان کی شناخت کا ذریعہ بن گئی۔اس نظم میں اختر الایمان کا ایک ہم زاد تخیلی طور پر سامنے آتا ہے کہ اختر الایمان تم ہی ہو یادوں کے حوالے سے یہ بہت ہی موثر نظم ہے اور اُن لوگوں کو خاص طور پر متاثر کرتی ہے جنہیں آبائی گاؤں یا وطن سے دُور ہونے کی تکلیف اُٹھانی پڑی ہو۔

11.09 فرہنگ

آفاقی : ساری دنیا کا، عالمگیر

آویزش : لڑائی، فساد، بعد

اجتماعیت : ایک جگہ اکٹھا ہونا، عوامی

ارتقائی : اوپر چڑھنے کا عمل، بتدریج ترقی کرنے کا عمل

اشتراکی : سوشلزم سے متعلق، مارکسی نظریے سے متعلق

انحطاط : کم ہونا

انفرادیت : ذاتی خصوصیت، فرد کا الگ وجود

ایذارسانی : تکلیف پہنچانے کا عمل

بلائے جاں : جان کی مصیبت

پذیرائی : قبولیت، منظوری، استقبال

تفاوت : فاصلہ، دوری، فرق، جدائی

جولاں : کود پھاند کرتا ہوا، حرکت کرتا ہوا

جہت : سمت

جیوں : جیسے، مانند

جھٹپٹے کے وقت : اس وقت جب دن اور رات دونوں ملتے ہیں

حبِ انسانی : انسانی محبت، انسانوں سے محبت

حصولِ آسائش : لطف و آرام حاصل کرنا

خارجیت : مادی، ظاہری، بیرون سے متعلق

خواب گاہ : سونے کی جگہ، آرام کرنے کی جگہ

خوں بستہ : خون رکا ہوا

زوال : عروج کی ضد، کمی، اتار، تنزل

سحر دم : صبح کے وقت

سیلانی : گھومنے پھرنے والا

شرق : مشرق، پورب

صد سالہ : سوسالہ، سوسال کا، ایک صدی کا

ظفریابی : کامیابی

عسرت : تنگدستی، مفلسی، دشواری

عضویاتی وحدت : تمام اجزا و اعضا کامل کر ایک ہو جانا

فکری انتشار : ذہنی بکھراؤ، پراگندہ خیالی

کلاسیکیت : مستند، قدیم، ادب عالیہ

گام : راستہ

گریزاں : متنفر، بھاگنے ولا

لمس : کسی چیز کو ہاتھ لگانا

مائل بہ ارتقا : ترقی کی طرف مائل، نشوونما کی طرف مائل

متعارف ہونا : آپس میں جان پہچان حاصل کرنا

محتسب : حساب لینے والا، کوتوال

محرک : تحریک پیدا کرنے والا، ہلانے والا، اکسانے والا، ابھارنے والا

منش : طبیعت، عادت

نامیاتی ارتقا : کسی فن پارے یا خیال کا فطری ارتقا

نہفتہ : پوشیدہ، خفیہ، چھپا ہوا

نیم عریاں : آدھے ننگے

داخلیت	: باطنی، اندرونی سے متعلق	ہمہ جہتی	: متعدد سمتوں والا، کثیر الجہات
درپیش	: سامنے، روبرو، زیر بحث	ہنوز	: ابھی تک
دیار	: علاقہ	یخ بستہ	: ٹھنڈ سے برف کی طرح جما ہوا، بہت
رومانی لمس	: رومانی انداز		زیادہ ٹھنڈا

11.10 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درجِ ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : اختر الایمان کی تصنیفات کا تعارف کرائیے۔

سوال نمبر۲ : اختر الایمان کی نظم ''ایک لڑکا'' کا تجزیہ پیش کیجیے۔

سوال نمبر۳ : اختر الایمان کے اُسلوب پر ایک مختصر مضمون سپردِ قرطاس کیجیے۔

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : اختر الایمان کی نظم ''ایک لڑکا'' کی تشریح کیجیے۔

سوال نمبر۲ : اختر الایمان کی حیات کے بارے میں بتائیے۔

سوال نمبر۳ : اختر الایمان کی نظموں کے موضوعات پر مختصر روشنی ڈالیے۔

11.11 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اختر الایمان ایک مطالعہ	از	آصف زہری
۲۔ اختر الایمان، عکس اور جہتیں	از	شاہد ماہلی
۳۔ اس آباد خرابے میں	از	اختر الایمان
۴۔ یادیں (مجموعہ کلام)	از	اختر الایمان

11.12 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ اختر الایمان ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء کو اتر پردیش کے ضلع بجنور کے قصبہ نجیب آباد میں پیدا ہوئے۔

﴿۲﴾ اختر الایمان کو یوپی اردو اکادمی، دہلی اردو اکادمی، مدھیہ پردیش اردو اکادمی، غالب انسٹی ٹیوٹ، میرا کادمی نے انعامات اور حکومت مدھیہ پردیش نے ''اقبال سمان'' سے نوازا۔

﴿۳﴾ فلم فیئر ایوارڈ

﴿۴﴾ یادیں

﴿۵﴾ زمستاں سرد مہری کا

﴿۶﴾ اختر الایمان کی خودنوشت ۱۹۶۶ء میں ''اس آباد خرابے میں'' کے عنوان کے تحت شائع ہوئی۔

﴿۷﴾ ''تاریک سیارہ، خاک وخون، محبت، ایک لڑکا، مفاہمت''

﴿۸﴾ انسان دوستی

﴿۹﴾ فیض کی یہ نظم ان کے پختہ سیاسی، سماجی وطبقاتی رجحان

اکائی 12 : اطہر حُسین کیفی اعظمی (مکان)

ساخت

12.01 : اغراض ومقاصد

12.02 : تمہید

12.03 : اطہر حُسین کیفی اعظمی کے حالاتِ زندگی

12.04 : اطہر حُسین کیفی اعظمی کی نظم نگاری

12.05 : اطہر حُسین کیفی اعظمی کی نظم ''مکان''، متن

12.06 : اطہر حُسین کیفی اعظمی کی نظم ''مکان''، تشریح

12.07 : اطہر حُسین کیفی اعظمی کی نظم ''مکان''، تجزیہ

12.08 : خلاصہ

12.09 : فرہنگ

12.10 : نمونہ امتحانی سوالات

12.11 : حوالہ جاتی کتب

12.12 : اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

12.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ کیفی اعظمی کی نظم ''مکان'' کے مقصد ومطلب اور خصوصیات کے بارے میں تفصیل سے مطالعہ کریں گے۔ نظم کا مقصد ہے کہ آج کے اس ترقی یافتہ دَور میں جب دنیا نئے نئے تجربات اور تعمیرات سے گزر رہی ہے۔ سیاست دانوں کے ہزاروں وعدوں اور دعووں کے باوجود لاکھوں کروڑوں لوگ بے گھر ہیں۔ وہ فٹ پاتھ پر اور جھگی جھونپڑیوں میں حیوانوں سے بدتر زندگی گذارنے لے لئے مجبور ہیں۔ ہمیں اس کے متعلق سوچنا ہے کہ انسان اور کائنات کے بارے میں انسان ہی سوچتا آیا ہے اور یہی اس کی خوبی ہے۔

اکائی کے مطالعے سے آپ نہ صرف یہ کہ کیفی اعظمی کے مختصر حالات زندگی سے واقف ہوجائیں گے بلکہ ان کی شاعری کے مختلف ادوار کی خصوصیات سے بھی آپ کی واقفیت میں اضافہ ہوگا۔ نظم ''مکان'' کی تشریح سے آپ کو اس نظم کے موضوع اور فنی وشعری خوبیوں کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

12.02 تمہید

کیفی اعظمی نے نظم ''مکان'' مدن پورہ ممبئی کے فٹ پاتھ پر بیٹھ کر لکھی تھی۔ یہ نظم سیاسی اور سماجی منظر نامے کو ذہن میں رکھ کر لکھی گئی ہے۔ آج سے ہزروں برس پہلے جب انسان کے پاس رہنے کو مکان کا تصوّر بھی نہیں تھا اس وقت انسان کس طرح زندگی گزارتا تھا۔ وہ غاروں اور جنگلوں میں رہتا تھا لیکن جیسے جیسے اس نے ترقی کی راہوں پر قدم رکھا اسے روٹی کپڑے کے ساتھ جس چیز کی زیادہ ضرورت ہوئی وہ مکان ہے جس کا خواب انسان کی آنکھوں میں پلتا رہتا ہے۔ جسے بنانے لے لئے وہ بے پناہ محنت ومشقت کرتا ہے بہت جدوجہد اور کوشش کرتا ہے اور جب مکان بنالیتا ہے تو اسے سجاتا سنوارتا ہے اسی میں جینا مرنا چاہتا ہے۔ آج مکان کے بغیر جینے کا تصوّر نہیں کیا جاسکتا۔ آج جب ہم میلوں کا سفر لمحوں میں طے کررہے ہیں، مشینوں کے ذریعہ نئے نئے تجربے کررہے ہیں وہیں ہم میں انسانیت کم ہوتی جارہی ہے۔ ہمیں ان مفلس ونادار لوگوں کے بارے میں بھی سوچنا چاہیے جو تعمیرات کے اس درخشاں دَور میں فٹ پاتھ پر رہنے کو مجبور ہیں کیوں کہ ان کے پاس مکان نہیں ہے۔ نہ جانے کتنی حکومتیں آئیں، غریبوں اور مفلسوں سے اُنہیں گھر مکان دینے لے لئے وعدے کیے گئے اور جب سیاسی لیڈران اقتدار وحکومت میں آگئے تو سب بھول گئے اور غریبوں، ناداروں کی دلی حسرتیں دل میں ہی رہ گئیں۔ ان لے لئے فٹ پاتھ ہی ان کا گھر ہے ان کی جائیداد ہے۔ آگ برساتا آسمان ان کی چھت ہے اور تپتی زمین ان کا فرش۔

12.03 اطہر حُسین کیفی اعظمی کے حالاتِ زندگی

مشرقی یوپی کے اعظم گڑھ ضلع کی پھول پور تحصیل سے تقریباً ۶/۵ کلومیٹر کی دُوری پر ایک چھوٹا سا گاؤں مجواں ہے۔ مجواں کے ہی ایک زمین دار گھرانے میں ۱۹/جنوری ۱۹۱۹ء کو کیفی اعظمی کی پیدائش ہوئی۔ والد کا نام فتح حُسین اور والدہ کا نام کنیز فاطمہ تھا۔ والدین نے ان کا نام اطہر حسین رکھا اور اسی اطہر حسین نے آگے چل کر کیفی اعظمی کے نام سے ادبی دنیا میں بالعموم اور ترقی پسند شاعری میں بالخصوص بے پناہ شہرت حاصل کی۔ وہ بچپن سے ہی بہت سنجیدہ اور جذباتی تھے۔ بچپن میں عید کے دن نئے کپڑے اس لئے نہیں پہنتے تھے کہ ان کے گاؤں کے کسان بچوں کے پاس نئے کپڑے نہیں تھے۔ گھر میں ہی شعر وشاعری کا ماحول تھا۔ چوں کہ والد بہت باذوق آدمی تھے اس لئے اکثر گھر پر شاعروں کا مجمع لگا رہتا۔ محفلیں اور نشستیں ہوتیں۔ محرم میں مجلس، قصیدہ اور مرثیہ کا بھی اہتمام کیا جاتا۔ کیفی کے بھائیوں وغیرہ بھی شاعری کا شوق رکھتے تھے۔ اُنہیں وراثت میں شاعری کا فن ملا تھا۔ اس لئے ۸/برس کے عمر میں ہی اشعار کہنے لگے تھے۔ تقریباً گیارہ برس کی عمر میں مشاعرے میں پہلی دفعہ غزل پڑھی۔ اس غزل کا مطلع تھا:

اتنا نہ زندگی میں کسی کی خلل پڑے
ہنسنے سے ہوسکون نہ رونے سے کل پڑے

اس غزل نے مشاعرہ لوٹ لیا اور وہیں پر ان کے والد نے خوش ہوکر اُنہیں شاعرانہ نام کیفی سے نوازا۔ ابتدا میں عربی اور فارسی کی تعلیم گھر ہی حاصل کی اور جب اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا وقت آیا تو والدین نے فیصلہ کیا کہ اُنہیں جدید تعلیم کی بجائے دینی ومذہبی تعلیم دلائی جائے۔ اس غرض سے کیفی کا داخلہ لکھنؤ کے سب سے بڑے مدرسے سلطان المدارس میں کرادیا گیا مگر مدرسے کے حالات اُنہیں راس نہیں آئے۔ مولویوں اور مدرسوں کی بدعنوانی پر ان سے رہا نہیں گیا اور اُنہوں نے مدرسے کے نظام کے خلاف احتجاج شروع کردیا۔ یہ زمانہ تقریباً

۱۹۲۹ء/۳۰ کے آس پاس کا ہے۔اس دَوران وہ لکھنؤ سے کان پور چلے آئے تھے۔یہیں سے ان کا سیاسی شعور بیدار ہوا۔ملک اور سماج کی فکر نے ان کے سیاسی و انقلابی مزاج میں گرم جوشی پیدا کی اور عوام کے درد نے ان کے سماجی شعور کو نئی جلا بخشی۔اسی زمانے میں کیفیؔ نے نظم ''اٹھو دیکھو وہ آندھی آرہی ہے'' کہی تھی۔

کیفیؔ اعظمی دردمند اور حساس طبیعت کے انسان تھے اس لئے وہ بہت جلد لوگوں کی مصیبتوں، پریشانیوں، بھوک، افلاس، بے روزگاری، قوم کی بدحالی اور ملک کی بربادی سے متاثر ہوجاتے تھے، جس کا اظہار ان کی شاعری میں جابجا موجود ہے۔اسی زمانے میں روس میں انقلاب آچکا تھا۔وہ اس دوران ''قومی جنگ'' بڑے شوق سے پڑھا کرتے تھے جو مزدوروں کسانوں کی حمایت کرتا تھا۔چنانچہ وہ ''قومی جنگ'' کے ادارے میں اپنی نظمیں جو روس کی حمایت میں تھیں بھیجنے لگے یہ نظمیں بڑی پسند کی جاتیں۔ایک دن لکھنؤ کے ایک مشاعرے میں کیفیؔ اعظمی کی ملاقات سردار جعفری اور سجاد ظہیر سے ہوئی۔ان لوگوں نے کیفیؔ سے ممبئی چلنے کو کہا اور وہ گھر والوں کی مخالفت کے باوجود تیار ہو گئے اور ممبئی چلے آئے۔ یہاں کمیونسٹ پارٹی نے اُنہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور وہ پارٹی کے ہول ٹائمر ہوگئے۔یہیں سے اُنہوں نے شہرت کی سیڑھیوں پر چڑھنا شروع کردیا اور پارٹی نے ہی کیفیؔ اعظمی کی شاعری کا مجموعہ ''جھنکار'' ۱۹۴۴ء میں شائع کیا جو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔یہیں ان کی ملاقات شوکت جانم سے ہوئی اور گھر والوں کے اختلاف کے باوجود کیفیؔ نے ۲۳ رمئی ۱۹۴۷ء کو شوکت خانم سے شادی کرلی۔زندگی کا سفر خوش گواری کے ساتھ زندگی کی نرم و گرم صورتوں کے باوجود چلتا رہا کیوں کہ اس سفر میں ان کے ساتھ ان کی شریکِ حیات تھیں۔ممبئی میں وہ ''اپٹا'' سے وابستہ ہوگئے اور جلد ہی ان کی فعالیت، جدوجہد اور محنت کو دیکھتے ہوئے اُنہیں ''اپٹا'' کا صدر اور ''نیا ادب'' کا مدیر بنادیا گیا۔کیفیؔ نے اپٹا کے لئے بہت سے گیت اور ڈرامے لکھے۔

جھنکار کے بعد کیفیؔ اعظمی کا دوسرا مجموعہ ''آخر شب'' ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا۔پھر ایک طویل مدت کے بعد ۱۹۷۳ء میں مجموعہ ''آوارہ سجدے'' کی اشاعت ہوئی اور اسی برس کیفیؔ فالج کا شکار ہوگئے اور پھر اپنے گاؤں مجواں چلے آئے جہاں ان کے ساتھ شوکت کیفی بھی تھیں۔ اُنہیں اپنے گاؤں اور گاؤں کے لوگوں سے بے حد پیار تھا۔کیوں کہ یہ ان کی اپنی زمین تھی، اپنے لوگ تھے اور اب وہ مجواں کی ترقی کا خواب دیکھنے لگے۔۱۹۴۳ء سے ۱۹۷۳ء تک ان کی زندگی میں کافی اُتار چڑھاؤ آئے مگر کیفیؔ نے ہمت نہیں ہاری۔اسی بیچ ممبئی میں قیام کے دَوران فلم انڈسٹری سے منسلک ہوگئے اور فلم حقیقت، نونہال، ایک کے بعد ایک، ہیر رانجھا، ہنستے زخم وغیرہ کے لئے نغمے لکھے جو بہت مقبول ہوئے۔ ۱۹۷۴ء میں ان کے فلمی نغموں کا مجموعہ ''میری آواز سنو'' شائع ہوا، جس میں ان کے تقریباً ۲۴۰ رگانے شامل ہیں۔۱۹۸۳ء میں ابلیس کی مجلس شوریٰ چھپ کر آئی۔کیفیؔ اعظمی تقریباً ایک دہائی تک ممبئی سے نکلنے والے اخبار ''Bulitz'' میں طنزیہ کالم لکھتے رہے یہ ان کی نثری تخلیق تھی۔جو ۲۰۰۱ء میں ''نئے گلستاں'' کے نام سے شائع ہوئی۔کیفیؔ کے دو ڈرامے ''ہیر رانجھا'' اور ''زہرِ عشق'' بھی ہو چکے تھے، جس پر بعد کو فلم بنائی گئی۔

کیفیؔ کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے اُنہیں مختلف اعزازات سے نوازا گیا۔پیر کے تین تین فریکچر اور فالج کے باوجود وہ زندگی کی آخری سانس تک سماج کی، گاؤں کی ترقی کی کوشش کرتے رہے اور لکھتے رہے۔مجواں کی ترقی میں کیفی کا بہت بڑا رول رہا۔سڑک، اسکول، ہسپتال، ڈاک گھر وغیرہ سب اُنہیں کی دین ہے۔ان کا جسم کمزور ہوا مگر فکر ہمیشہ توانا رہی۔جسم سے ہار کے نتیجے میں ۱۰ رمئی ۲۰۰۲ء کو کیفیؔ اعظمی اپنے چاہنے والوں کو الوداع کہہ گئے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۱﴾ کیفی اعظمی کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟

﴿۲﴾ کیفی اعظمی کو لکھنؤ کے کس مدرسہ میں داخل کیا گیا؟

﴿۳﴾ کیفی کے فلمی نغموں کے مجموعے کا نام بتایئے۔

12.04 اطہر حُسین کیفی اعظمی کی نظم نگاری

کیفی اعظمی کی شادی میں زندگی کے تجربات کے ساتھ ساتھ اپنے حالات پر افسوس بھی ہے۔ وہ اپنے دَور کے ان شاعروں میں ہیں جنہوں نے اپنے زمانے کی مانگ کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ ان کی شاعری بڑے بڑے تجربوں سے گزرتی ہوئی ان کے انفرادی واجتماعی شعور کا نتیجہ ہے۔ یہ تجربے ان کے سماج کی دین ہیں جن سے چھن چھن کر ان کی شاعری باہر آئی ہے۔ ان کی شاعری میں خوب صورتی اور رنگینی کے ساتھ ساتھ تلخی، کرب، مایوسی، شکست اور ناکامی ہے۔ ان کے یہاں رومانیت کی چاشنی ہے، سیاست کی آنچ ہے اور انقلابی گھن گرج بھی۔ کیفی اعظمی کی شاعری کو ہم تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ان کی شاعری کا پہلا دَور رومانیت کا ہے جس میں عشقیہ جذبات سے پُر نظمیں کہی گئیں۔ دوسرا دَور احتجاج، سیاست اور انقلاب کا ہے، تو تیسرا دَور عوام کے دروبست کا ہے۔

﴿۱﴾ پہلا دَور: کیفی اعظمی کی رومانی شاعری

کیفی کی شاعری کا پہلا دَور رومانی شاعری ہے۔ کیفی کی عشقیہ و رومانی فکر صرف خیالی نہیں تھی وہ حقیقت تھی۔ کیفی حقیقت میں ایک سچے اور جمال پسند انسان تھے۔ ان کا جمالیاتی نقطۂ نظر محبوب کی زلف و رُخسار ہی نہیں بلکہ اس کا وہ حُسن ہے جو محبوب کی شخصیت سے جھلکتا ہے اور یہی حُسن کیفی کی شاعری میں اُجاگر ہے۔ کیفی کے پہلے مجموعے ''جھنکار'' کی نظمیں بانسری، شام، کہرے کا کھیت، معذرت، پہلا سلام، شباب، تصادم، منتیں وغیرہ کیفی کے رومانی مزاج کی ترجمانی کرتی ہیں۔ کیفی کی اس دَور کی شاعری بڑی نرم، مترنّم اور نغمگی سے بھرپور ہے۔ جذبے میں صداقت اور گرم جوشی ہے۔ رومانی نظموں میں اتنی بے ساختگی، روانی اور شگفتگی ہے کہ پڑھنے والا کیف وسُرور میں ڈوب جاتا ہے۔ کیفی کی شاعری کی نرمی اور شیرینی کا اندازہ درج ذیل مثالوں سے لگایا جاسکتا ہے۔

یہ جسم نازک، یہ نرم باہیں، حسین گردن، سڈول بازو
شگفتہ چہرہ، سلونی رنگت، گھنیرا جوڑا، سیاہ گیسو
نشیلی آنکھیں، رسیلی چتون، دراز پلکیں، مہین ابرو
تمام شوخی، تمام بجلی، تمام مستی، تمام جادو
ہزار جادو جگا رہی ہو
یہ خواب کیسا دکھا رہی ہو

کیفی اعظمی کی رومانی شاعری میں اثر پذیری کی وجہ ان کی زبان کی سادگی، جذبے کا خلوص، صداقت اور عشق کی پاکیزگی ہے۔ کیفی کی رومانی نظمیں پڑھنے والوں کو اپنی زندگی کا حصہ معلوم ہوتی ہیں۔ ان کی رومانی نظم ''کسی کی آواز سن کر'' کیفی کے پاکیزہ عشق، معصوم جذبے اور رومان کی ایک اہم مثال ہے:

یا بج رہی ہوں جھٹپٹے میں مندروں کی گھنٹیاں
یا منھ اندھیرے دور سے آتی ہوآوازاذاں
یا بند کردے جھینپ کر خلوت کی کوئی کھڑکیاں

اور بج رہی ہوں چوڑیاں
اے بنت مریم گنگنا
اے جانِ نغمہ گائے جا

﴿۲﴾ دوسرا دَور: کیفی اعظمی کی احتجاجی، سیاسی اور انقلابی شاعری

کیفی کی شاعری کا دوسرا دَور زمانے کی تلخی اور سماجی نابرابری کے خلاف غم وغصہ کا دَور ہے۔ کیفی اعظمی نے سماج کا درد محسوس کیا، اپنے ہم وطنوں کے لئے لڑائی لڑی اور اپنا حق حاصل کیا۔ اور اسی خیال کا اظہار اپنی شاعری میں کیا ہے۔ ان کی شاعری میں ظلم، تشدّد، قدامت پرستی وتنگ نظری کے خلاف احتجاج ہے۔ انقلاب، بغاوت اور احتجاج ان کی شاعری میں خون بن کر دَوڑتے ہیں اور نعرے بن کر سیاسی بدعنوانیوں کے خلاف آگے بڑھتے ہیں۔ اُنہوں نے سیاسی لیڈران کو للکارا بھی ہے، اُنہیں چیلنج کیا ہے اور اپنے ملک وقوم کے لوگوں کو بیدار کر کے محکم حوصلے کے ساتھ ان کی گندی سیاست کو خاک میں ملا دینے کی کوشش کی ہے۔ کیفی کی شاعری کے اُنہیں اوصاف نے اُنہیں ایک سیاسی، انقلابی واحتجاجی شاعر بنا دیا۔ اپنی ایک ایسی ہی نظم میں ظلم کا تختہ پلٹ دینے لے لئے اپنے کارواں کے ساتھ نکل پڑے ہیں۔ اب جتنی بھی آندھیاں آئیں، طوفان آئیں وہ پیچھے ہٹنے والے نہیں ہیں۔ ان کی یہ گرم جوشی ان کی نظم کو پُر وقار بناتی ہے۔

بتا دو قصر حکومت کے سب کمینوں کو
بچا سکیں تو بچا لیں شہ نشینوں کو
ترستے رہتے ہیں جو ہاتھ آستیں کے لئے
جلال میں وہ اُلٹ دیتے ہیں زمینوں کو

☆

کبھی آگے کبھی پیچھے کوئی رفتار ہے یہ
ہم کو رفتار کا آہنگ بدلنا ہوگا
یہ بھی جلنا کوئی جلنا ہے کہ شعلہ نہ دھواں
اب جلادیں گے زمانے کو جو جلنا ہوگا

☆

وہ کھیت کون اُجاڑے گا، کون لوٹے گا
اُگی ہوئی ہیں منڈیروں پہ جن کی شمشیریں

کیفی اعظمی نے نہ صرف مردانہ سماج کی حس کو بیدار کیا بلکہ عورت کو بھی انقلابی جدوجہد میں مرد کے شانہ بہ شانہ کھڑا کر دیا۔ وہ عورت کے استحصال، اس کی عظمت وعزت کی پامالی کے خلاف ہمیشہ آواز اُٹھاتے رہے۔ اور اُسے اپنے حق کے لئے لڑنے کا حوصلہ بخشتے رہے۔ اپنی نظم عورت میں وہ عورت کو احتجاج کا علم پکڑاتے ہوئے کہتے ہیں:

قلب ماحول میں لرزاں شررِ جنگ ہیں آج
حوصلے وقت کے اور زیست کے یک رنگ ہیں آج
آبگینوں میں تپاں ولولۂ سنگ ہیں آج

☆

جس میں جلتا ہوں اُسی آگ میں جلنا ہے تجھے
اُٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

کیفی اعظمی کی احتجاجی شاعری میں وہ جس علَم کو بلند کرتے ہیں وہ اشتراکیت کا سُرخ علم ہے، جو ترقی پسندوں نے اُٹھا رکھا ہے۔ اُنہیں یقین تھا کہ اس احتجاج وانقلاب سے سیاست کی ناپاک چالیں خاک میں مل جائیں گی اور ظلم کے بادل چھٹ جائیں گے اور ضرور ایک نیا سویرا ہوگا۔ کیفی کی شاعری ادب اور رومان کی سبزہ زار پگڈنڈیوں سے گزرتی ہوئی زندگی کے خارزاروں میں قدم رکھتی ہے اور پیادہ پا چلتی ہے۔

﴿۳﴾ تیسرا دَور: کیفی اعظمی کی سماجی وعوامی شاعری

کیفی کی شاعری کے تیسرے دور کو ہم انسانی دردمندی کا دور کہہ سکتے ہیں۔ کیفی کی شاعری کا اہم موضوع عوام ہیں۔ وہ عوام کی دھڑکن کو اپنے دل میں محسوس کرتے ہیں۔ عوام کے احساسات کو اپنے شعری لہجے میں ڈھالتے ہیں اور عوام کے غم وغصے، درد، محرومی اور احساس کو اپنی شاعری میں پیش کرتے ہیں۔ جو ان کی سماجی فکر کا حصہ ہیں۔ عوامی زندگی کی ساری ہلچل ان کے وجود میں اضطراب اور بے قراری بن کر اُتر جاتی ہے۔ وہ اپنے ملک وقوم کے لوگوں کے بارے میں سوچتے ہیں، ان کی بدحالی کو لے کر سوچتے ہی چلے جاتے ہیں اور یہی فکر یہی دُروں بینی ان کی شاعری میں درد بن کر اُبھرتی ہے۔ اس کی بہترین مثال ان کی نظم ''مکان'' ہے۔ اس کے علاوہ نظم ''انتساب'' میں کیفی اپنے ملک کے غریبوں محتاجوں اور افلاس زدہ مزدوروں کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر نظم کا ایک بند پیش ہے:

بھوک نے پیاس نے، افلاس نے پالا ہے ہمیں
کبھی بہکے ہیں تو فاقوں نے سنبھالا ہے ہمیں
جھونپڑے پھونک کے میداں میں نکالا ہے ہمیں

☆

آج ہر موڑ پر لکھیں گے کہانی اپنی
اپنی دھرتی میں سمو دیں گے جوانی اپنی

اس کے علاوہ ایک اور نظم میں قوم کی اور سماج کی بدحالی پر اظہار افسوس کرتے ہیں اور اپنی بدحالی کا احساس عوام کو دلاتے ہیں:

یہ تمہاری تھکی تھکی بھیڑیں
رات جن کو زمیں کے سینے پر
صبح ہوتے اُنڈیل دیتی ہے
منڈیوں ، دفتروں ، ملوں کی طرف
ہانک دیتی ، ڈھکیل دیتی ہے
راستے میں یہ رُک نہیں سکتیں
توڑ کے گھٹنے جھک نہیں سکتیں
ان سے تم کیا توقع رکھتے ہو
بھیڑیا ان کے ساتھ چلتا ہے

یہاں کیفی نے موجودہ نظام پر چوٹ کی ہے۔ یہاں بھیڑ سے بھیڑیا بننے کا استعارہ نظم کو معنویت بخشتا ہے۔ کیفی کی شاعری زندگی کی شاعری ہے۔ زندگی کی برہنہ سچائیوں کو پیش کرتی ہے۔ اور زمانے کو اپنے حق کے لئے لڑنے کی دعوت دیتی ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۴﴾ کیفی اعظمی کی شاعری کے کتنے ادوار ہیں؟

﴿۵﴾ کیفی کے پہلے مجموعہ کا نام بتائیے اور سنِ اشاعت لکھیے۔

﴿۶﴾ کیفی کی کسی مشہور نظم کا نام لکھیے۔

12.05 اطہر حُسین کیفی اعظمی کی نظم ''مکان''، متن

آج کی رات بہت گرم ہوا چلتی ہے
آج کی رات نہ فٹ پاتھ پہ نیند آئے گی
سب اٹھو، میں بھی اٹھوں، تم بھی اٹھو، تم بھی اٹھو
کوئی کھڑکی اسی دیوار میں کھل جائے گی

.....

یہ زمیں تب بھی نگل لینے پہ آمادہ تھی
پاؤں جب ٹوٹتی شاخوں سے اتارے ہم نے
ان مکانوں کو خبر ہے نہ مکینوں کو خبر
ان دنوں کی جو گپھاؤں میں گزارے ہم نے

.....

اپنی نس نس میں لیے محنت پیہم کی تھکن
بند آنکھوں میں اسی قصر کی تصویر لیے
دن پگھلتا ہے اسی طرح سروں پر اب تک
رات آنکھوں میں کھٹکتی ہے سیہ تیر لیے

12.06 اطہر حُسین کیفی اعظمی کی نظم ''مکان'' تشریح

پہلا بند: سماجی پس منظر میں کہی گئی اس نظم میں کیفی اعظمی نے فٹ پاتھ پر رہنے والے مزدوروں کی زندگی پر روشنی ڈالی ہے اور اس رات کا ذکر کیا ہے جب بہت تیز گرم ہوائیں چل رہی ہیں اور شاعر افسردہ ہے کہ اُنہیں یعنی غریبوں کو فٹ پاتھ پہ نیند نہیں آئے گی۔ وہ اشاروں میں کہنا چاہتا ہے کہ یہ ایک رات ہی کیا، ایسی ہزاروں راتوں کو یہ جاگتے ہیں یعنی لُو کے تھپیڑوں سے جھلستی زندگی جب دن بھر کی محنت ومشقت اور تھکن کے بعد رات کو فٹ پاتھ پر آرام کرنے کی غرض سے آتی ہے تو فٹ پاتھ کا فرش اتنا تپتا رہتا ہے کہ اس پر نیند آنا ممکن ہی نہیں اور گرم ہواؤں کے تھپیڑے چہرے کو جھلساتے رہتے ہیں۔ یہ سب مصیبتیں اس لئے ہیں کہ ان کے پاس رہنے کو گھر نہیں ہیں۔ نہ جانے کتنی حکومتیں آئیں، سیاسی لیڈران آئے مگر وعدہ کرنے اور کامیاب ہونے کے بعد ایسے غائب ہوئے کہ پھر پلٹ کر ان غریبوں کے حال پر نظر نہ ڈالی۔ شاعر اپنے ساتھیوں، ہم وطنوں کے دکھ درد میں شریک ہے۔ اسے شدید افسوس ہے کہ آج کی رات یہ دن بھر کے تھکے ہارے مزدور جن کی قسمت فٹ پاتھ پر جلتا جھلستا فرش ہے اُنہیں بھلا کس طرح اس پر نیند آئے گی۔ ایسے افسردہ ماحول میں شاعر اپنے ساتھیوں کو آس واُمید دلاتا ہے کہ تم سب مل کر ایک ساتھ اُٹھو، تم سب میری تحریک میں شامل ہو جاؤ۔ ہم سب مل کر آواز اُٹھائیں گے۔ نعرہ لگائیں گے۔ شاید ہماری آواز کسی سیاسی لیڈر تک پہنچ جائے، کچھ حد تک اس کی حِس بیدار ہو جائے اور وہ ہمارے لئے راحت کو کوئی کھڑکی کھول دے جس سے ہوا آسکے۔ شاید یہ سیاسی لوگ تمہاری تحریک، تمہاری آواز سے بیدار ہو جائیں اور تمہارے رہنے اور سونے کے لئے کسی ذاتی فرش کا انتظام کر دیں۔ تو یہ بڑا کام ہوگا۔

دوسرا بند: کھڑکی علامت ہے روشنی کی، اُمید وبیم کی۔ جب زندگی ایسی مشکلات سے گزر رہی ہو تب بھی اُمید کی روشنی انسان کو جینے پر، جدوجہد کرنے اور آگے بڑھنے پر آمادہ کرتی ہے۔ اس بند میں کیفی اپنے ساتھیوں کو تاریخ کے ان لمحوں میں لے جانا چاہتے ہیں جب انسان کے خواب وخیال میں مکان کا تصوّر بھی نہیں تھا۔ وہ صحرا بہ صحرا بھٹکتا تھا، پیڑوں پر، جنگلوں میں، گپھاؤں میں رہتا تھا۔ تب بھی ایسی ہی گرم ہوا چلتی تھی۔ جب انسانوں نے پیڑوں پر رہنا چھوڑ کر زمین پر قدم رکھا تب بھی تپتی زمین تنور کی مانند لگی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ بس نگل ہی جائے گی۔ اور آج بھی ایسا ہی حال ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ آج ہم ترقی کر چکے ہیں۔ آج ہم سائنس، کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور میڈیا کے دَور میں پہنچ چکے ہیں۔ ایسے ترقی یافتہ دَور میں جن کے پاس مکان نہیں وہ فٹ پاتھ پر جانوروں کی طرح زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔

اس نظم میں کیفی نے ممبئی کی بھاگتی دَوڑتی تیز گام زندگی کا ذکر کیا ہے جو ہندوستان کے چند بڑے شہروں میں شامل ہے۔ جو ملک کا بے حد ترقی یافتہ شہر ہے۔ سائنس میڈیا اور گلیمر کا مرکز ہے۔ ایسے شہر میں کچھ لوگ ہیں جو بڑی بڑی اونچی بلڈنگوں میں رہ رہے ہیں اور اسی شہر کا مزدور طبقہ فٹ پاتھ پر زندگی بسر کر رہا ہے۔ شاعر تاریخ کے دریچوں سے ماضی کی گہرائیوں میں جھانکتا ہے اور بتاتا ہے کہ آج ہم اپنی تاریخ اپنا

ماضی بھول چکے ہیں۔ آج کسی کو یہ معلوم نہیں کہ ہمیں نے یعنی حضرت انسان نے ہی گپھاؤں میں بھی زندگی گزاری ہے جہاں ہوا کا گزر بھی مشکل تھا۔ ہم نے ایسی جگہوں پر بھی زندگی بسر کی ہے۔ شاعر کچھ دیر لے لئے فٹ پاتھ پر رہنے والے اپنے ساتھیوں کو تاریخ کا آئینہ دکھا کر بہلانا چاہتا ہے۔

تیسرا بند: نظم کے اس بند میں کیفی اعظمی نے سماجی بدحالی کا نقشہ کھینچتے ہوئے سیاسی لیڈران کی بے نیازی و بدعنوانی کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اُنہیں افسوس ہے کہ یہ محنت کش جنہیں دن بھر کی کڑی مشقت کے بعد دو روٹی نصیب ہوتی ہیں۔ یہ اپنی نس نس میں اپنے ایک ایک عضو میں مسلسل محنت کی تھکن لیے اسی اُمید پر بیٹھے ہیں کہ ایک نہ ایک دن وہ بھی کسی مکان کے مالک ہوں گے۔ ان کی بند آنکھوں میں یہی خواب ہے جو ہر روز آنکھ کھلنے پر ٹوٹ جاتا ہے۔ ان کی اُمیدیں ان کے حسرتیں اور ارمان خاک میں مل چکے ہیں اور یہ اُمیدیں آج نہیں بندھائی گئی ہیں بلکہ برسوں کے وعدوں پر مرکوز ہیں جو ابھی تک پوری نہیں ہوئیں۔ ان مزدوروں کا دن بھی اسی طرح دھوپ کی شدت کو برداشت کر کے محنت مزدوری کرتے ہوئے گزر جاتا ہے اور رات کو بھی اُنہیں سکون کی نیند میسر نہیں۔ اس لئے کہ ان کی آنکھوں میں رات کالے تیر کی طرح چبھتی ہے کیوں کہ اُنہیں سونے کو نہیں ملتا۔ دن بھر کی تھکن اُتارنے کو کوئی مکان نہیں ملتا چوں کہ رات بھی کالی ہوتی ہے اور تیر بھی۔ تیر تو ویسے بھی زندگی کی روشنی کو بجھا دیتا ہے۔ اندھیرا کر دیتا ہے۔ اس لئے شاعر نے تیر کو رات کی سیاہی سے تشبیہ دی ہے۔ پوری نظم سماجی بدحالی اور سیاسی بدعنوانی کو خیال میں رکھ کر لکھی گئی ہے، جس میں مزدور زندگی کی نوحہ خوانی ہے، انسانی درد ہے، اُمیدیں ہیں، حسرتیں ہیں اور رات کی سیاہی ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۷﴾ کیفی اعظمی نے نظم ''مکان'' کہاں کہی تھی؟

﴿۸﴾ کیفی اعظمی کی یہ نظم کس نوعیت کی نظم ہے؟

﴿۹﴾ کیفی اعظمی کا مجموعہ ''آخر شب'' کب شائع ہوا؟

12.07 اطہر حُسین کیفی اعظمی کی نظم ''مکان'' تجزیہ

مذکورہ نظم میں شاعر فٹ پاتھ پر گزرنے والی غریبوں، مزدوروں کی زندگی پر روشنی ڈال رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ آج کی رات بہت گرم ہوا چل رہی ہے۔ بھلا ایسی شدید گرمی اور لُو میں ان دن بھر کے تھکے ہارے غریبوں کو کس طرح نیند آئے گی جو محنت و مزدوری کے بعد آرام کرنا چاہتے ہیں۔ اُنہیں رات کو بھی آرام میسر نہیں کیوں کہ ان کے پاس مکان نہیں ہے۔ اس لئے کیفی اپنے ساتھیوں کو نعرۂ احتجاج کی دعوت دے رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ اُٹھو اور میرے آواز میں آواز ملا کر سیاسی بدعنوانی کے خلاف نعرے لگاؤ تا کہ شاید ان پر تمہاری آواز کا اثر ہو جائے اور وہ تمہیں راحت پہنچانے کا خیال کرنے لگیں۔ یہ زمین اس وقت بھی اتنی ہی تپ رہی ہے جتنی کہ پہلے تپتی تھی اس وقت جب ہم نے پیڑ پر رہنا شروع کیا۔ آج کے لوگوں کو خبر نہیں ہے کہ ہم یعنی انسان گپھاؤں میں بھی رہ چکا ہے جب کہ وہاں ہوا کا کوئی گزر نہ تھا۔ ان کی نس نس میں محنت کی تھکن ہے اور آنکھوں میں مکان کا خواب ہے۔ ان کا دن اسی طرح تپتا، پگھلتا، بھاگ دوڑ کرتا اور جد جہد کرتا گزرتا ہے اور جب سکون سے سونے کو نہیں ملتا تو نیند آنکھوں میں تیر کی طرح کھٹکتی ہے چبھتی ہے۔ جس طرح تیر جسم کو چھیدتا ہے اسی طرح رات کو جب ان غریبوں کو گرمی اور لُو کے سبب سونے کو نہیں ملتا تو بے چینی و بے قراری کی رات ان کی آنکھوں میں تیر بن کر چبھتی ہے اور بے چین کیے رہتی ہے۔

12.08 خلاصہ

اطہر حسین کیفی ۱۹؍جنوری ۱۹۱۹ء کو ضلع اعظم گڑھ یوپی کے گاؤں مجواں میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام فتح حسین اور والدہ کا نام کنیز فاطمہ تھا۔ کیفی بچپن سے ہی حساس طبیعت کے انسان تھے۔ دوسروں کے دکھ درد سے جلد متاثر ہو جاتے تھے۔ یہی دردمند دل اس شاعری کی بنیاد بنا جس میں انسانی زندگی کے کتنے ہی مسائل کی عکاسی ملتی ہے۔ پہلا مجموعہ ''جھنکار'' دوسرا ''آخر شب'' اور تیسرا ''آوارہ سجدے'' کے نام سے شائع ہوا۔ کیفی نے فلموں کے لئے بھی نغمے لکھے اور ان کی فلمی شاعری کا مجموعہ ''میری آواز سنو'' کے نام سے شائع ہوا۔ ان کی اہم فلمیں ہیر رانجھا، حقیقت، نونہال اور ہنستے زخم وغیرہ ہیں۔ کیفی نے باوجود فالج کا شکار ہو جانے کے ایک بھرپور ادبی زندگی گزاری اور ۱۰؍مئی ۲۰۰۲ء کو ممبئی میں انتقال کیا۔

کیفی کی شاعری کو ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا دَور رومانیت کا رہا۔ اس دَور کی اہم نظمیں بانسری، شام، کہرے کا کھیت وغیرہ ہیں۔ دوسرا دَور احتجاجی، سیاسی اور انقلابی شاعری کا ہے۔ ان کی مشہور نظم ''عورت'' اسی دَور کی دین ہے۔ تیسرا دَور سماجی و عوامی شاعری کا ہے۔ اس دَور کی اہم ترین نظم ''مکان'' ہے جو شاملِ نصاب ہے اور اس کے تعلق سے آپ معلومات حاصل کر چکے ہیں۔ نظم کا مقصد یہ ہے کہ آج کے اس ترقی یافتہ دَور میں جب دنیا نئے نئے تجربات اور تعمیرات کے مراحل طے کر رہی ہے، سیاست دانوں کے ہزاروں وعدوں اور دعوؤں کے باوجود لاکھوں کروڑوں انسان بے گھر ہیں۔ وہ فٹ پاتھ پر اور جھگی جھونپڑیوں میں حیوانوں سے بدتر زندگی گزارنے کے لئے مجبور ہیں ہمیں ان کے متعلق سوچنا ہے کہ انسان اور کائنات کے بارے میں انسان ہی سوچتا آیا ہے اور یہی اس کی خوبی ہے۔

12.09 فرہنگ

پیہم	: لگاتار، مسلسل	قصر	: محل
سیہ	: کالا	گپھا	: غار
شاخوں	: ٹہنیوں	مکینوں	: مکان میں رہنے والے، مکین کی جمع

12.10 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درجِ ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰؍سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : کیفی اعظمی کے پہلے دَور کی شاعری پر روشنی ڈالیے

سوال نمبر۲ : کیفی اعظمی کی سماجی و عوامی شاعری پر اظہارِ خیال پیش کیجیے۔

سوال نمبر۳ : کیفی اعظمی کی نظم ''مکان'' کے پہلے بند کا مفہوم اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے۔

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰؍سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : کیفی اعظمی کی نظم ''مکان'' کا مجموعی تاثر تحریر کیجیے۔

سوال نمبر۲ : کیفی کی شاعرانہ خصوصیات پر تفصیل سے روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر۳ : کیفی اعظمی کے حالات زندگی اور ان کی شخصیت کا جائزہ لیجیے۔

12.11 حوالہ جاتی کتب

۱۔ ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری	از	ڈاکٹر یعقوب یاور
۲۔ تین ترقی پسند شاعر	از	پروفیسر علی احمد فاطمی
۳۔ کیفی اعظمی عکس اور جہت	از	شاہد ماہلی
۴۔ کیفیات	از	(کلیات) کیفی اعظمی

12.12 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ کیفی اعظمی کی پیدائش ۱۹ر جنوری ۱۹۱۹ء کو ضلع اعظم گڑھ یوپی کے گاؤں مجواں اعظم گڑھ میں ہوئی۔

﴿۲﴾ مدرسہ سلطان المدارس میں داخل کیا گیا۔

﴿۳﴾ ''میری آواز سنو''

﴿۴﴾ کیفی کی شاعری کے تین دَور ہیں

﴿۵﴾ کیفی کا پہلا مجموعہ ''جھنکار'' ہے جو ۱۹۴۳ء میں ہوا۔

﴿۶﴾ کیفی کی مشہور نظم ''عورت'' ہے۔

﴿۷﴾ کیفی نے نظم ''مکان'' مدن پورہ ممبئی کے فٹ پاتھ پر بیٹھ کر کہی تھی۔

﴿۸﴾ کیفی کی یہ نظم سماجی و سیاسی نوعیت کی ہے۔

﴿۹﴾ کیفی کا مجموعہ ''آخر شب'' ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا۔

اکائی 13 : عبدالحئی ساؔحر لدھیانوی (خون پھر خون ہے)

ساخت

13.01 : اغراض ومقاصد
13.02 : تمہید
13.03 : عبدالحی ساؔحر لدھیانوی کے حالاتِ زندگی
13.04 : عبدالحی ساؔحر لدھیانوی کی نظم نگاری
13.05 : عبدالحی ساؔحر لدھیانوی کی نظم ''خون پھر خون ہے'' متن
13.06 : عبدالحی ساؔحر لدھیانوی کی نظم ''خون پھر خون ہے'' تشریح
13.07 : عبدالحی ساؔحر لدھیانوی کی نظم ''خون پھر خون ہے'' تجزیہ
13.08 : خلاصہ
13.09 : فرہنگ
13.10 : نمونہ امتحانی سوالات
13.11 : حوالہ جاتی کتب
13.12 : اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

13.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ ساؔحر لدھیانوی کی حیات، اُن کی شاعرانہ خصوصیات اور اُن کی نظم ''خون پھر خون ہے'' کے مطلب ومقصد اور خصوصیات کے بارے میں تفصیل سے مطالعہ کریں گے۔ اس نظم کا مقصد ہے کہ کوئی بھی ظلم زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہتا قتل کتنا ہی چھپا کر کیا جائے اس کا سراغ کہیں نہ کہیں سے مل ہی جاتا ہے کیوں کہ خون خود آواز دیتا ہے اور انسانوں کا ہاتھ، مظلوموں کا ہاتھ قاتل یا مجرم کے گریبان تک پہنچ جاتا ہے۔ ساؔحر نے یہ نظم لومبا کی یاد میں کہی تھی جس کے متعلق پنڈت جواہر لال نہرو کا خیال تھا کہ:

''ایک مقتول لومبا ایک زندہ لومبا سے زیادہ طاقتور رہتا ہے۔''

ساؔحر نے پنڈت نہرو کے اس خیال کو اپنی نظم کے عنوان کے ساتھ لکھ دیا ہے۔ اس خیال سے بھی شاعر کا مقصد واضح ہو جاتا ہے۔

13.02 تمہید

نظم ''خون پھر خون ہے'' ساحر کی سیاسی وانقلابی نظم ہے جس میں شاعر کا مطلب ہے کہ ظلم آخر ظلم ہوتا ہے اور ظالم آخر ظالم......ظالم جس کا کوئی مذہب، کوئی سماج ومعاشرہ اور کوئی ملک نہیں ہوتا۔ جب کہ مظلوم وہ ہے جس کا اپنا ملک ہوتا ہے، سماج ومعاشرہ ہوتا ہے، گھر خاندان ہوتا ہے، جو ملک اور سماج کے قوانین، رسم ورواج کو ملحوظ رکھ کر جیتا ہے۔

خدمتِ خلق اور انسانی درد کی پاس داری اس کا خاص نصب العین ہوتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا مذہب انسانیت ہوتا ہے۔ انسانیت کے لئے وہ جیتا ہے اور انسانوں کے حق لے لئے آواز بھی اُٹھاتا ہے۔ وہ زندگی پرسکون طریقے سے گزارنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ جب کہ ظالم فتنہ وفساد کو اپنی زندگی کا حاصل سمجھتا ہے اور اسی میں جینے مرنے کا قائل ہوتا ہے لیکن ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب مظلوموں کی دَبی ہوئی آواز نعرہ بن کر اُبھرتی ہے، انقلاب آتا ہے اور جمہوریت سے ٹکراؤ میں ظلم وستم کی شکست ہوتی ہے کیوں کہ عوام کے محکم ارادوں کے سامنے ظلم کی کوئی اوقات نہیں رہ جاتی اور ظلم کا ختم ہونا ضروری ہو جاتا ہے۔

13.03 عبدالحی ساحؔر لدھیانوی کے حالاتِ زندگی

ساحؔر لدھیانوی کی پیدائش ۸/ مارچ ۱۹۲۱ء کو لدھیانہ کے ایک جاگیر دار گھرانے میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام چودھری فضل محمد تھا۔ اور والدہ کا نام سردار بیگم۔ والد نے ساحر کا نام عبدالحئ رکھا۔ کسی بات کو لے کر ان کے والدین میں ناچاقی ہوگئی تھی اس لئے ساحر کی والدہ انہیں لے کر اپنے بھائیوں کے گھر چلی آئی تھیں۔ ساحؔر نے ابتدائی تعلیم مالوہ خالصہ اسکول میں حاصل کی۔ اسکول کے دنوں سے ہی لدھیانہ کے اہلِ ذوق کی صحبت کے زیر اثر شعر وشاعری کا شوق ہو گیا۔ لہٰذا ۱۹۳۷ء میں میٹرک کا امتحان دینے کے بعد اور نتیجہ نکلنے سے قبل جب قدرے فرصت تھی انہیں دنوں پہلا شعر کہا۔ انہیں دنوں انہیں اپنے شاعرانہ نام کی تلاش ہوئی۔ اقبال کی شاعری کا مطالعہ کر رہے تھے کہ ان کی نظر اقبال کے ایسے شعر پر پڑی جس میں لفظ ''ساحر'' استعمال ہوا تھا بس یہ نام پسند آیا اور وہ جلد ہی عبدالحئ سے ساحر ہو گئے۔

۱۹۳۹ء میں ساحؔر نے گورنمنٹ کالج لدھیانہ میں داخلہ لیا۔ یہاں وہ یونین سوسائٹی کے صدر رہے اور اسٹوڈینٹ فیڈریشن سے بھی وابستہ رہے۔ ساحؔر لدھیانوی کو سیاست سے کافی دل چسپی تھی اور اسی دل چسپی نے ان کی سیاسی سرگرمیوں کو اُبھارا اور بی.اے کے آخری سال میں انگریز حکام کی ناراضی کے سبب ساحؔر کو کالج چھوڑنا پڑا۔ اس کالج کی فضا نے انہیں ایک خوب صورت رومانی وانقلابی شاعر بنا دیا جس کے نتیجے میں ان کی شاعری کا پہلا مجموعہ ''تلخیاں'' ۱۹۴۴ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اس سرزمین سے ساحؔر کو جو تجربے ملے وہ ان کی شخصیت اور شاعری کا حصہ بنے۔

لدھیانہ کالج سے نکل کر ساحر نے دیال سنگھ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ یہاں ان کے سیاسی شعور، محنت، قابلیت وصلاحیت کی بنا پر انہیں اسٹوڈنٹ فیڈریشن کا صدر منتخب کیا گیا۔ ساحر نے فیڈریشن کے تئیں اپنی ذمہ داری بخوبی انجام دی لیکن یہاں بھی ان کو سیاسی گرم جوشی کے سبب انگریز حکومت نے کالج چھوڑنے پر مجبور کر دیا اور وہ اگلے ہی برس اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے اپنی تعلیم برابر جاری رکھنے کی کوشش کی مگر ناکامی ہی ہاتھ آئی۔ اس کے بعد انہوں نے اپنا سارا رجحان ادبی وسیاسی کاموں میں لگا دیا۔

''تلخیاں'' کی اشاعت سے ساحؔر نوجوان شاعر کی حیثیت سے اردو شاعری کی دنیا میں اپنی پہچان بنا چکے تھے۔ اس کے بعد ان کا صحافتی سلسلہ شروع ہوا تو ساحر نے ''ادبِ لطیف''، ''شاہ کار''، ''سویرا'' اور ''شاہراہ'' کی ادارت کی۔ ساحر کے ذہن میں شروع سے ہی داخلی طور پر ترقی پسند نظریات کارفرما تھے۔ اس لئے وہ ترقی پسند مصنّفین کی انجمن سے وابستہ ہو گئے اور ان کا شمار اشتراکی وترقی پسند شعرا میں ہونے لگا تھا۔ ۱۹۴۵ء میں حیدرآباد میں ترقی پسند مصنّفین کی ایک کانفرنس ہوئی جس میں انہوں نے ''اردو کی انقلابی شاعری'' کے عنوان سے اپنا مضمون پڑھا۔ حیدرآباد سے واپسی پر سجاد ظہیر، کرشن چندر، مجاز، کیفی اعظمی اور سردار جعفری وغیرہ انہیں ممبئی لے گئے جہاں انہیں فلمی دنیا میں کافی

مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ لہٰذا وہ ممبئی میں زیادہ دنوں تک نہ ٹھہر سکے۔ ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم ہوئی اور ساحر اپنی والدہ کی تلاش میں لاہور پہنچے جو رفیوجی کیمپ میں پاکستان چلی گئی تھیں۔ وہاں قیام کے دوران انہوں نے دوماہی رسالہ ''سویرا'' کی ادارت کی لیکن ناگزیر حالات کے تحت وہ پھر ہندوستان چلے آئے۔

۱۹۴۸ء میں انہوں نے دہلی میں ماہ نامہ ''شاہراہ'' کا اجرا کیا لیکن کچھ ہی دنوں بعد وہ اپنے ایک دوست کو اس رسالے کا ایڈیٹر بنا کر الگ ہو گئے اور رسالہ ''پریت لڑی'' کی ادارت کرنے لگے مگر یہاں پر بھی زیادہ دنوں تک کام نہ کر سکے کیوں کہ اب صحافت سے بھی ان کی دل چسپی کم ہو چکی تھی۔ ۱۹۴۹ء میں دوبارہ ممبئی آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ کافی دنوں بے روزگار و پریشان رہے مگر خود اعتمادی نے ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔ ان کی جدوجہد اور محنت کو دیکھتے ہوئے ایس. ڈی. برمن نے ان کی مدد کی تو ساحؔر نے فلمی دنیا میں اپنی جگہ بنائی۔ ساحر نے فلم ''بازی'' لے لئے گیت لکھے جو کافی مقبول ہوئے۔ فلمی گیتوں کو ادبی معیار دینے میں ساحؔر کا اہم رول رہا ہے۔ ان کے گیتوں کی مقبولیت اور فلمی نغموں کا معیار دیکھتے ہوئے انہیں فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کا صدر منتخب کیا گیا۔

۱۹۵۵ء میں ان کی طویل نظم ''پرچھائیاں'' منظر عام پر آئی۔ اَمنِ عالم کے موضوع پر لکھی گئی یہ نظم بہت مشہور ہوئی۔ ساحؔر کا ادبی سفر رَواں دَواں رہا اور ۱۹۷۱ء میں ان کا تیسرا مجموعہ ''آؤ کہ کوئی خواب بنیں'' شائع ہوا۔ اس مجموعے نے بھی خوب شہرت حاصل کی جس میں ساحؔر نے عوام کے سوئے ہوئے جذبات و خیالات کو اپنی رومانی و انقلابی شاعری کے ذریعے جگایا۔ ساحؔر ان چند شعرا میں ہیں جنہوں نے فلمی نغمہ نگاری کو بھی زندگی کے اُتار چڑھاؤ سے روشناس کرایا اور ان کے چوتھے مجموعے ''گاتا جائے بنجارہ'' کی اشاعت ہوئی۔ ساحؔر کی ادبی و فنی صلاحیتوں کی بنا پر انہیں مختلف اعزازات سے بھی نوازا گیا۔ ۱۹۷۵ء میں ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا یہ ساحؔر کے لئے بڑا حادثہ تھا۔ وہ اس صدمے کو برداشت نہ کر سکے اور دل کی بیماری نے آخر کام تمام کیا۔ ۲۵/اکتوبر ۱۹۸۰ء کو ساحؔر کا انتقال ہو گیا۔

ساحؔر لدھیانوی کی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو ان کی ساری زندگی محرومیوں سے دوچار نظر آئے گی، جن سے تمام عمر ان کی شخصیت متاثر ہوتی رہی۔ بچپن میں باپ کی شفقت سے محرومی، عشق کی ناکامیاں اور پھر شریکِ حیات کی کمی غرض یہ کہ ساحؔر کی زندگی کا محاسبہ کیا جائے تو ایک کے بعد ایک محرومیاں کھڑی نظر آئیں گی۔ وہ ایک حسّاس طبیعت کے انسان تھے۔ انہیں انسانیت کی اعلیٰ قدروں سے پیار تھا۔ وہ سماج و معاشرے سے ٹھکرائے لوگوں کا درد اپنے سینے میں محسوس کرتے اور یہی احساس ان کے اشعار کے قالب میں ڈھل جاتا ہے۔ کیوں کہ یہی ان کی شاعری کا اصل مقصد تھا اور شاعری کا جوہر بھی۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۱﴾ نظم ''خون پھر خون ہے'' ساحر نے کس کی یاد میں کہی؟

﴿۲﴾ ساحؔر لدھیانوی کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟

﴿۳﴾ ساحؔر کے مجموعے ''تلخیاں'' کا سن اشاعت لکھیے۔

﴿۴﴾ ساحؔر نے ابتدائی تعلیم کہاں حاصل کی؟

﴿۵﴾ ساحؔر کو گورنمنٹ کالج لدھیانہ سے کیوں نکال دیا گیا؟

﴿۶﴾ ساحؔر کے مجموعہ ''آؤ کہ کوئی خواب بنیں'' کا سن اشاعت لکھیے۔

13.04 عبدالحی ساحرؔ لدھیانوی کی نظم نگاری

ساحرؔ کی شاعرانہ خصوصیات کے بارے میں ہم ان کی نظمیہ شاعری کے حوالے سے باتیں کریں گے کیوں کہ وہ اصلاً نظم کے شاعر ہیں۔ ان کی بیش تر نظمیں ان کی طالب علمی اور نوجوانی کے جوش وخروش کا نتیجہ ہیں جو ایک خاص عمر کی دین ہوتے ہیں جن میں ان کے معاشقوں کی جھلک ہے اور ملک وسماج کا دَرد بھی۔ ساحرؔ کی زندگی کے حالات وحادثات نے ہمیشہ ان کا پیچھا کیا جوان کے اشعار میں ڈھل گئے۔

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

ساحر کی شاعری میں عصری آگہی، انسانی درد اور سیاسی وسماجی شعور سبھی عناصر موجود ہیں لیکن ان کی شاعرانہ خصوصیات کا جائزہ لینے کے لئے ضروری ہے کہ ہم ساحر کی شاعری کو مختلف حصوں میں تقسیم کر دیں۔

﴿۱﴾ ساحرؔ لدھیانوی کی رومانی شاعری

ساحرؔ کے یہاں رومانیت کی نرم ونازک شیریں آواز ساحرؔ کے مجموعے ''تلخیاں'' کی مقبولیت کا سبب بن گئی۔ ساحرؔ کے یہاں محبت کی کھلتی کلیاں ہیں جو پھول بنیں مگر ان پھولوں سے لدی شاخوں میں کانٹے بھی ہیں، جو اکثر مطالعے کے دوران چبھتے رہتے ہیں۔ ساحرؔ کی نظم کا عنوان ''ردِعمل'' ہے جو ساحرؔ کی اسی خصوصیت کو ظاہر کرتی ہے۔

چند کلیاں نشاط کی چن کر مدتوں محوِ یاس رہتا ہوں
تیرا ملنا خوشی کی بات سہی تجھ سے مل کر اُداس رہتا ہوں

ساحرؔ کے مجموعۂ کلام تلخیاں کی ابتدا اسی نظم سے ہوتی ہے۔ ساحرؔ کی رومانیت میں ان کے پاکیزہ جذبات وتصوّرات نے فکر کی معراج کو چھولیا ہے۔ ان کے یہاں خواب وخیال نہ صرف ذہنی ووقتی لطف لے لئے ہوتے ہیں بلکہ آگے بڑھنے کا حوصلہ بخشتے ہیں۔ کیوں کہ زندگی میں اگر خواب نہ ہوں تو زندگی بے رنگ وبے مقصد ہو جائے۔ یہ ضروری بھی نہیں کہ ہر خواب کی تعبیر پوری ہو لیکن فکر وخیال سے زندگی جینے کا مقصد حاصل ہوتا ہے اور رومانیت میں خواب وخیال پر بڑا زور بھی دیا جاتا ہے۔ اس لئے ساحرؔ کی رومانی نظمیں سماج کو نئے نئے خواب بننے کی دعوت دیتی ہیں۔

آؤ کہ کوئی خواب بنیں کل کے واسطے
ورنہ یہ رات آج کے سنگین دَور کی
ڈس لے گی جان ودل کو کچھ ایسے کہ جان ودل
تا عمر پھر نہ کوئی حسیں خواب بن سکے

یہ بند ساحرؔ کی نظم ''آؤ کہ کوئی خواب بنیں'' سے ماخوذ ہے۔ یہ جاگتی آنکھوں کے خواب ہیں جو زمانے کو بدل دینے کے متمنی ہیں۔ ساحرؔ اپنی قوم اور ملک کے لوگوں کو بیدار کرنے کی کوشش میں ہیں۔

﴿۲﴾ ساحرؔ لدھیانوی کی احتجاجی شاعری

ساحرؔ کا احتجاج کہیں عشق کی ناہم وَاری لے لئے تھا کہیں سیاسی وسماجی بدعنوانی لے لئے۔ کہیں عورت کے حق کے لئے تو کہیں ملک کی آزادی کے لئے۔ ان کی احتجاجی نظمیں تہذیبی قدروں کو برقرار رکھتے ہوئے آگے بڑھتی ہیں۔ ساحرؔ کے احتجاج کا سفر جوان کے اپنے خاندانی گھر یعنی زمین داروں کی بے جا حرکتوں سے شروع ہوا تھا وہ ملک وقوم کے رہنزوں تک پہنچ گیا۔ جہاں انہوں نے شہنشاہوں کو بھی نہیں بخشا۔ نظم ''تاج محل'' میں ساحرؔ نے شہنشاہ کے جذبات اور ''تاج محل'' کے حُسن پر غور نہیں کیا بلکہ ان ہاتھوں کی فن کاری پر لوگوں کی توجہ دلائی جنہوں نے تاج محل کو سجایا، سنوارا اور حُسنِ جاوداں بخشا تھا۔ مثال کے طور پر نظم کا بند ملاحظہ کیجیے:

تاج تیرے لئے اِک مظہر الفت ہی سہی
تجھ کو اس وادیِ رنگیں سے عقیدت ہی سہی
میری محبوب! کہیں اور ملا کر مجھ سے

.....

بزم شاہی میں غریبوں کا گزر کیا معنیٰ؟
ثبت جس راہ پہ ہوں سطوتِ شاہی کے نشاں
اس پہ اُلفت بھری روحوں کا سفر کیا معنیٰ؟

.....

میری محبوب! انہیں بھی تو محبت ہوگی
جن کی صنّاعی نے بخشی ہے اسے شکلِ جمیل
اُن کے پیاروں کے مقابر رہے بے نام ونمود
آج تک اُن پہ جلائی نہ کسی نے قندیل

ساحرؔ کی یہ نظم ان کے اشتراکی نظریہ کی دین ہے۔ سماج اور سیاست سے مخالفت کرتا ہوا ساحرؔ کے احتجاج کا سفر جنگ وجدل کی طرف بڑھتا ہے۔ ساحرؔ نے جنگ کو انسانیت اور تہذیب کا دشمن قرار دیا ہے۔ چوں کہ جنگ سے جان و مال کا نقصان ہوتا ہے اور کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ اپنی نظم ''اے شریف انسانو!'' میں ساحر جنگ کے خلاف اس طرح احتجاج کرتے ہیں۔

جنگ تو خود ہی ایک مسئلہ ہے جنگ کیا مسئلوں کا حل دے گی
آگ اور خون آج بخشے گی بھوک اور احتیاج کل دے گی

﴿۳﴾ ساحرؔ لدھیانوی کی سیاسی وانقلابی شاعری

ساحرؔ نے جس وقت سیاسی وانقلابی نظمیں کہیں ان کے ذہن میں ملک وسماج کے حالات کے سبب بے قراری تھی۔ ان کی سیاسی نظموں میں کہیں مایوسی، غم اور افسوس ہے تو کہیں اُمید کی ایک کرن بھی ہے جسے ترقی پسند شاعری میں رجائیت کا عنصر کہا جاتا ہے۔ چوں کہ ترقی

پسند شاعر مایوس نہیں ہوتا وہ اپنی جدوجہد کے درمیان کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیتا ہے اس لئے اس کے یہاں اُمید کا چراغ کبھی بجھتا نہیں روشن رہتا ہے۔ ساحؔر کی سیاسی و انقلابی نظمیں ان کے داخلی احساسات اور خارجی حالات کا نتیجہ ہیں۔ انہوں نے دشمنوں یعنی انگریزوں کے ہاتھوں اپنے وطن کے لٹنے کا جو منظر دیکھا اسے اپنی شاعری کے ذریعے پیش کیا۔ ساحر نے اپنی نظم ''اجنبی محافظ'' میں انگریزوں کے ظلم وستم کی جو تصویر پیش کی ہے وہ ہندوستانیوں کی بدحالی و بے چارگی اور مفلسی کی داستان ہے۔

اجنبی دیس کے مضبوط گرانڈیل جواں
اونچے ہوٹل کے درِ خاص پہ استادہ ہیں
اور نیچے مرے مجبور وطن کی گلیاں
جن میں آوارہ پھرا کرتے ہیں بھوکوں کے ہجوم
اسی ہوٹل کے قریب
ٹکٹکی باندھ کے تکتے ہوئے اوپر کی طرف
منتظر بیٹھے ہیں اس ساعتِ نایاب کہ جب
بوٹ کی نوک سے نیچے پھینکے
اجنبی دیس کے بےفکر جوانوں کا گروہ
کوئی سکہ، کوئی سگرٹ، کوئی کیک
یا ڈبل روٹی کے جھوٹے ٹکڑے

ساحر کی شاعری میں جہاں غم وغصہ اور مایوسی ہے، وہیں آزادی حاصل کرنے لے لئے کچھ اُمیدیں بھی ہیں کچھ خواب ہیں کہ ہم اپنی جدوجہد سے، اپنی محنت اور مضبوط ومحکم ارادوں سے ایک نہ ایک دن آزادی حاصل کرلیں گے۔

ساحر نے ایک شعر میں اسی خیال کا اظہار کیا ہے:

ایک نیا سورج چمکا ہے، ایک انوکھی ضو باری ہے
ختم ہوئی افراد کی شاہی اب جمہور کی سالاری ہے

اس کے علاوہ ساحؔر کی طویل نظم ''پرچھائیاں'' میں یہ تمام خصوصیات جن کا اس اکائی میں ذکر ہوا ہے یکجا نظر آئیں گی۔ ''پرچھائیاں'' تیسری جنگِ عظیم کے پس منظر میں لکھی گئی تھی جس کا موضوع اَمنِ عالم تھا۔ اس میں رومانیت بھی ہے سیاست بھی۔ احتجاج بھی اور انقلاب بھی۔ ایک سو چوراسی ۱۸۴ مصرعوں کی یہ نظم کہانی کی تکنیک لیے ہوئے ہے۔

﴿۴﴾ ساحؔر لدھیانوی کی شاعری میں عورت کا مقام

ساحر کی نظموں میں جہاں رومانیت اور احتجاج کی سرد وگرم کیفیت ہے وہیں عورت کی عظمت کا احترام بھی ہے۔ ساحر کی شاعری میں عورت حور یا پری نہیں بلکہ خالص ہندوستانی لڑکی ہے جو کہیں کسان کی جھوپڑی میں جنم لیتی ہے، کہیں جہیز لے لئے جلائی جاتی ہے تو کہیں

مجبوریوں کے سبب طوائف بنادی جاتی ہے۔ وہ کہیں زمانے کے ظلم کا شکار ہے، کہیں مفلسی کا، تو کہیں مردانہ سماج کا.....ساحرؔ کی ہم دَردی ایسی ہی مظلوم و مجبور عورت سے ہے جس کا کہیں نہ کہیں استحصال ہو رہا ہے۔ ساحرؔ اپنی ایک نظم میں عورت کی اسی حالت پر افسوس کرتے ہیں۔

نکلی ہے بنگلے کے دَر سے
اک مفلس دہقان کی بیٹی
افسردہ مرجھائی ہوئی سی
جسم کے دُکھتے جوڑ دباتی
آنچل سے سینے کو چھپاتی
مٹھی میں اک نوٹ دبائے
جشن مناؤ سالِ نو کے

ساحرؔ نظم ''چکلے'' میں عورت کی عصمت و عزت کو تار تار ہوتے دیکھ کر چیخ اُٹھتے ہیں اور اپنی للکار کے ساتھ ''ثناخوانِ تقدیس مشرق'' کو آواز دیتے ہیں۔

مدد چاہتی ہے یہ حوّا کی بیٹی
یشودھا کی ہم جنس رادھا کی بیٹی
پیمبر کی اُمّت زُلیخا کی بیٹی
ثناخوانِ تقدیس مشرق کہاں ہیں؟

ساحرؔ نے ایسے بے رحم حالات کو بدلنا چاہا ہے۔ وہ سماج میں انقلاب لانا چاہتے ہیں تاکہ زمانہ عورت کو ہوس اور گندی نگاہوں سے نہ دیکھے۔ عورت کی عزت سے واقف ہو سکے۔ کیوں کہ ایک عورت اپنی ذات میں بہت سے رشتے رکھتی ہے اور وہ ماں ہے، بیٹی ہے، بہن ہے اور بیوی ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۷﴾ ساحر کی نظم پرچھائیاں کا موضوع کیا ہے؟ اور یہ نظم کس پس منظر میں لکھی گئی؟

﴿۸﴾ ساحر کی نظم ''تاج محل'' کس نظریہ کی دین ہے؟

﴿۹﴾ ساحر کی کسی انقلابی و سیاسی نظم کا نام لکھیے۔

13.05 عبدالحی ساحرؔ لدھیانوی کی نظم ''خون پھر خون ہے'' متن

ظلم پھر ظلم ہے ، بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے
خون پھر خون ہے ، ٹپکے گا تو جم جائے گا

.....

خاکِ صحرا پہ جمے یا کفِ قاتل پہ جمے
فرقِ انصاف پہ یا پائے سلاسل پہ جمے
تیغِ بیداد پہ یا لاشۂ بسمل پہ جمے
خون پھر خون ہے، ٹپکے گا تو جم جائے گا

.....

لاکھ بیٹھے کوئی چھپ چھپ کے کمیں گاہوں میں
خون خود دیتا ہے جلّادوں کے مسکن کا سراغ
سازشیں لاکھ اُڑھاتی رہیں ظلمت کی نقاب
لے کے ہر بوند نکلتی ہے ہتھیلی پہ چراغ

.....

ظلم کی قسمتِ ناکارہ و رُسوا سے کہو!
جبر کی حکمتِ پرکار کی ایما سے کہو!
محملِ مجلسِ اقوام کی لیلا سے کہو!

.....

خون دیوانہ ہے ، دامن پہ لپک سکتا ہے
شعلۂ تند ہے ، خرمن پہ لپک سکتا ہے

.....

تم نے جس خون کو مقتل میں دبانا چاہا
آج وہ کوچہ و بازار میں آ نکلا ہے
کہیں شعلہ ، کہیں نعرہ ، کہیں پتھر بن کر

13.06 عبدالحی ساحرلدھیانوی کی نظم ''خون پھر خون ہے'' تشریح

ظلم پھر ظلم ہے.....جم جائے گا

نظم ''خون پھر خون ہے'' میں شاعر کا خیال ہے کہ ظلم آخر ظلم ہے جسے اک نہ اک دن ختم ہونا ہی پڑتا ہے اور اسے مظلوموں کے محکم ارادے اور احتجاج کا سامنا کرنا ہی ہوتا ہے۔ کیوں کہ ہر چیز کا عروج کے ساتھ زوال لازمی ہے۔ ظلم بھی جب حد سے بڑھ جاتا ہے تو انقلاب کی آندھی اسے اُڑا لے جاتی ہے۔ مظلوموں کے خون میں اتنا جوش وخروش آ گیا ہے کہ وہ جہاں بھی گرے گا جم جائے گا، اپنا نشان چھوڑ جائے گا۔ پھر وہ چاہے جنگل کی خاک پر جمے، انصاف کے ترازو پر جمے، قاتل کی ہتھیلی پر جمے یا پھر قدموں کے نیچے۔ کہیں نہ کہیں اپنے دشمن کا پتہ

بتانے کے لئے وہ اپنا نشان ضرور چھوڑ جاتا ہے۔ چاہے وہ ظالم کی یا قاتل کی تلوار ہی کیوں نہ ہو یا پھر مقتول کی مظلوم کی لاش ہو۔ خون آخر خون ہے جہاں بھی ٹپکے گا جم جائے گا۔ اور اپنے دشمن کا سراغ لگانے میں مدد کرے گا۔

لاکھ بیٹھے.....ہتھیلی پہ چراغ

اس بند میں شاعر کا اشارہ دشمن کی جانب ہے۔ کوئی لاکھ چھپ کر پوشیدہ طریقہ سے گھات لگا کر بیٹھے۔ خون جلاّدوں کے مسکن کا، جلاّدوں کے ٹھکانے کا اور ان کی قیام گاہ کا سراغ دے ہی دیتا ہے۔ مظلوم و مجبور عوام جب احتجاج کے لئے سر اُٹھاتے ہیں تو قاتل کا پتہ لگا ہی لیتے ہیں۔ ہر جرم اپنے پیچھے کوئی نہ کوئی پتہ کوئی نہ کوئی نشان چھوڑ جاتا ہے کہ اس نشان کے ذریعہ مجرم و قاتل تک پہنچا جا سکتا ہے۔ مظلوموں کے خلاف کی گئی سازشیں، مظلوم کے قتل لے لئے بنائے گئے منصوبے کبھی کامیاب نہیں ہوتے انہیں کتنے دنوں تک اور کب تک چھپایا جا سکتا ہے کہ قاتل لاکھ اپنے منصوبوں کو، سازشوں کو چھپائے، پردے میں رکھے، اندھیرے میں وار کرتا رہے لیکن جب معصوم و بے گناہ عوام ظلم کے خلاف نعرۂ احتجاج بلند کریں گے تو ان کے خون کی ہر بوند چراغ کی طرح ان کی ہتھیلی پر روشن ہوگی اور اسی روشنی میں ہم مجرم و قاتل کے منصوبوں اور سازشوں کو جسے اس نے اپنے ظلم کے اندھیرے میں چھپا رکھا ہے، بخوبی دیکھ سکیں گے۔

ظلم کی قسمت ناکارہ.....لیلا سے کہو

نظم کے اس بند میں شاعر کا لہجہ خطیبانہ ہوگیا ہے اور احتجاج کا آہنگ مزید بلند ہوگیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ظلم جس کی قسمت میں سوائے بے کاری، نامرادی اور بدنامی کے کچھ نہیں۔ اے میرے ہم وطنوں! اے میرے بھائیو، دوستو! اب وقت آ گیا ہے کہ تم ظلم کے بے کار بدنام عمل کو، ظلم کی اندھیری قسمت کو، بے جا تدبیر، گندی فطرت اور ظالم کے بدکار، بدنام اور ناپاک ارادوں کو یہ بتا دو، ظلم و جبر کو عقل و اشارہ دینے والوں اور بڑھاوا دینے والوں سے کہہ دو اور لیلا کی قوم یعنی ملک کی عورتوں سے بھی کہہ دو جو کہ اپنی قوم کی مجلس میں شامل ہوتی ہیں۔ اپنی قوم کی محفل میں ظالم و قاتل کی بدعنوانی پر باتیں کرتی ہیں، ان سے بھی یہ للکار کر کہہ دو کہ خون دیوانہ ہے۔ دامن پہ ٹپک سکتا ہے یعنی غریبوں کے خون میں اتنا جوش ہے اتنی گرمی ہے اور اپنی آزادی کی، اپنی اچھی حالت کی ایسی للک ہے، ایسی دیوانگی ہے کہ وہ تمہارے دامن پر ٹپک کر تمہارے جرم کو ظاہر کر دے گا۔ تمہاری بدکرداری کی شناخت کرائے گا۔ اس لئے اب بھی وقت ہے کہ ہوش میں آ جاؤ کیوں کہ یہ وہ خون ہے جو اب ظلم سہتے سہتے شعلہ بن چکا ہے۔ اس شعلے کی لپٹیں اتنی تیز ہیں کہ وہ کھیت کھلیان کو بھی جلا سکتی ہیں۔ وہ کھلیان جس میں فصل پکتے ہی تم لوٹ لیتے ہو۔ سوچو کہ اگر یہ کھیت جل گئے تو تم کیا کھاؤ گے۔ لہٰذا اب تم مظلوموں کو آزاد کر دو۔ کیوں کہ وہ اب آگ کا گولہ بن چکے ہیں جو کسی کے بھی مضبوط سے مضبوط ناپاک ارادوں کو خاک میں ملا سکتے ہیں۔

تم نے جس.....خنجر بن کر

اس بند میں بھی شاعر کی آواز میں للکار ہے۔ وہ کہہ رہا ہے اے ظلم کے پروردہ ظالموں، قاتلوں تم نے جس خون کو، جس جوش کو، جس آواز کو قید خانے میں، قتل گاہ میں، مقتل میں دبانا چاہا وہ آج گلی محلوں اور بازاروں میں سرفروشی کا نعرہ لگاتے ہوئے نکل آیا ہے۔ یہ وہ احتجاج و سرفروش لوگ ہیں جن کے سینوں میں ظلم و ستم کے خلاف آگ بھری ہے، زبان پر نعرہ ہے اور ہاتھوں میں خنجر.....آج یہ اپنے ہر ظلم کا بدلہ لینے پر آمادہ ہیں آج انہیں کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔

نظم کے تینوں بند ساحر کی احتجاجی و انقلابی شاعری کا بہترین نمونہ ہیں، جن میں شاعر نے ملک کی سماجی بدحالی اور سیاسی بدعنوانیوں کا نقشہ کھینچا ہے۔ ظالموں کے سیاسی مکر و فریب کو بے پردہ کیا ہے اور ہندوستانیوں کے مضبوط ارادوں کو جو فولاد کی طرح سخت اور مضبوط ہو چکے ہیں اُجاگر کیا ہے کہ آزادی حاصل کرنے لے لئے مختلف تحریکات و تنظیمات سے وابستہ لوگ کس طرح اپنے اپنے گھر سے ایک ساتھ مل کر بازاروں میں نعرۂ احتجاج لگاتے نکل آئے تھے اور سب نے ایک آواز ہو کر آواز اُٹھائی تو آزادی مل ہی گئی۔ ظلم سے چھٹکارا مل ہی گیا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

﴿۱۰﴾ نظم ''خون پھر خون ہے'' کا پہلا شعر سنایئے۔

﴿۱۱﴾ اس نظم کو کس قسم کی شاعری میں شامل کیا جا سکتا ہے؟

﴿۱۲﴾ ساحؔر لدھیانوی نظریاتی طور پر کس تحریک سے وابستہ تھے؟

13.07 عبدالحی ساحؔر لدھیانوی کی نظم ''خون پھر خون ہے'' تجزیہ

نظم ''خون پھر خون ہے'' ساحر کی سیاسی و انقلابی نظم ہے جس میں شاعر کا خیال ہے کہ ظلم جب حد سے بڑھ جاتا ہے تو ختم ہو جاتا ہے کیوں کہ اس کے خلاف ہر طرف آواز اُٹھنے لگتی ہے اور پھر خون آخر خون ہے وہ جب بھی جہاں بھی ٹپکے گا جم جائے گا اور اپنا نشان اپنا پتہ چھوڑ جائے گا۔ چاہے وہ جنگل کی خاک پر جمے، قاتل کی ہتھیلی پر، انصاف کے ترازو پر، قدموں کے نیچے جمے، ظالم کی تلوار پر یا پھر گھائل کی لاش پر جمے۔ خون جہاں بھی گرے گا جم جائے گا تا کہ اس کے نشان کے ذریعے دشمن تک پہنچا جا سکے۔ دشمن کہیں بھی چھپ کر گھات لگا کر بیٹھے، خون اس کے ٹھکانے کا پتہ دے دیتا ہے۔ ظالم لاکھ کوششوں سے اپنی سازشوں کو چھپانا چاہے، مظلوم اپنی ہتھیلی پر اپنے خون کی ہر بوند سے چراغ جلا کر نکلتے ہیں اور اس کی روشنی میں ظالم کا سراغ لگا لیتے ہیں۔ اس لئے تم ظالموں سے جا کر کہہ دو کہ تم نے آج تک جس خون کو مقتل میں دَبا دینا چاہا وہ آج نعرۂ احتجاج بلند کرتا بازاروں میں سڑکوں پر نکل آیا ہے اور وہ تمہارے ظلم کا تختہ پلٹ دے گا۔ اسے اب روکا نہیں جا سکتا۔

13.08 خلاصہ

ساحر لدھیانوی کی پیدائش ۸/ مارچ ۱۹۲۱ء کو لدھیانہ کے ایک جاگیردار گھرانے میں ہوئی۔ والد نے ساحر کا نام عبدالحئ رکھا۔ ۱۹۳۷ء میں میٹرک کا امتحان دینے کے بعد اور نتیجہ نکلنے سے قبل جب قدرے فرصت تھی انہیں دنوں پہلا شعر کہا۔ اقبال کے ایک شعر میں استعمال کیے گئے لفظ ''ساحر'' سے متاثر ہو کر اپنا نام و تخلص ساحؔر کر لیا۔ ان کی شاعری کا پہلا مجموعہ ''تلخیاں'' ۱۹۴۴ء میں منظرِ عام پر آیا۔ ساحؔر کے ذہن میں شروع سے ہی داخلی طور پر ترقی پسند نظریات کارفرما تھے۔ اس لئے وہ ترقی پسند مصنّفین کی انجمن سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۵۵ء میں ان کی طویل نظم ''پرچھائیاں'' منظر عام پر آئی۔ اَمنِ عالم کے موضوع پر لکھی گئی یہ نظم بہت مشہور ہوئی۔ ۱۹۷۱ء میں ان کا تیسرا مجموعہ ''آؤ کہ کوئی خواب بنیں'' شائع ہوا۔ ساحؔر ان چند شعرا میں سے ہیں جنہوں نے فلمی نغمہ نگاری کو بھی زندگی کے اُتار چڑھاؤ سے روشناس کرایا اور ان کے چوتھے مجموعے ''گاتا جائے بنجارہ'' کی اشاعت ہوئی۔ ساحؔر کی ادبی و فنی صلاحیتوں کی بنا پر انہیں مختلف اعزازات سے بھی نوازا گیا۔ ۲۵/ اکتوبر ۱۹۸۰ء کو ساحؔر لدھیانوی کا انتقال ہو گیا۔

13.09 فرہنگ

اقوام	:	قوم کی جمع	رسوا	:	بدنام
ایما	:	اشارہ، حکم، منشا	ظلمت	:	تاریکی، اندھیرا
پائے سلاسل	:	بیڑیوں کے پاؤں (حلقے)	فرقِ انصاف	:	انصاف کے ترازو کے دونوں پلڑے
پرکار	:	دائرہ یا گھیرا کھینچنے کا آلہ	کفِ قاتل	:	قاتل کی ہتھیلی
تند	:	تیز	کوچہ	:	محلّہ، باڑہ
تیغِ بیداد	:	ظالم کی تلوار	محمل	:	اونٹ کا کجاوہ
حکمت	:	عقل یا طبابت	مسکن	:	رہنے کی جگہ
خاکِ صحرا	:	جنگل کی مٹی	مقتل	:	قتل کرنے کی جگہ
خرمن	:	غلے کا ڈھیر، کھیت کھلیان			

13.10 نمونہ امتحانی سوالات

الف: درجِ ذیل سوالوں کے جوابات ۱۰/۱۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : ساحرلدھیانوی کی زندگی کا مختصراً جائزہ لیجیے۔

سوال نمبر۲ : نظم ''خون پھر خون ہے'' کا مجموعی تاثر اپنے الفاظ میں لکھئے۔

سوال نمبر۳ : ساحرلدھیانوی کی سیاسی وانقلابی شاعری پر اظہارِ خیال پیش کیجیے۔

ب: درج ذیل سوالوں کے جوابات ۳۰/۳۰ سطروں میں دیجیے:

سوال نمبر۱ : ساحرلدھیانوی کی شاعری میں عورت کا مقام متعین کیجیے۔

سوال نمبر۲ : ساحرلدھیانوی کی نظم ''خون پھر خون ہے'' کی تشریح کیجیے۔

سوال نمبر۳ : ساحر کی شاعرانہ خصوصیات کو کتنے حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے؟ رقم کیجیے۔

13.11 حوالہ جاتی کتب

۱۔ ساحراوران کی شاعری از پرکاش پنڈت

۲۔ ساحرلدھیانوی ایک مطالعہ از مخمور سعیدی

۳۔ ساحرلدھیانوی ہندوستانی ادب کے معمار از دیویندر ستیارتھی

۴۔ ساحرلدھیانوی نئے ادب کے معمار (سیریز) از کیفی اعظمی

13.12 اپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات

﴿۱﴾ ساحر نے یہ نظم مقتول لومبا کی یاد میں کہی۔

﴿۲﴾ ساحر ۸/ مارچ ۱۹۲۱ء کو لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔

﴿۳﴾ ''تلخیاں'' کا سنِ اشاعت ۱۹۴۴ء ہے۔

﴿۴﴾ ساحر نے ابتدائی تعلیم مالوہ خالصہ اسکول میں حاصل کی۔

﴿۵﴾ ساحر کی سیاسی سرگرمیوں کے سبب انہیں گورنمنٹ کالج لدھیانہ سے نکال دیا گیا۔

﴿۶﴾ ''آؤ کہ کوئی خواب بُنیں'' مجموعہ ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا۔

﴿۷﴾ ''پرچھائیاں'' کا موضوع امن عالم اور یہ تیسری جنگ عظیم کے پس منظر میں لکھی گئی۔

﴿۸﴾ ساحر کی نظم ''تاج محل'' ان کے اشتراکی نظریہ کی دین ہے۔

﴿۹﴾ ساحر کی سیاسی و انقلابی نظم ''اجنبی محافظ'' ہے۔

﴿۱۰﴾ ظلم پھر ظلم ہے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے ☆ خون پھر خون ہے ٹپکے گا تو جم جائے گا

﴿۱۱﴾ احتجاجی و انقلابی شاعری

﴿۱۲﴾ ترقی پسند تحریک

اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی (نینی تال)

SCHOOL OF HUMANITIES

UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

Teenpani Bypass Road, Behind Transport Nagar
Haldwani - 263 139, Nainital (Uttrakhand)

Phone: 05946-261122, 261123 Fax No.: 05946-264232
www.uou.ac.in email: info@uou.ac.in
Toll Free No: 1800 180 4025

https://www.youtube.com/@91.2fmhellohaldwani7

اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی کا عوامی ریڈیو جس کے ذریعہ طلبا کے لئے مفید پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔

https://www.youtube.com/@uoulive

BAUL (N) - 201-1(004103)